



وہ شہر

از

آئینہ اقبال احمد

وہ شہر

آمنہ اقبال احمد
ایم۔ اے (انگریزی)

ناز کتاب گھر شاندار مارکیٹ بازار چلی قبر وادی

اشاعت اول ۱۹۸۷
 کتابت امان مرزا
 مطبوعہ جمال پریس دہلی
 قیمت بیس روپے = 32/-
 ناشر محمد انوار

اس ناول کے تمام کردار و واقعات فرضی ہیں
 کسی واقعہ یا کردار کی مطابقت محض
 اتفاقیہ امر ہوگی۔

انتساب !

اپنے

تمام

تاریخیں

کے

نام۔ !

۱۵

اپنی خوش گمانیوں میں کہاں سے جلی نہ جاو
وہ چارہ گر نہیں ہے اسے زخم کیوں دکھاو

اسعد فراز

شہر کے رئیس سیٹھ حامد علی کی شان دار کوٹھی کے وسیع و عریض
ہال میں گہما گہمی کا عالم تھا۔ علاقے کے طول و عرض سے چیدہ چیدہ لوگ
مدعو تھے۔ اپنی اکلوتی بیٹی کی امریکہ سے تعلیم مکمل کر کے واپسی کی
خوشی میں انھوں نے ڈنر دیا تھا۔

رنگداز کا سیلاب اُٹ آیا تھا۔ کہیں دبی دبی سرگوشیاں تھیں
تو کہیں جاندار تھپے۔ کہیں بزرگ ایک طرف بیٹھے زندگی کے سنجیدہ
موضوع پر محو گفتگو تھے تو کہیں جوان طبقہ لڑکیوں میں ہٹا ہٹ کر فرح
سے بے نیاز ایک دوسرے سے ہنسی مذاق میں مصروف نظر آتا تھا۔
ہمان تقریباً سبھی آچکے تھے۔

ٹینا حامد علی سفید مٹکی پہنے، ترشے بالوں کا خوبصورت اسٹائل
بنائے معزز مہمانوں کی تواضع میں مگن تھی۔

جوان طبقے کی نظریں گاہے گاہے اس پر پڑ جاتیں۔
 کوئی نگاہوں ہی نگاہوں میں سرایتا۔ کوئی رشک سے دیکھتا۔ تو
 کوئی ایک آدمہ جملہ بھی کہہ دیتا اس سے متعلق —
 اپنی چند بے تکلف دوستوں کے درمیان گھری وہ اُن کی پُر لطف
 باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔
 مگر۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ چہرے پر کچھ بے چینی کے اثرات
 نظر آنے لگے تھے۔

نگاہیں بار بار ہال کے بڑے دروازے پر اٹھ جاتیں۔
 ”کیوں۔ خیریت۔؟ اس کی بے تکلف دوست ریتا نے
 معنی خیز انداز میں پوچھا۔ اور یٹنا حامد علی ایک ادا سے مسکرا دی۔
 ”کس کی شامت آئی ہے۔؟“ ریتا مزید پوچھی۔ اور یٹنا حامد علی
 مزید اعتماد سے مسکرا دی۔

تھپی یا وردی ملازم کی ہمراہی میں زیشان اندر داخل ہوا۔
 لمبا قد، چوڑے شانے، پرکشش شخصیت۔
 موسم کے لحاظ سے بہترین سوٹ زیب تن کئے ہوئے تھے۔
 وہ آگے بڑھ آیا۔

یٹنا حامد علی بہ نفس نفیس اُس کی پذیرائی کو آگے بڑھے۔ اور
 یٹنا حامد علی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔
 دوستوں کو چھوڑ چھاڑ وہ کبھی اُسی طرف بڑھی۔

”تو یہ بات تھی۔“ رینا بولی۔

”دال نہیں گلنے کی۔“ سرین نے بال بچھے جھٹکتے ہوئے جرتے کہا۔ لہجے سے کچھ تلخی، کچھ طنز جھلکتا تھا۔

”خاصی اونچی چیز ہے۔“ نائیلہ کے لب و لہجے سے بھی نخوت عیاں تھی۔
 ”PROUD کہیں کا۔“ فرحانہ کی بھی کوششیں شاید ناکام گئی تھیں۔
 ”ٹینا قابو کر لے شاید۔“ رینا پھر بولی۔

”ٹینا میں کوئی خاص بات ہے کیا۔؟“ فرحانہ نے جل کر پوچھا۔
 ”یہ کبھی رئیس کی بیٹی ہے۔۔۔ یہ کبھی اکلوتی ہے۔ دونوں ایک جیسے ہیں۔ اور پھر ٹینا کی ادائیں۔۔۔“ رینا کے لہجے میں خوشامد تھی۔
 اور پاس ہی سے۔ ایک چھوٹا سا۔ ہلکا سا۔ ہتھمہ اُکھرا۔
 لڑکیوں نے گھوم کر ناگواری سے اس طرف دیکھا۔ زمین اٹھیں
 اپنی طرف دیکھتے پا کر مزید سنسن دی۔ اور لڑکیوں نے مزید ناگواری
 سے رخ واپس موڑ لیا۔

”بڑی ڈھیٹ ہو۔“ فرزانہ نے آہستہ سے زمین کو ڈانٹا۔
 ”PROUD ہے، رئیس ہے، اکلوتا ہے۔ کیا فضول لگی ہوئی تھیں؟“
 وہ اب بھی سنسن رہی تھی۔

”تو کہنے دو۔ تمہیں کیا۔“ فرزانہ نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔
 ”یہ میں کون ذات شریف۔؟“ زمین نے سامنے نظریں دوڑا
 ہوئے لاپرواہی سے پوچھا۔

”کسی بڑے جاگیردار کا پوتا ہے۔ باپ بھی اکلوتا تھا۔ خود بھی اکلوتا ہے۔ اور پھر سچ پوچھو تو ہے بھی بہت شاندار۔ وہ رہا۔“
 اُس نے دور ہال کے آخری سرے کی طرف اشارہ کیا۔
 لمبا قد۔ محو کن پر سنیلٹی۔ وہاں موجود سب لوگوں میں واضح طور نمایاں۔
 زدرین نے دیکھا۔ سیٹھ حامد علی اُسے جیسے بیٹا سے متعلق ہی کچھ بتا رہے تھے۔ بیٹا بہت متاثر نظر آ رہی تھی۔

مگر۔ ذیشان۔ وہ واقعی سپاٹ چہرہ لئے ہوئے تھا۔
 ”ہے تو ٹھیک ٹھاک۔۔۔ وہ اس کی ڈسٹنگ پر سنیلٹی سے انکار نہ کر سکی۔“ مگر۔ اتنا براؤڈ ہونے کی سمجھ نہیں آتی۔“ واپس رُوح پھیرے ہوئے وہ بے نیازی سے بولی۔

”واقعی متعجب ہے۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے۔ یہ جو گروپ ہے، پیچھے لڑکیوں کا۔ یہ سب شہر کی دولت مند لڑکیاں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے ہر ممکن کوشش کی ہے، اسے متاثر کرنے کی۔ مگر۔“ وہ مسکرا دی۔ ”وال نہیں گلی۔“

”ہوں۔“ زدرین دھیرے سے بولی۔ ”مگر ایک بات اب بھی سمجھ میں نہیں آتی۔“

”کیا۔۔۔؟“

”کہ ان لڑکیوں کو اتنی کوشش کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔“
 ”اب یہ تم اپنی سے پوچھ لو۔“ فرزانہ جل کر بولی۔

پھر سیٹھ حامد علی آگے بڑھ گئے قدرے۔ دوسرے ہمانوں کی طرف۔ ٹینا اکیلی اس کے پاس کھڑی ہو گئی تھی۔
تجھی لڑکیوں کا یہ گرد و پاش بھی کشاں کشاں وہاں پہنچ گیا اور پھر بات بے بات آخری قہقہے گونجنے لگے۔

کھانا لگنے کا اعلان ہوا تو سب میز کی طرف سمت آئے۔
"یہ لیجئے۔ سٹریٹنگ"۔ ٹینا نے اسے پلیٹ پیش کی۔
"THANK YOU" پلیٹ لے کر اس نے سنجیدگی سے کہا اور
ایک قدم دائیں چل کر جا کھڑا ہوا۔

"اپنی جاگیر پر رہ رہ کر آپ کی عادتیں بھی جاگیردارانہ ہو گئی ہیں۔"
ٹینا کو جیسے کوئی مقناطیسی کشش پھر وہاں لے گئی۔
"ایسا نہیں ہے۔" اس کا چہرہ، اس کا لہجہ اب بھی سپاٹ تھے۔
"YOU DON'T SMILE" جیسے آپ کو ڈر ہو کہ آپ بوس نہیں
دیں گے۔" وہ پھر بولی۔

"یہ بھی نہیں ہے۔" کانٹے سے روست کا پس منہ میں ڈالتے
ہوئے وہ پھر اسی سنجیدگی سے بولا۔ اور ٹینا کو اس کی یہ سنجیدگی
اپنی تو سین معلوم ہوئی۔

کیسا آدنی تھا۔؟ جب سے آیا تھا وہ ساتھ ساتھ تھی۔ مگر خیال ہے
ٹھیک سے دیکھا بھی ہو۔ ویسے نہ سہی کسی سہی کی بات پر ہی سہی۔ اگر اس
کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری ہو۔ کرشمی بھی کوئی چیز سوتی ہے آخر۔!

رات پاپا اُس کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملتا رہے
تھے۔ جہاں تک دولت کا سوال ہے، وہ اُس کی آن بان سے ہی
ظاہر تھا۔ پرسنیلٹی۔

اُس نے ایک بھر پور نظر اس پر ڈالی۔

جھوٹ سے نکلتا قد۔ چوڑے شانے۔ مضبوط جسم۔ کھلتا گندنی
رنگ۔ پرکشش نقوش۔ ڈارک براؤن گھنٹیاں۔ بے حد خوبصورت بولتی
آنکھیں۔ بے نیازی سے سامنے جمائے کوئی GREEK GOD جیسے
زمین پر اتر آیا تھا۔

مگر۔ وہ تو یوں کھڑا تھا جیسے ٹینک کے وجود کا احساس ہی نہ ہو۔
اپنے ہی وطن تو کیا اُس سے تو امریکن لڑکے بھی متاثر تھے۔ نعیم اُس کا کلاس
فیلو۔ آج ڈنر پر بھی مدعو تھا۔ وہ تو اُس پر جان دیتا تھا۔
”سوہنہ“ کیا سمجھتا تھا اپنے آپ کو۔ اُس نے سر جھٹکا۔ ایک
پل کو دل میں آیا۔ چلی جائے وہاں سے۔

مگر پھر۔ خیال آیا۔ جب سے جہاز سے اُتری تھی۔ اس وقت تک
پاپا براہِ راست کاخ کی تعریفیں کئے جا رہے تھے۔ وہ سمجھتی تھی ایسا کیوں
تھا۔ پاپا اُس کے لئے کسی اچھے MATCH کی فکر میں تھے۔

مگر۔ یہاں تو بات کا جواب ہی سوائے ”ہوں ہاں“ کے
نہیں مل رہا تھا۔

”آپ بہت کم بولتے ہیں“ ٹینک نے کہا۔

"YES" اُس کی گھنی پلکوں کو جنبش ہوئی۔ "مجھ کو زیادہ

بولنے کا عادت نہیں ہے۔"

ٹینا چونکی۔ اُس کا لب و لہجہ بختونیت لئے تھا۔

اُس کی اسٹون گرے آنکھیں دل میں اُترتی تھیں۔ اور۔ اور

جس انداز میں اس نے اردو کے لفظ بمشکل جوڑ کر ادا کئے تھے۔ وہ

انداز۔ قاتلانہ تھا۔

"YOU SPEAK PUSHTO"۔ ٹینا دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔

"YES"۔ ہمارا مادری زبان پشتو ہے۔ ایک محسوس دلفریب

مسکراہٹ اُس کے پرکشش ہونٹوں کو چھو گئی۔

اور ٹینا کو اکھڑ سا، معزور سا یہ گریک گاڑ بہت اچھا لگا۔

"کل کلب میں ڈانس پارٹی ہے۔ آپ بھی آئیے۔" ٹینا نے

اُسے دعوت دی۔

"آئے ایم سوری۔ ہمارا پاس وقت نہیں ہے۔" اُس کی

سنجیدگی پھر پٹ آئی تھی۔

اور ٹینا کے چہرے پر مایوسی جھلک آئی تھی۔

"آپ بہت معروف آدمی لگتے ہیں۔"

"ہاں۔" اُس نے مختصر کہا۔

"مجھے گاؤں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔"

"I SEE"۔ اُس نے کہا۔ اور ٹینا کے چہرے پر تاریک سا سایہ پھرا۔

وہ اُسے گاووں دکھانے کی پیش کش تو کر سکتا تھا۔
 ”آپ دکھالائیے تاکسی دن۔“

”I'LL ASK MY FATHER“ وہ ضرور بندوبست کر دے گا۔ اُس کی سنجیدگی اب بھی برقرار تھی۔ اور سنا کوا لگا۔ وہ مزید یہاں نہ رُک سکے گی۔

”میں ذرا اپنی فرینڈ کے پاس ہواؤں۔“
 ”SURY“ ذیشان نے کہا۔ اور پاس کھڑے عمران صاحب کی طرف رخ کر لیا۔

زرین اور فرزانه میز کے اُسی سرے پر کھڑیں کھانے میں مصروف تھیں۔

”دیکھا تم نے۔ ٹینا ہمارے علی بھی مات کھا گئی۔“ فرزانه نے آہستہ سے زرین کے کان کے پاس کہا۔

”اچھا ہوا۔ کیوں اتنا سر چڑھایا تھا۔ پتہ نہیں انہیں کیا نظر آیا ہے مجھے تو کوئی خاص بات نظر نہیں آئی اس میں۔“ اُس نے ایک سرسری نظر اُس پر ڈالتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔ اور عمران صاحب کے باتیں کرتے کرتے ذیشان کے کان کھڑے ہو گئے۔

”آہستہ بولو۔“ فرزانه نے ذیشان کو متوجہ دیکھ کر اُسے تسنہ کی۔
 ”کیا مصیبت ہے۔ تم سب اتنی IMPRESS کیوں ہو۔“
 وہ الجھ کر بولی۔

زندگی میں شاید پہلی بار اپنے لئے اُس نے ایسے الفاظ سنے تھے۔
 نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔

جو کلیٹ رنگ کے سادے سے لباس میں بلبوس۔ سترہ۔ اٹھارہ
 سال کی ٹارک سی دہلی پتی۔ گلابی شفاف رنگت پر بے حد خوبصورت
 نقوش لئے ایک لڑکی اپنے ڈارک براؤن لمبے گھنے بال گردن پر سے
 پیچھے جھٹکتے۔ پرکشش چہرے پر بیزاری اور تمسخر کے ملے جلے تاثرات
 لئے اُسے دیکھ رہی تھی۔

اُس کے ساتھ والی لڑکی کی خشک جانی پہچانی سی تھی۔ مگر اس
 آج پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

نظریں اپنی پلیٹ پر جما کر وہ دوبارہ عمران صاحب کی طرف
 متوجہ ہوا۔ مگر کان اب بھی اسی طرف لگے ہوئے تھے۔
 ”پلینر زرین۔“ فرزانہ حقیف سی بولی۔

”کیا ہے۔“

”وہ دیکھ رہا تھا ابھی۔“ فرزانہ کی سرگوشی بھی ذرا

چھپی نہ رہی۔

”I DON'T CARE“ زرین مزید لاپرواہی سے بولی

اور بڑے آرام سے میز کی طرف پلٹھ کر کے ایک خاتون سے
 باتوں میں لگ گئی۔

ایک پل کو ذیشان کو اپنا رنگ بدلتا ہوا محسوس ہوا۔

اپنی یادداشت میں آج پہلی بار اس نے اپنے لئے یہ لہجہ اور
انداز دیکھا تھا۔

کھانا کھا یا چا چکا ہے۔

دریشان حسبِ عادت سب سے پہلے جانے کے لئے اٹھ
کھڑا ہوا۔

سیٹھ حامد علی کے ساتھ ساتھ ٹینا اُسے الاداع کہنے
باہر تک آئی۔

ذہن پر بوجھ سائے وہ پورج تک آیا۔
بادردی ڈرائیور نے اُس کے لئے سیاہ چمکتی مرسڈیز کا
دروازہ کھولا۔

اُس نے سیٹھ حامد علی سے مصافحہ کیا۔

”بائے۔ بائے۔“ ٹینا نے پتلی نازک انگلیاں ہلائیں۔

”بائے۔“ اُس نے حسبِ عادت سنجیدگی سے کہا۔

اور پُرکشش چہرے پر تاریک ساسا یہ لئے وہ گاڑی
میں جا بیٹھا۔

دھوپ ڈھل چکی تھی۔ لال نارنجی رنگ پیچھے سے جھانکتے
 ہوئے شفاف سرئی پہاڑ کو مزید سحر انگیز بنا رہا تھا۔ نیلگوں آسمان
 پر ایک لاد تنہا بادل کا سہما سا ٹکڑا اپنا سہری دامن سمٹھالے مخالف
 سمت لپک رہا تھا۔ اونچی نیچی ناہموار پتھر ملی زمین پر اُگی خود رو
 جھاڑیاں تیز سواکی زد میں تھیں اور نالے کا پانی اپنے مخصوص
 انداز میں رواں دواں تھا۔

ڈرائیور، ناظم اور کریم بابا اُس کے شکار کئے ہوئے ہرن جیب
 میں رکھ رہے تھے۔

سامنے ہی ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھا وہ مگ میں سے گھونٹ
 گھونٹ گرم اسٹرونگ کافی پی رہا تھا۔ اُس کے شکاری کتے اُس
 کے آس پاس منڈلا رہے تھے۔

پرندوں کے غول اُس کے سر کے اوپر سے سرسراتے ہوئے اپنے

آشیانوں کی سمت بڑھے تو وہ چوسکا۔ سردی کافی ہو گئی تھی۔ مگ
 خالی کیسے اُس نے پتھر پر رکھا۔ جیک بڑی دیر سے اُس کے پوٹ
 چاٹ رہا تھا۔

”SO NICE OF YOU JACK, THANK YOU“ اُس نے پیار سے
 جیک کی مکر پر ہاتھ پھیرا۔ اور قریب ہی پیٹھے ساٹا کا سراپنے
 پہلو سے لٹکالیا۔

”پتھر ہے“ جانے کیسے اُسے کچھ سال گھر کی گرل فرینڈ کے اُس
 سے متعلق کہنے لگے۔ ریمارکس یاد آئے۔

”مغزوہ ہے“ اُسے بابا جان کی سکرٹری کی بات یاد آ گئی۔

”مجھے تو کوئی خاص بات نظر نہیں آتی اس میں“ اُسے اچانک
 رات ڈنروالی لڑکی کا لاپرواہی سے ادا کیا گیا جسد یاد آ گیا۔
 ”I DON'T CARE“ اُسے مزید یاد آیا۔ ساتھ ہی ایک بیہوش
 سی مسکراہٹ اُس کے لبوں کو چھو گئی۔

آہٹ پر اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

ناظم اس کے لئے اور کوٹ لئے کھڑا تھا۔

”او۔ کے۔ فرینڈس“ کتوں کو تھپکتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ناظم نے آگے بڑھ کر شکاری لباس کے ادھر اُسے اور کوٹ
 پہنایا۔ پتھر سے ابھی تھوڑی دیر قبل اُس کا اتارا ہوا چمڑے کا
 دستاں اسے کھلایا۔

”THANK YOU“ درستانہ پہنتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔
 ڈرائیور اُس کے لئے جیب کا دروازہ کھلے کہ ٹرا تھاموہ
 اندر جا بیٹھا۔

تبھی باقی ملازم پیچھے تیار کھڑی جیب میں جا کر بیٹھے۔ اُس کی
 جیب چل پڑی تو دوسری بھی پیچھے پیچھے چل پڑی۔
 ناہموار پتھر ملی سڑک پر سے ہوتے کافی دیر کے بعد جیب
 پکٹی سڑک پر آئے۔

اب وہ اپنے گھاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ یہ دادا جان مرحوم
 کی جاگیر تھی۔ اُس کا چھوٹا سا خاندان تھا۔ بابا جان، دادا جان
 کے اکلوتے لڑکے تھے۔ خدانے بابا جان کو ایک بہن بھی دی تھی۔
 بابا جان کی شادی اپنے عزیزوں میں ہی ہوئی تھی۔ مگر وہ
 چھوٹا سا تھا کہ اتنی جان اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ وہ خود بھی اکلوتا
 تھا۔ بابا جان نے دوسری شادی نہیں کی۔ ایک ماما کی مدد
 سے ماں اور باپ دونوں بن کر اُسے پالا۔ پھوپھو کی شادی
 اُن کے کزن سے ہوئی تھی۔ ایک ہی بیٹا تھا۔ ناصر۔ ابھی سات
 سال کا ہی ہوا تھا کہ پھوپھی اور پھوپھا جان کا ایک سیڈنٹ
 میں جاں بحق ہو گئے۔

چھوٹا سا ناصر دنیا میں اکیلا رہ گیا تو بابا جان اُسے اپنے
 ساتھ گھاؤں لے آئے۔

ادریوں آٹھ سالہ ذیشان اور سات سالہ ناصر نے اٹھی
پرورش پائی۔

ذیشان نے سینئر کیمبرج کر لیا تو بابا جان نے اُسے ہائر اسٹڈیز کے
لئے لندن بھیج دیا۔ ناصر چند دن بہت اُداس رہا۔ مگر لاابالی طبیعت
پائی تھی۔ چند دن میں بہل گیا۔ اور اگلے سال جب اُس کے سینئر
کیمبرج کر لینے پر اُسے حبس پروگرام لندن بھیجا چاہا تو وہ صاف مکر
کیا۔ اُس نے تو پائیلٹ بننا تھا۔ ایئر فورس جوائن کرنی تھی۔ بابا جان
نے ادب نہ سمجھائی۔ ذیشان نے بڑے بڑے لاپچ خطوں میں دیئے۔
مگر پائیلٹ بننے کا بھوت کچھ ایسا سر پر سوار تھا کہ ولایتی میموں
کا لاپچ بھی اُسے نہ اتار سکا۔ لہذا ایف ایس سی کرنے کے بعد وہ تو
سدھارا ایئر فورس اکیڈمی اور ذیشان لندن میں پڑھتا رہا۔
دونوں میں بے حد پیار تھا۔ ایک ایک پل کی خبر ایک دوسرے کو
یوں پہنچاتے جیسے ہزاروں میل دور نہیں، دس میل پر بیٹھے
ہوں۔

وقت گزرتا رہا۔ ناصر نے کمیشن لی۔ پائیلٹ آفیسر اور پھر فلائنگ
آفیسر بنا۔ ذیشان نے لندن یونیورسٹی سے ہنرس ایڈمنسٹریشن میں
ماسٹرز کی ڈگری لی۔
ملک واپس پہنچا تو ایئر پورٹ پر بابا جان کے ساتھ ساتھ
ناصر بھی تھا۔

اور۔ تبھی شاہان احمد نے محسوس کیا۔

جہاں ناصر اپنے بچپن کی طرح ایک پل نچلا نہیں بیٹھتا تھا۔
وہاں ذیشان ایک سنجیدہ اور مدبر نوجوان میں ڈھل گیا تھا۔
اگر شاہان احمد کے لئے کہا جاتا تھا کہ اپنے والد مرحوم خاقان احمد
سے جاگیر دارانہ رعب اور سنجیدگی اُنھیں ورثے میں ملی ہے۔ تو
ذیشان نے دادا اور باپ دونوں کا تدبیر اور سنجیدگی سمیٹ
لئے تھے۔

اور پھر ذیشان نے جس سنجیدگی سے اتنی بڑی زمین داری اور
وسیع کاروبار کو سنبھالا دیا۔ شاہان احمد کو محسوس ہوا اُن کی محنت
بے جا نہیں گئی۔ اکلوتی اور بن ماں کے اولاد کو کئی سال تک ملک
سے باہر رہنے دینے کے بعد بھی اُنھوں نے کچھ گھوٹا نہیں تھا۔ پایا تھا۔
بلکہ اتنا کہ اب موت کا بلاوا آجاتا تو سکون سے بلیک کہہ سکتے۔

ناصر چھپس ستائیس کے لگ بھگ تھا۔ کچھ عرصہ قبل اصول پرست
اور جاہر ماموں کے سامنے کچھ ایسا عرض حال سنایا کہ اُسے اُس کی
پسند کی لڑکی سے سنگنی کی اجازت مل ہی گئی۔ کچھ مصلحت بھی تھی کہ
کسی طرح بے چین طبیعت کسی ایک نکتے پر ٹک جائے تو اچھا ہے۔
لڑکی کا گھرانہ اچھا تھا۔ کل کلاں کو کسی غلط جگہ پھنس جاتا تو اُن کے
وقار کو یقیناً ٹھیس پہنچتی۔

مگر ذیشان کے لئے ایسی کوئی رعایت نہ تھی۔ اُس کی دہن تو

انہوں نے سوچا تھا خود اپنی پسند سے لائیں گے۔ اور جہاں
شاہانِ احمد کی خواہش تھی کہ خود اپنی زندگی میں اُس کا گھر بستا
دیکھیں اور اسی کوشش میں ان دنوں سرگرمی سے کوشاں تھے۔
وہاں ناظر بھی اُسے ہفتہ وار کسی نہ کسی لڑکی کو اپنا لینے کے مشورے
ہر خط میں دیتا۔

مگر ذیشان۔

اُسے تو جیسے اس پہلو پر سوچنے کا وقت ہی نہ ملتا تھا۔ یا پھر
کوئی لڑکی اُس کے معیار پر پوری نہ اُترتی تھی۔
لندن میں بھی اُسے لڑکیاں بہت پسند کرتی تھیں۔ وہ بھی
اُن سے بہت اپنائیت سے ملتا۔ مگر بات صرف دوستی تک ہی
تھی۔ آگے نہ بڑھ سکی تھی۔ اُن لڑکیوں میں کئی خوبیاں تھیں۔
جن کا اُسے اعتراف تھا۔ مگر کسی سے قلبی لگاؤ جانے کیوں اُسے نہ
ہو سکا تھا۔

اپنے ملک میں اُسے لڑکیوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ سب
اونچے گھرانوں کی لڑکیاں تھیں۔ شکلوں کی بھی بُری نہیں تھیں۔ وہ
اُن سب کو اچھا بھی سمجھتا تھا۔ اُن میں کوئی ایسی بُرائی بھی نہ تھی۔
بلکہ اُسے تو بعض اوقات افسوس بھی ہوتا، اُن کے معیار پر اپنے
پورے نہ اُترنے کا۔

جیب پکی سڑک چھوڑ کر بائیں جانب شنگل کی سڑک پر سہلی۔

تو وہ چوڑکا۔

وہ لوگ گاؤں جانے والی سڑک پر پہلے تھے۔ دونوں طرف تاہر نظر لہلہاتے کھیت تھے، باغات تھے، یہ انکی ملکیت تھی۔ خدا تعالیٰ نے انھیں اتنی نعمتوں سے نوازا تھا۔

دور سقید اونچی محل نما عمارت اُن کی حویلی تھی۔

وہ مزید آگے بڑھے۔

بائیں طرف گھوڑوں کا اصطبل تھا۔ ابھی ہفتہ بھر پہلے اس میں نئے عربی گھوڑے کا اضافہ ہوا تھا۔ کتنا مضبوط اور خوبصورت گھوڑا تھا۔ دائیں طرف بہت بڑے احاطہ میں گائے بھینس تھیں۔ دور کہیں پیچھے سے ابھرتا پولٹری فارم تھا۔ پھر ٹینس کورٹ تھا۔ گولف کورس تھا۔ سرونٹ کوارٹرز تھے۔ اور اُن سے بھی پرے اُن کے مزارع چھوٹے بڑے کچے پکے گھروں میں آباد تھے۔ کتنی خوبصورت کائنات تھی یہ اُن کی۔ کتنا پیارا تھا اسے اپنے گاؤں سے۔ کتنا سکون ہوتا تھا یہاں۔

حویلی کے گرد تفصیل نما اونچی دیوار میں بنے بہت بڑے آبی گیٹ میں داخل ہو کر جیپ نازنگی کے درختوں کے دروہہ قطار میں سے بحری کی سڑک پر چلتی حویلی کے آگے بنی بڑی سی پورچ میں آکر رُک گئی۔

”ہیلو شان“ جیپ سے اترتے ہی اُس کے کانوں میں

ناصر کی آواز پڑی۔

”ہیلو۔“ وہ خوشی سے سرشار ہو گیا۔ ”کب آیا۔؟“ اُسے گلے لگانے کو دونوں بازو پھیلائے وہ آگے بڑھے۔

”سوری۔ پہلے گردھباڑ لو۔ بن مانس نظر آرہے ہو۔“ پیچھے ہٹتے ہوئے اُس نے گلے ملنے سے صاف انکار کر دیا۔

”مجھے زبردستی بھی ملنا آتی ہے۔ دو قدم آگے بڑھ کر شان زبردستی اس کے گلے جا لگا۔

”اب اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی ہنلاؤ۔“ ناصر اُس سے پیٹتے ہوئے بولا۔

”ضرور۔ مگر اپنے اپنا دسل کو دیکھ لوں۔“ اس کو اپنی گھوڑی کا خیال راستے میں کئی بار آیا تھا۔ تم بھی آؤ۔“

”نا بابا۔ میں اندر چلا۔ تم دیکھ آنا۔ مگر پلیز بیٹھ مت جانا رہیں۔“

”او۔ کے ڈیئر۔!“

اور شان لمبے لمبے ڈگ بھرتا اصرطبل کی طرف چل دیا۔

اصطبل میں داخل ہوتے ہی اُس نے دسل کو دسل دی چونک
 کردہ مڑی اور جواب میں سر ہلاتے ہوئے ہنہنادی۔
 ”ہیلو ڈارلنگ کیسا طبیعت ہے“ آگے بڑھ کر اُس نے اُس کا
 سر پیار سے گلے لگا لیا۔

پھر اس کی گردن تھپتھپائی۔ پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے اُس
 کے گرد پورا چکر کاٹا۔ وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔
 ”لوہ کا چائے مائے لوزمانہ نہیں۔ یاد رکھنا“ دوسری طرف
 گھوم کر بازو اُس کی گردن میں ڈال کر اپنا حال اُس کے سر سے رگڑتے
 ہوئے اُس نے اُس کے کانکے پاس کہا۔ پھر اُس کی خوراک کا معائنہ
 کیا۔ جگہ کی صفائی دیکھی۔

پھر وہ پاس بندھی سیاہ مائل برادرن چمکتی مڈنائٹ کے پاس گیا
 کتتی پر دو خار لگ رہی تھی وہ۔ پھر وہ سنو اور ریو کے پاس گیا۔

پھر تھنڈے پاس آیا۔ کتنا پُر جلال تھا۔ اُس کے پاس سے گھوم کر
وہ دوسری طرف بابا جان کے نیلے غریبی گھوڑے کے پاس آیا۔ چھوٹے
قد کا یہ سفید گھوڑا کتنا مضبوط تھا۔ اُس کی گردن کے لمبے لمبے بالوں
پر ہاتھ پھیرتا ایک نظر سب کی خوراک پر۔ اُس پاس ڈالتا۔ مطمئن
سا نظر آتا۔ وہ باہر نکل آیا۔

”ہو گئے فارغ۔“ اُسے بیڈ روم میں داخل ہوتے دیکھتے ہی
ناصر گویا ہوا۔

”یار و سل کا بچہ ہونے والا ہے نا۔“ وہ معذرت کے انداز
میں بولا۔

”وہ تو ہو جائے گا۔ یہ بتاؤ خود کب بچہ دے رہے ہو۔“ صوفی پر
لمبا لیٹا جلتی آگ میں وہ ایک اور لکڑی جھونکتا لاپرواہی سے بولا۔
”ہنسا کر آتا ہوں۔ پھر دے دے گا۔“

”ولیہ بن مانس صاحب۔“ ناصر نے اُسے شکاری لباس میں ملبوس
سر سے لے کر پاؤں تک تو صیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس لباس
میں۔ اس قدر قامت کے ساتھ اچھے لگ رہے ہو۔
”ہمہارے نظر میں۔“

”میری ہی نظروں میں اوروں کی نظروں میں تو بن مانس
ہی لگو گئے۔ ناصر نے کہا۔

”اس لئے تو ایسا ارادہ نہیں ہے۔“ اُس نے ہاتھ آگے بڑھا کر

ناصر نے اُسے کوٹ کی آستین اُتارنے میں مدد دی۔ اُس نے دوسرا بازو بڑھایا۔ اُس نے وہ بھی کھینچ کر اُتار دیا۔ ادویوں اور کوٹ وہیں چھوڑ کر وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔

ناصر تھوڑی دیر یوں ہی بے چین سا آگ تا پتا رہا۔ پھر کریم بابا گرم گرم کافی کے ساتھ دھیر سا راز لائے فروٹ لے آئے تو قدرے مطمئن ہوا۔ اور گرم پانی کا شاور لیتے لیتے شان دھیرے سے مسکرا دیا۔

یقیناً ناصر کو پتہ چل چکا تھا کہ بابا جان دس دن کے لئے باہر گئے ہیں بے پناہ گھبراتا تھا ناصر ان کا سامنا کرنے سے تھکے ہی اتنے باغی اور با اصول قسم کے۔ ہر بات، ہر کام اپنی مرضی کے مطابق چاہتے تھے۔ زبان سے انکار تو ایک طرف، وہ لوگ تو دل میں بھی اُن کی مرضی کے خلاف کوئی خیال نہیں لاسکتے تھے۔ پچھلے دنوں ناظم کے یہاں آنکھوں بچے کی پیدائش پر اُس کی اچھی خبر اس لئے لی تھی کہ ساتویں پر اُسے باقاعدہ بلا کر آنکھوں نے آئندہ مزید بچے پیدا نہ کرنے کی تنبیہ کی تھی۔

خودشان کی بھی تو جان جاتی تھی سامنا کرتے وقت کہیں کوئی بات اُن کی مرضی، اُن کی طبیعت یا پھر اُن کے موڈ کے خلاف نہ کہہ جائے۔ باقاعدہ ڈانٹ پڑ جاتی تھی۔ اور جہاں شان اکثر اُن کا سامنا کامیابی سے کر جاتا وہاں ناصر اکثر و بیشتر بدحواسیاں کر بیٹھتا۔ کچھ اپنی طبیعت کے ہاتھوں۔ کچھ گھبراہٹ کے مارے اور یوں اکثر اُن کا سامنا کافی سے کر آتا۔

بچپن بھی ایسا ہی گزرا تھا۔ ناصر بھی نچلانا بیٹھتا تھا۔ اُس کی طبیعت نے
 سمجھی کوئی پابندی گوارا نہ کی تھی۔ اور تو اور۔ جہاں شان کو یا با جان کی
 سخت ہدایات کے مطابق صبح کا لباس الگ نسبتاً ہلکے رنگ کا۔ شام کا
 الگ گہرے رنگ کا اور رات کا الگ نائٹ سوٹ تبدیل کرایا جاتا۔ ناصر
 وہاں بھی ڈاج دے جاتا۔ ناشتہ سے قبل صبح کی داک سے اُس کی روح
 فنا ہوتی۔ ناشتہ، لیمو اور ڈیز کے مقررہ اوقات اس کی طبیعت پر بوجھ
 تھے۔ کھانے کی میز پر کھانا شروع کرنے سے قبل پیرا اُس کے گلے میں اسپرین
 باندھتا آدوہ چڑ جاتا۔ مختلف کوڈس SERVE ہوتے تو اُس کو
 گھٹن محسوس ہوتی۔

بات یہ نہیں تھی کہ پھوپا جان کے یہاں دھن دولت کی کمی تھی۔ فرق
 صرف اتنا تھا کہ وہاں ”اصول“ نہیں تھے، پابندیاں نہیں تھیں۔
 اور۔ پھر شان، ان اصولوں کا، ان پابندیوں کا عادی سوچکا تھا۔
 صبح کی داک اُس کی طبیعت کا خاصہ بن چکی تھی۔ اور رات کو اگر اُسے نائٹ
 سوٹ نہ بدلوا یا جاتا تو اُسے یقین نہ آتی۔ اُسے مقررہ اوقات پر کھانے کی
 عادت تھی اور پیرا اُسے SERVE نہ کرتا تو اُسے اکھیں ہرتی۔

بابا جان کا سامنا کم ہی ہوتا۔ رات ٹریڈیبل پر یا پھر رات سوتے
 وقت۔ وہ بھی جب گاؤں میں موجود ہوتے۔ در نہ اکثر کاروبار کے
 سلسلے میں باہر ہی رہتے۔

بات یہ نہیں تھی کہ وہ سخت طبیعت کے تھے۔ یا پھر سمجھی اکھیں

مارا پیٹا تھا۔ ایسا تو شاید کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ انھیں شان سے بے حد پیار تھا۔ ناصر کو وہ اپنی اکلوتی بہن کی واحد نانی سمجھ کر سینے سے لٹکائے ہوئے تھے۔

بات تھی تو ان کی بار رعب طبیعت کی۔ مدبر شخصیت کی! انھیں اپنے اصول عزیز تھے۔ پرانی قدروں سے محبت تھی۔ باپ دادا کے وقار کو مقدم سمجھتے تھے۔ اپنی آن سے پیار تھا۔

انھیں شان سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ ناصر کو بھی اتنا ہی COMPETENT دیکھنا چاہتے تھے اور ایسا تبھی ممکن تھا کہ وہ دونوں ان کی طرز زندگی کو اپناتے۔ ان کے اصول پر چلتے۔

اور پھر۔ جہاں ناصر کبھی کسی پابندی کا پابند نہ رہا تھا۔ وہاں یہی پابندیاں شان کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھیں۔

دونوں ہوسٹل بھولے گئے۔ وہاں سے شان لندن گیا اور حبِ وطنی

ناصر ایئر فورس سببا جان نے یہاں بھی اُسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر سختی نہیں برتی تھی۔ ایئر فورس جو اس کزنان کے وقار کے منافی نہ تھا۔

مگر جب ناصر نے سینہ کے لئے بابا جان کو براہِ راست مخاطب کرتے ہوئے خط لکھا تو شان سمجھ گیا۔ ناصر دل کے ہاتھوں دیوالیہ ہو گیا ہے۔ درنہ ناہر

اور ایسی جرات بابا جان کی خدمت میں؟ اور پھر اُسے اجازت بھی ملی تو صرف اس لئے کہ لڑکی کا خاندان اچھا تھا۔ درنہ تو ایسا ممکن نہ تھا۔

دیے ایک بات ضرور تھی۔ ناصر کی ادٹ پٹانگ عادتوں کی وجہ سے

بابا جان تک اھولوں میں لچک پیدا ہو جاتی

اور شان اپنی سنجیدہ طبیعت سے بابا جان کے اھول اپنے لئے مزید سخت بنا گیا تھا۔ وہ ناھر سے کم سنجیدہ اور شان سے سنجیدہ تر کاموں کے متوقع رہنے لگے تھے۔

اُس کے بیڈ روم میں شاید فون کی گھنٹی بجی تھی۔ وہ چونکا۔ اور پھر جلدی جلدی صبا بن اُتارنے لگا۔

ڈرلنگ روم میں آکر ڈھیلے ڈھالے گرم کپڑے پہنے۔ ڈھیلے سا ہی نرم سا سوائٹ پہنا۔ پاؤں میں گرم ادنی جرابیں پہنیں۔ سر ایک بارادر تولیے سے رگڑا۔ برش کیا اور سلیر پہنے ہوئے کمرے میں گھس آیا۔
 ”کس کا فون تھا۔؟“ آگ کے پاس آتے ہوئے وہ ناھر کے مقابل صوفے پر بیٹھ گیا۔

”میں نے نہیں اُٹھایا۔“ وہ لاپراہی ڈرائے فروٹ کھانے میں مصروف رہا۔

”اوہ۔ بابا جان کا ہوا پھر؟“ وہ پریشان ہو گیا۔

”اسی لئے تو نہیں اُٹھایا نہ خوردار۔“ وہ مزید لاپراہی سے بولا۔

”وہ پریشان ہو رہا ہو گا کہ میں کیوں موجود نہیں ہوں۔“

”تم ابھی شکار سے واپس نہیں آئے۔“ وہ تھیلی میں بادام اور کشمش

ہموزن ملائے ہوئے۔ تولتے ہوئے۔ منہ کی طرف اچھالتے ہوئے بولا۔

”جناب۔ پہلے باہر ناظم نے رسیو کیا ہو گا۔ اور جب اس نے بتلایا ہو گا

کہ میں شکار سے واپس آچکا ہوں، اُس کے بعد ہی بابا جان نے ناظم کو کہا ہو گا کہ میرا فون ملا دے۔

”ہوں“ وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اور شان نے قریب ہی رکھے ہوئے فون پر بابا جان کے نمبر ڈائل کر دیئے۔

”جی۔ بابا جان۔ آپ کا طبیعت کیسا ہے۔ جی میں ہمارا ہاتھ WAS
IN THE BATH ROOM۔ سوری بابا جان آپ کو زحمت ہوا۔ جی۔ جی۔
جی نامہ بھی آیا ہوا ہے۔ جی ہاں.....“

”میں باتھ روم میں ہوں“ اور نامہ جھٹ اٹھ کر باتھ روم میں جا گھسا۔
”یس بابا جان۔ جی وہ باتھ روم میں ہے۔ میں اس کو کہہ دے گا۔“

یس۔ IT WAS WONDER FUL۔ دوہرن لایا ہوں۔ آپ پندرہ
دن بعد آئے گا۔؟ بے جاؤں گا۔ ٹھیک ہے۔ ذیشان کنٹرکشنز پر اچھا
ٹھیک ہے DONT WORRY اور کے گڈ نائٹ“ اُس نے ریسورکرڈ پر
رکھ دیا۔ اور نامہ جھپٹ لگا کر صوفے پر براجمان ہو گیا۔

”کیسے ہیں ماموں جان۔؟“ وہ گھنی مونگ بھلی منہ میں ڈالتے ہوئے
بے نیازی سے پوچھنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ تمہارا پوچھ رہے تھے۔“

”کب آرہے ہیں۔؟“ نامہ نے پوچھا۔

”پندرہ دن بعد۔“ شان نے کہا

”گڈ۔“ اُس نے جیسے نجات کی سانس لی۔ اور شان خوبصورتی سے مسکرا دیا

کہ میں شکار سے واپس آچکا ہوں، اُس کے بعد ہی بابا جان نے ناظم کو کہا ہو گا کہ میرا فون ملا دے۔

”ہوں“ وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اور شان نے قریب ہی رکھے ہوئے فون پر بابا جان کے نمبر ڈائل کر دیئے۔

”جی۔ بابا جان۔ آپ کا طبیعت کیسا ہے۔ جی میں ہمارا ہاتھ WAS
IN THE BATH ROOM۔ سوری بابا جان آپ کو زحمت ہوا۔ جی۔ جی۔
جی نامہ بھی آیا ہوا ہے۔ جی ہاں.....“

”میں باتھ روم میں ہوں“ اور نامہ جھٹ اٹھ کر باتھ روم میں جا گھسا۔
”یس بابا جان۔ جی وہ باتھ روم میں ہے۔ میں اس کو کہہ دے گا۔“

یس۔ IT WAS WONDERFUL۔ دوہرن لایا ہوں۔ آپ پندرہ
دن بعد آئے گا۔؟ بے جاؤں گا۔ ٹھیک ہے۔ ذیشان کنٹرکشنز پر اچھا
ٹھیک ہے DONT WORRY اور کے گڈ نائٹ“ اُس نے ریسورکرڈ پر
رکھ دیا۔ اور نامہ جھپٹ لگا کر صوفے پر براجمان ہو گیا۔

”کیسے ہیں ماموں جان۔؟“ وہ گھنی مونگ بھلی منہ میں ڈالتے ہوئے
بے نیازی سے پوچھنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ تمہارا پوچھ رہے تھے۔“

”کب آرہے ہیں۔؟“ نامہ نے پوچھا۔

”پندرہ دن بعد۔“ شان نے کہا

”گڈ۔“ اُس نے جیسے نجات کی سانس لی۔ اور شان خوبصورتی سے مسکرا دیا

اپنے کالج کی سلمیٰ سے ملنے جاؤں گا۔ اُس کے بعد ناہید کے پاس
جاؤں گا۔ میری گرل فرینڈ جس کا میں تمہیں اکثر لندن خط میں لکھا
کرتا تھا۔ اور پھر۔۔۔۔۔“

”یہ دیکھو میرے ہاتھ۔“ شان نے اپنے باقاعدہ جوڑے ہوئے ہاتھ
نامر کو دکھائے۔ ”منگنی کے بعد تو کچھ آرام کر دو۔“
”نائس۔ نہیں۔ تو بہ کر دو۔“ اُس نے کان چھوئے۔ ”میں پابندیاں
براثت نہیں کر سکتا۔“

”وہ تو میں نے تم کو منگنی کی خواب دیکھتے ہی سمجھایا تھا کہ باز
آجاؤ۔ تم کسی ایک کا ہو کر نہیں رہ سکتا۔“

”شادی کے بعد رہ لوں گا۔ لیکن اب۔ یہ چند مہینے۔ سوال یہ
پیدا نہیں ہوتا۔ میں بیمار ہو جاؤں گا۔“

”میں بھی نہیں چاہتا کہ تمہارا صوت خراب ہو۔ لیکن یہ چھٹیاں
تم نے صرف میرے ساتھ گزارنا ہے۔“

”خدا کا نام لا۔ چھٹیاں اور تمہارے۔ سنجیدہ تم رہتے ہو۔“

NERVES پر بوجھ میرے پڑنے لگتا ہے۔ چپ تم رہتے ہو جبر طوں
میں درد میرے ہونے لگتا ہے۔“

”سنو۔ میں اور تم پہاڑ پر جا رہے ہیں۔“

”مار دیا۔ کوئی کالپ واپس میز پر رکھتے ہوئے وہ صوفے پر
لڑھک گیا۔ یہاں کیا کم سردی ہے۔ اور پھر پہاڑ پر نہ بندہ نہ

بندے کی ذات - نابابا -

”افوہ۔ پورا بات تو سنو۔ پہاڑ پر صرف دو دن رہیں گے۔ نیا شینری
ریسیو کر کے پہنچانا ہے وہاں۔ کام ابھی نہیں ہے ادھر۔ اُس کے بعد وہاں
نیچے شہر میں چلے جائیں گے۔ باقی دن وہاں گزار لیں گے۔ چنچ ہو جائے گا
ذرا۔ تمہاری بندیاں بھی نظر آجائے گی۔

”ٹھیک ہے۔ مگر ریشماں۔ سلمیٰ ناہید۔“ ناصر نے کہا۔

”اُس کا واسطہ پھر کبھی چپٹی لے لینا۔“

”سوچ لوں گا۔“ اُس نے واقعی سوچتے ہوئے کہا۔

جبکہ اُسے معلوم تھا۔ چالیس میل پرے اور وہ بھی پہاڑ کے
اُس طرف نیچے اتر کر۔ رنگینی یقیناً متوقع تھی۔

”ٹھیک ہے۔ پھر کل چلے چلیں گے۔“ ناصر نے مزید کہا۔

”کل نہیں۔“ شان جلدی سے بولا۔

”کیوں۔ اب کونسا کام نکل آیا۔“

”دراصل وہیل کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ شاید کل ہی بچہ ہو جائے۔ میرا

موجودگی بہت ضروری ہے۔“ شان کا لہجہ تشویش ناک تھا۔

”میں کہتا ہوں تم یہ زچہ گیری کب چھوڑ دے۔“ ناصر کو غصہ آ گیا۔

”تم کچھ بھی کہو۔ میں وہیل کو ایسا حالت میں اکیلا نہیں چھوڑ

سکتا۔“ شان کا فیصلہ اٹل تھا۔

اُس کی گھوڑیوں کے جب بھی بچے پیدا ہونے والے ہوتے۔ اُس

کے دن تشویش میں گزرتے اور پیدائش کے وقت تودہ حتی الامکان گھر پر ہی رہنے کی کوشش کرتا۔ نوکروں پر اس معاملے میں وہ کبھی بھروسہ نہیں کرتا تھا۔

رات کا کھانا دونوں نے وہیں آگ کے پاس بیٹھ کر کھایا۔ پھر تھکے ہوئے تو تھے ہی۔ جلدی جلدی اپنے اپنے کمروں میں پڑ کر سو رہے۔

صبح کے چار بج رہے تھے۔ ناصر بے خبر سو رہا تھا۔
 ”ناصر۔ ناصر۔“ شان نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔
 ”کیا ہے۔؟“ وہ ہڑبڑا کر جاگ اُٹھا۔

”وہ۔ وہ۔ دہیل کا بچہ ہو گیا ہے۔ نہ رہے۔“
 ناصر نے ایک خشکین نظر اُس پر ڈالی۔

نائٹ سوٹ پر سوئیٹر پہنے۔ آستین اوپر چڑھائے۔ گندے آلودہ ہاتھ۔ کپڑوں پر جگہ جگہ گھاس پھوس اٹکی۔ پائینے گیلے چہرے پر ایک طرف کیچڑ لگی۔ ماتھے پر بال پریشان۔ مگر آنکھیں بے پناہ خوشی کی صفا من تھیں۔

”مبارک ہو۔“ ناصر قدرے نرم پڑ گیا۔

”THANK YOU NASIR۔ آؤ۔ دیکھو نا۔“ وہ بچوں کی سی خوشی سے بولا۔ اور ناصر ایک اور نظر اُس پر ڈال کر رہ گیا۔
 ”چلو۔“ اُدور کوٹ پہنتے ہوئے وہ شان کے ساتھ ہولیا۔

اصطبل میں تو دن بنا ہوا تھا۔ ایک طرف آگ جل رہی تھی۔
 پاس ہی کریم بابا آگ تاپتے چائے پینے میں مصروف تھے۔ ناظم بچہ پڑے
 کے پاس گھڑا تھا۔ پھر واقعی بہت پیارا تھا۔ مگر شان کے شوق
 کے بھی کیا کہنے۔ کبھی وہ سب کے آگے بچھے ہوتا، کبھی بچہ پڑے کو پیار کرتا۔
 ماما کے شاید سر میں درد تھا۔ سیاہ پٹی ماتھے پر باندھے۔ شان
 اور مے وہ وہ سب کو کچھ کھلانے میں مصروف تھیں۔

اور پھر دوبارہ سونا کہاں؟

شان نے کپڑے بدلے۔ نماز پڑھی اور اس کے بعد دونوں
 ہی ناشتہ کرنے لگے۔

”آج بہت صبح ناشتہ کروایا ہے“ ناصرت نے کہا۔

”یار۔ تمہارا ہی حکم مانا ہے۔ بہاڑ پر نہیں جانا۔“

”اوہ۔ ونڈر فل۔ کس وقت نکلیں گے۔؟“

”اس وقت ساڑھے چھ ہے۔“ شان نے گھڑی دیکھی۔ ”آٹھ

تک نکل جانا چاہیے۔“

اور پھر۔ واقعی وہ لوگ ٹھیک آٹھ بجے ناظم اور کریم بابا کو

ساتھ لے کر چل پڑے۔

شان تم یقیناً مجھے یہاں مارنے لائے ہو۔“ دو سوائٹر کوٹ، اوڈر کوٹ، گرم ادنی ٹوپی اور ان سب کے اوپر کمبل پیٹے جلتی لکڑیوں کی آگ میں گھٹے بیٹھے ناصرنے کہا۔

”حوصلہ کیجئے صاحب۔ یہی رات ہے۔ کل چلے ہی جائیں گے۔ کریم بابا بھی سردی سے بے حال تھے۔

اور۔ منیٹل پیس سے ٹیک لگائے شان دھیرے سے مسکرا دیا۔

”بابا کل کا کیا پتہ دیکھتا بھی ہوں یا نہیں؟“

”ضرور دیکھیں گے صاحب۔ بُرا فال مُنہ سے نہ نکالئے۔“

”بابا چھائے۔“ ناصرنے سردی سے کانپ کر کہا۔

”اچھا صاحب۔“ کریم بابا بمشکل اُٹھئے۔ ابھی لاتا ہوں۔“ اور بابا کچن کی طرف چل دیئے۔

”یہ تم کیا ایلٹنگ کر رہے ہو۔“ شان نے بابا کے جانے کے بعد کہا۔

”ایکٹنگ کر رہا ہوں۔“ ناہرنے کہا۔

”اور کیا۔ سردی کیا مجھ کو نہیں لگتا۔“

”تمہیں۔؟ تم انسان ہو۔؟ تم تو جاؤ وکیل کے بچے پیدا کرو۔ ریٹا بھی منتظر ہے اُس کے پلے بھی تمہاری عدم موجودگی میں اس دنیا میں قدم نہیں رکھیں گے۔ پھوٹی اُس بد بخت کی قسمت جو تمہارے پلے بندھے گی۔ کبھی ایک آنکھ دہلے۔ ناہرنے واقعی ایک آنکھ میسر کی۔ کسی گن کی صفائی میں مصروف ہوگی۔ کبھی تمہارے کتے ہٹلائے گی۔ اور کبھی اسٹبل میں ڈیرہ جمائے گھوڑوں کے بچے پیدا کروا رہی ہوگی۔ یا میں تو کہتا ہوں کھول ہی لو ایک ”مرکزِ چہ و بچہ۔!“

اور۔ شان اُس کی آخری بات پر بے اختیار قہقہہ لگا اٹھا۔

”اب انسان لگا رہے ہو۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”بالے دادے لڑکیاں تمہارے دانتوں کے ہارے میں کیا کہتی ہیں؟“ وہ جیسے سردی بھول بھال گیا۔

”دیکھے ہی نہیں ہے۔“

”یہ کیوں نہیں کہتے دکھائے نہیں ہیں۔“

”بات ایک ہی ہوا۔“

”یعنی کسی نے تعریف نہیں کی اب تک۔“

”No۔“ اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”دیکھو شان! مجھے مزید بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کل زندوں کی

دنیا میں جا رہے ہیں۔ اُس کا اشارہ نیچے وادی کی طرف چالیں میل پر
واقع چھوٹے سے خوبصورت شہر کی طرف تھا۔ اور تم نے مُردگی دکھائی تو۔ یاد
رکھو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہو گا۔ بابا۔ شکر یہ بابا۔ "SO NICE OF
YOU BABA" بابا کو دیکھتے ہی وہ پھر سردی میں مبتلا ہو گیا۔
اور شان نے بناتہ رہ سکا۔

"لیجئے چھوٹے سرکار۔" ناصر کو چائے دینے کے بعد بابا نے شان کو کپ پکڑا دیا۔
"شکر یہ بابا۔"

"بابا کھانے میں کتنی دیر ہے۔؟" ناصر نے گرم گرم چائے کا گھونٹ
بھرتے ہی پوچھا۔

"بس تیار ہے سرکار۔" بابا نے کہا۔

"تو لائیے پھر۔ انتظار کس بات کا ہے۔"

"ابھی تو صرف چھ بج رہے ہیں۔" شان نے کہا۔

"انڈھیرا تو ہو چکا ہے نا۔" شان کی ہر کام میں باقاعدگی سے وہ

نالال ہی رہتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ لے آئیں جیسا ناصر کہتا ہے۔" شان نے کہا۔

"جیسے ناصر کہتا ہے۔ تمہیں کیا بھوک نہیں ہے۔"

"کوئی خاص نہیں۔"

"تم خود خاص نہیں۔ بہت بھوک کیا خاص ہوگی۔"

"مجھے تو کوئی خاص بات نظر نہیں آتی اس میں۔" شان پھر چونکا۔

اور دھیمی سی مدھر مسکراہٹ پھر اُس کے لبوں پر چھا گئی۔

”بابا آپ کہتے تھے جس رات شان پیدا ہوا تھا۔ سخت برف باری ہو رہی تھی۔“ ناصر دوسری پیالی بھرتے ہوئے بولا۔

شان بابا کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں نے کہا تھا۔؟“ بابا بے چارے گڑبڑا گئے۔

”ہاں۔“ ناصر آرام سے بولا۔ اور شان اپنے اوپر ناصر کی چوٹ سمجھ کر دھیرے سے مسکرا دیا۔

”سرکار! شان بیٹے کی پیدائش تو صبح پانچ بجے ہوئی تھی۔ بڑے صاب فرماتے تھے کہ اُن کے یہاں سورج طلوع ہوا ہے اور اُس وقت بھی گرمی اس غضب کی پڑ رہی تھی کہ الامان۔“

”جی بھی اُس گرمی کی غضب ناکی اس میں بھی جھلکتی نظر آتی ہے۔“ ناصر بے حد اطمینان سے بولا۔

بابا مسکرانے لگے۔

”کھانا لاؤں صاحب۔؟“ بابا چلے کے خالی برتن سمیٹے ہوئے لوے

”ہاں بابا۔“ شان نے کہا۔ اور بابا بڑے ہاتھوں میں تھامے چل دے۔

”برف باری میں پیدائش سے تمہارا کیا مطلب تھا۔“ شان نے اُس کی لڑپی اُچکتے ہوئے کہا۔ اور اُٹھتے ہوئے جھپٹ کر ناصر نے اپنی لڑپی اُس سے واپس لے لی۔

”سنا ہے جو سردی میں پیدا ہوتا ہے۔ اُس کو سردی نہیں لگتی۔“

ٹوپی دوبارہ پہنتے ہوئے ناصر نے کہا۔

”تم یہ کیوں نہیں سوچتا کہ جو سخت گرمی میں پیدا ہوتا ہے۔ اُس کو ہر وقت گرمی لگتی ہے اور وہ صرف سردی میں ٹھیک رہتا ہے۔“

”اوہ۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ویسے تم سنئے اتنی عقل کی امید نہیں تھی برخوردار۔“ ناصر نے ہاتھ ملانے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا اور شان نے اُس کا ہاتھ تھام کر زور سے جھٹکا۔

”بیٹا تمہارا اور ہمارا پیدائش کا مہینہ ایک ہے اور تم جس علاقے میں پیدا ہوا تھا۔ وہاں باہا جان بتاتے ہیں گرمیوں میں چکن روٹ کرنے کے لئے آگ کی ضرورت پیش نہیں آتا تھا۔“

”I SEE۔“ کچھ غور و فکر کے بعد ناصر نے کہا۔

کھانا دونوں نے خوش گوشت باتوں کے دوران کھا لیا۔ ایک کپ اور گرم چائے پی لینے کے بعد ناصر تو بستر میں گھس گیا اور خانہ چپ عادت نماز کی نیت باندھ لی۔

”یا اللہ! تو مجھے معاف کر۔ اس سردی میں مجھے باقاعدہ یاد نہ کر سکا۔“ ناصر کی بستر کے اندر سے آواز آئی۔

”گرمی آئے تو پھر ضرور یاد کر لینا۔“ نماز کے اختتام پر شان نے اُس کی نماز نہ پڑھنے کی عادت پر لطیف چوٹ کی۔

شان نے بھی رات کے کپڑے بدلے اور بستر میں لیٹ گیا۔

”شان۔ تم نے کپڑے بدلے۔“ ناھر سرمنہ لپیٹے بستر کے اندر ہی سے بولا۔

”ہاں۔“ شان نے جواب دیا۔

”مچھلی کے پچے کی کیا ضرورت تھی۔“

”نیند نہیں آتا پھر۔“

”سوئیٹر تو پہنا ہے نا؟“ اُس نے مزید پوچھا۔

”نہیں تو۔“ شان نے کہا۔

”سچ کہتے ہو؟“ اُس کا بیجہ گھبرا یا ہوا اٹھا۔ سراب بھی اندر ہی تھا۔

”کیوں؟“ شان نے پوچھا۔

”شان۔ تمہیں تنگ تصور کر کے ہی مجھے بخار ہو جائے گا۔ وہ مزید گھبرا کر بولا۔

شان نے ایک بھر پور قہقہہ لگایا۔

”تصور مت کرو۔ سو جاؤ اب۔ گڈ نائٹ۔“ شان نے سر ہانے

رکھا لیچ آف کر دیا۔

”گڈ... نا... ٹٹ۔“ ناھر کی کانپتی آواز آئی۔

دائیں طرف سر بفلک پہاڑ، سدا بہار پائینتر۔ بائیں جانب پہری
کھائی۔ سمی برف سے اٹے پڑے تھے۔ پتلی چکر دار سڑک دھند میں
پٹی نظر آرہی تھی۔ اُس نے جیب کی ہیڈ لائٹس آن کر لی تھیں۔ اس
کے باوجود راستہ بمشکل نظر آ رہا تھا۔

آج خلافِ عادت وہ خود جیب ڈرائیو کر رہا تھا۔ ناہر کے بار بار
کہنے پر وہ ڈرائیو ناظم اور کریم یا باکو دس پہاڑ پر کوٹھی میں چھوڑ آیا تھا۔
وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

اُس نے اوپر نگاہ کی۔ گھنگھور گھٹائیں اب بھی پورے آسمان کو
گھیرے میں لئے ہوئے تھیں۔

”سچ پوچھو ناہر تو I LOVE THIS SEASON“ شان نے اوڈر کوٹ
کا کالر اوپر چڑھاتے ہوئے مسخور لہجے میں کہا۔ اور ناہر۔ ایک تہر آلود نظر
اُس پر ڈال کر اپنے گرد لپٹی کبل میں ٹانگیں اوپر کر کے بیٹھ پرالٹوں بیٹھ گیا۔

”یوں تو خدا کا قدرت ہر جگہ، ہر چیز میں موجود ہے۔ مگر کیا یہاں آ کر تم کو ایسا محسوس نہیں ہوتا۔۔۔“

”کہ خدا یہیں رہتا ہے۔“ جیب کا ونڈا اسکرین شاید ہل گیا تھا۔
کھنچ کر اس نے مضبوط کرتے ہوئے شان کو لقمہ دیا۔

”تمہیں کوئی شک ہے؟“ شان نے رخ پھیر کر اُسے دیکھا۔

”مولوی کے بچے آگے دیکھ۔ اس TRIP سے زندہ واپس پہنچاؤ
خیرات دوں گا۔“

اور شان احتیاط سے اترائی اترنے لگا۔

”ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔“ اچانک جیب کی چھت زنج اٹھی۔

”لو جلت رنگ بھی سن لو۔ یا اللہ! میں کس مصیبت میں پھنس گیا۔“

شان کے بچے۔“ بارش کے قطرے پڑتے سنتے ہی وہ دانت کٹکٹانے لگا۔
شان نے دائیرہ چلا دیئے۔

”اس سے کچھ نہیں ہوگا“ وہ اب بھی کاپٹی آواز میں بولا۔

”پتہ تو تب چلے گا۔ جب ہوٹل میں رہے گا۔ بغیر ناظم اور کریم بابا
کے۔“ شان ہنستے ہوئے کہا۔

”وہ تو سروس میں رہ کر میں نے سیکھ لیا ہے۔ تمہیں البتہ زحمت
ہوگی۔ کریم بابا انڈر ویر پہنانے کو نہیں ہوں گے تو۔“

”تو تم نے جان بوجھ کر دونوں کا چھٹی کرا لیا ہے؟“ مانا کہ اب بچپن
کی طرح بابا اس کو واقعی کپڑے تو نہیں پہناتے تھے۔ مگر پہننے میں مدد

ہر در دیتے تھے۔ شان کو اس وقت لگا کہ یہ ناصر کی شرارت تھی۔
 ”اُس وقت مجھے یہ تو خیال نہیں آیا کہ وہ نہیں ہوں گے تو تم
 شگے رہ جاؤ گے۔ بلکہ....“

”بلکہ کیا۔؟“

”مجھے اپنی فکر تھی۔“ شیخے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، راستہ دیکھنے
 کی کوشش کرتے ہوئے وہ لا پر واپسی سے بولا۔
 ”کیا۔؟“

”یار ان کے سامنے ہم کسی کو CHASE کر سکتے تھے۔ جیسے گردن
 باہر ڈال کر پیچھے مڑ کر کسی کو دیکھ سکتے تھے۔ پھر اپنے کسی ہلکے پھلکے ریمارک پر
 ”بد تمیز۔ مکینہ۔ ذلیل۔“ وہ خالص زمانہ انداز میں بولنے لگا۔ سن سکتے
 تھے۔ تم تو عجیب بے دماغ آدمی ہو۔“
 ”ہم کا سمجھ نہیں آیا۔؟“

”ہم“ سے مراد ہے میں اور تم۔“

”میں ہاتھ جوڑتا ہے۔“ اس نے اسٹیزنگ چھوڑ چھاڑ دونوں ہاتھ
 جوڑ دیئے۔ ”اور پھر یہ گردن مڑنا نہیں جانتا۔ سامنے دیکھنا جانتا
 ہے۔“ ناصر کو چڑھاتے چڑھاتے بھی اُس کے آخری الفاظ میں جیسے ایک
 عزم تھا۔ ایک استحکام تھا۔

”یہ کوئی اتنی حسین خوبی نہیں ہے۔“
 ”خوبی ہے تو۔“ شان نے عزم سے کہا۔

” اتنی خاص نہیں۔ “ ناصر مزید لا پر دای سے بولا۔

اور۔ لفظ ” خاص “ اُسے جانے کیوں چڑکا دیتا تھا۔

زندگی میں پہلی بار کسی لڑکے نے اُسے لفظ ” خاص “ سے پایاں قرار

دیا تھا۔ شاید اس لئے۔ دھیمی سی مسکراہٹ نامحسوس طریق پر اُس کے لبوں پر پھیل گئی۔

شہر کی آبادی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ آگے قدرے فاصلے پر بائیں

جانب بنی دو چار چھوٹی چھوٹی دکانیں زندگی کا پتہ دے رہی تھیں۔

” روکو۔ چائے کی دکان ہے۔ “ ناصر اچانک بے تابی سے اچھلا۔

شان نے دیکھا۔ واقعی کئی چھوٹی چھوٹی پیالیاں سامنے رکھی نظر

آ رہی تھیں۔ چائے کی کیتلی آگ پر رکھی تھی۔ اور اُس میں سے گرم گرم بھاپ

نکل نکل کر زندگی کی حرارت بخش رہی تھی۔ چھوٹی سی دکان میں چند

لکڑی کی کرسیاں اور اُسی حساب سے میزیں بھی رکھی تھیں۔

” کچے گا کون جا کر۔؟ “ شان گاڑی روکتے ہوئے بولا۔

” معاف کرنا جاگیر دار صاحب۔ خود تشریف لے جانا پڑے گی۔ “ ناصر

اپنے آپ کو کبیل میں مزید لپیٹتے ہوئے بولا۔

” خود اپنا تشریف کے بارے میں کیا خیال ہے۔ “

” اپنی تشریف سردی سے جم گئی ہے۔ “

” چائے تم نے پیتا ہے۔ میں نے نہیں۔ “ شان نے کندھا چکاتے ہوئے

کہا۔ اور جیب میں چابی گھما دی۔

”اور کو بھی۔ بڑا آیا نہ پینے والا۔“ ناصر بظاہر حواس درست کرتے

ہوئے بولا۔ ”جاتا ہوں۔“

پھر اُس نے آہستہ آہستہ کمر سے پاؤں باہر نکالے نیچے ٹسکائے۔ اور
بھی ہوٹل کا چھوٹا سا لڑکا قریب آگیا۔

”صاحب! چلے لاؤں۔“ وہ بند کھڑکی میں زور سے بولا۔

”اوجیو بیٹا!“ ناصر نے دروازے کی دھڑ سے منہ لگا کر آواز لگائی۔

”دودھ پتی۔ گرم گرم۔ چائے ٹنگ بھر کے۔“

اور اُس نے پھر پاؤں اوپر اٹھا کر کمر سے ڈھک لئے۔

”اچھا صاحب!“ بچہ خوش ہو کر پلٹا۔

اور شان سراسٹرنگ پر ٹیک کر بے اختیار منہ دیا۔

ناصر نے ایک خشمگین نظر اُس پر ڈالی۔

”فدایہ تھمس دینا!“ قدرے توقف کے بعد شان نے ناصر کے

پاؤں کے پاس رکھے تھمس کی طرف اشارہ کیا۔

”خود ہی لو۔“ ناصر گویا ناراض تھا کھڑکی کی طرف رخ کرتے ہوئے

بولا۔ اور شان نے ہاتھ نیچے جا کر تھمس خود ہی لے لیا۔ گھولا اور اسی

کے کپ میں اسٹرنگ کافی اندھیلی۔

”پئے گا؟“ تھمس کا ڈھکن بند کرتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ ناصر نے کہا۔

”پچھتائے گا۔“ تیز خوشبو اچھاپ اٹھتی کافی کا کپ ناصر آنکھوں کے

سامنے ہراتے ہوئے شان نے کہا۔

اور چھوٹا سا لڑکا۔ واقعی چائے نگ بھر کر چائے اور دو پیالیاں
چھوٹی سی ٹرے میں سجائے لے آیا۔

ناصر نے تھوڑا سا دروازہ داکیا۔ بمشکل ٹرے اندر کی احد جلدی سے
دروازہ پھر بند کر دیا۔

”پیو گئے۔؟“ چھوٹی سی پیالی میں دودھ پتی گرم گرم چائے انڈالتے
ہوئے ناصر نے کہا۔

”No“۔ شان نے اپنی کوئی کا ایک تیز کر ڈاگھونٹ پی کر
مزہ لیتے ہوئے کہا۔

”پچھتاؤ گئے“ ناصر نے یادانی رنگ کی گاڑھی سی چائے کا کپ
شان کی نظروں کے سامنے ہرایا۔

اور شان کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

”دیکھو بیٹا انٹرکونٹی نینٹل کی چائے کا بھاری وزنی کپ، اس دودھ
پتی چائے کی چھوٹی سی میلی پیالی کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور پھر گرمیوں میں
جب یہی چھوٹی چھوٹی لکڑی کی کرسیاں اور میز اسی دوکان کے آگے لگ
جاتے ہیں اور لوگ یہاں بیٹھ کر اسی چھوٹی سی پیالی سے اسی چائے کی
چسکیاں لیتے ہوئے، عام رومائس سے لے کر دنیا بھر پالنگس DISCUS
کرتے ہیں تو پیرس کی PAYMENT CAFES بھی ماند پر جاتی ہیں۔“
”واقعی۔؟“ شان نے اپنا کپ آگے بڑھایا۔

”واقعی۔“ ناصر نے اپنا کپ اس کے کپ سے ٹکرا دیا۔

“CHEERS TO MAMA BEGUM”

اور شان نے ایک جان دار تہقہ لگایا۔

ناصر نے برتن واپس کئے تو شان نے جیب اسٹالٹ کر دی۔ اور پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

میل بھری فاصلہ طے کیا تھا کہ برفباری شروع ہو گئی۔

”ڈنڈر فل۔“ شان خوش ہو کر لولا۔ اور ناصر نے ناگواری سے منہ

دوسری طرف پھیر لیا۔

”بھے ایک چیز کی سمجھ نہیں آئی۔“ ناصر لولا۔

”کس چیز کا۔؟“

”سرد سے سرد علاقے میں کوچ کرنے کی۔ یعنی بجائے اس کے کہ گاؤں

میں سردی تھی۔ ہم جلتے کسی گرم علاقے کی طرف تو مزہ بھی آتا یہ کیا تنگ،

کہ گاؤں کی سردی سے اٹھ کر ہم نقطہ انجماد پر آ کر جم رہے ہیں۔“

”اسی کو تو زندگی کہتے ہیں۔ اونچے پہاڑوں پر برف جما ہو۔ ہر طرف

دھند چھایا ہو۔ موٹا موٹا بادل آیا ہو۔ اسٹرڈنگ کافی کا رنگ ہو۔ گھونٹ

گھونٹ کر کے ہم کافی پی لے رہا ہو۔ مگ سے فیومنرا اٹھ رہا ہو۔ اور

ہم کسی سوچ میں غم سوخ کوٹلوں کو تنگ رہا ہو۔

”کسی سوچ میں غم، اور تم۔ ہونہ۔ اپنی شاعری کا آخری حصہ

چھ سے منسوب کر کے تم پہلے حصہ پڑھا جاؤ۔ پہاڑ ہو، برف ہو۔ اور تم۔

یخ سرد۔ میں حیران ہوں کہ لڑکیوں کو تم میں کیا نظر آتا ہے۔ بجائے اس کے کہ تمہیں دیکھتے ہی انہیں سردی لگے اور بھائیں گرم کوٹ کی طرف۔ یعنی میری طرف۔ وہ SKIING کرتی تھامی طرف ہی بڑھتی ہیں۔

برف کی دہرہ سے دائیں پر بھی ٹھیک کام نہیں کر رہا۔ ناظم اور کریم بابا کو خواہ مخواہ تمہارے ساتھ نہیں لایا۔ ایسے راستوں اور موسم میں کسی نہ کسی کا ہونا ضروری تھا۔ وہ بمشکل ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔

”چپ کرو۔ چپ کرو۔ ناصر آن سنی کرتے ہوئے دروازہ کھول کر پیچھے جھانکا۔ کیا غضب کی چیز تھی؟ دروازہ دوبارہ بند کر کے وہ مزید بولا۔

”چھتری سر پر لے چائینز موڈل لگ رہی تھی۔

شان زبر لب مسکرایا۔

”تم بھی کسی کو چھوڑتا نہیں ہے۔“

”توبہ کرو۔ میں تو تمہاری بیوی کو بھی آنکھ ماروں گا۔“

”اسی لئے تو میں شادی نہیں کرتا۔ کہ میں تم کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اور تم آنکھ

مارنا نہیں چھوڑ سکتا۔“ شان خوبصورتی سے ہنستے ہوئے بولا۔

ناصر نے ایک نظر ادا۔ چپ کا دروازہ کھول کر پیچھے ڈالی۔

”ویسے اس ٹرپ کے بعد واپس جا کر میں ایک لمبا خط تمہیں بھجانی کو

لکھوں گا۔ جس میں چائینز موڈل سے لے کر باقی کا سارا ہفتے کا ہر باریک

خبر موجود ہوگا۔ شان بولا۔

”خبردار۔ کہیں سچ پچ ایسا نہ کر دینا۔“ وہ اچانک گڑبڑایا۔

”یہ تو ہوگا“ شان نے کہا۔

”کبھی نہیں ہوگا۔ ویسے تم نے بہت بے وقت اس کی یاد دلادی۔

ہائے۔ ہائے۔“

”کیا واقعی۔؟“

”اور کیا۔ اچھی تو دہائی لگتی ہے۔ یہ تو سب ویسے ہی پس ذرا دل خوش

کرنے کو۔ اوہ۔ اوہ دیکھو۔ وہ۔ سامنے دائیں طرف“

وہ پھر بھول بھال گیا۔

اور شان نے دیکھا۔

دائیں طرف دو اور بڑیاں چھتیاں سروں پر لئے ایک گیٹ کے

اندروں داخل ہو رہی تھیں۔

”جگہ اچھی ہے“ بڑیاں قاضی آپ ٹوڈیٹ لگ رہی ہیں“ ناہرنے

پاؤں کیبل سے نکال کر نیچے لٹکا دیئے۔ مہذب ہو کر بیٹھ گیا۔ اور شان

چپکے سے مسکرا دیا۔

قدرے آگے بڑھ کر شان نے چپ دائیں موڑ لی۔ اور فرلانگ پھر

چلنے کے بعد ایک شاندار ہوٹل کے گیٹ میں داخل ہو گیا۔

قصہ لکھ 5633

Hardayal Municipal Public Lib. Delhi

ACC NO. 19845-1788

جھجک کے دس بج رہے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ دونوں
 بیار ہوئے۔ آج میوزیم دیکھنے کا پروگرام تھا۔ جیب میں بیٹھے اور
 روٹل سے باہر نکل گئے۔

پہاڑوں پر، ڈھلانوں پر، درختوں پر، جھاڑیوں پر ہر طرف ہر طرف
 ہی ہر طرف بھی نظر آ رہی تھی۔ نیلگوں آسمان البتہ بالکل صاف تھا۔
 ہر طرف بھری ہر طرف سورج کی سنہری کرنوں کو منعکس کر رہی تھی۔ سنہری
 دھوپ پڑھوہ جسموں کو حرارت بخشنے لگی تھی۔ ہر روز زندگی کے آثار
 روٹل اپنے لگے تھے۔ اور روزمرہ کا کاروبار چل پڑا تھا۔

میوزیم پہنچ کر جیب ایک طرف روک کر۔ وہ آگے بڑھے۔
 ٹکٹ خریدے اور وہ اندر داخل ہو گئے۔

گندھاپا آگٹ کے شاہکار شیخے کے شوکیوں میں تنقید سالہا سال
 پہلے کے انسان اور اس کی تہذیب سے روشناس کر رہے تھے۔

یکے بعد دیگرے۔ اُن سے متعلق لکھی تاریخ پر نظریں دوڑاتے
وہ آگے بڑھتے رہے۔

ناہر یہاں بھی اپنی عادت سے مجبور کسی نہ کسی چیز میں مذاق کا پہلو
نکال کر خود بھی ہنس رہا تھا اور شان کو بھی ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا۔
شان البتہ سنجیدگی سے ہراسٹھو، ہراسٹوپا کو نظروں ہی نظروں میں
سراہتا ہوا آہستہ آہستہ دائیں چارہا تھا۔

معا اُس کی نظر سامنے والے کمرے میں پڑی۔ کچھ اسلم، کچھ لباس اور
کچھ زیورات نمائش کے لئے رکھے تھے۔

اسلم کا اُسے جنون تھا۔ اپنے تئیں قدم رکھتا وہ وہاں چلا آیا۔ کئی
سال پرانی ہندو قیں، پستول، بندوق۔ وہ غور سے دیکھنے لگا۔

”انگوٹھی کتنی خوبصورت ہے۔“ ایک نازک سی نسوانی آواز ابھری۔

اسلم سے پھسل کر اُس کی نظریں پاس ہی بچے سا ہمارا سال پرانے
زیورات پر جا پڑیں۔

اور۔۔۔ پھر۔۔۔ گہرے سبز رنگ کے کپڑوں پر سفید کوٹ۔ سفید شوز
رہے ڈارک براؤن بالوں پر سفید فر کی خوبصورت لٹپی سجائے رہے
شبہ وہی لڑکی تھی۔

سردی کی شدت سے چہرے کا گلابی رنگ مزید سرخ ہو رہا تھا۔
خوبصورت شربتی آنکھوں پر گہبی گہنی پتکوں کا سایہ لئے۔ وہ
دیت زیورات میں رکھی ایک انگوٹھی کو تکتی اپنی سا تکتی لڑکی سے مخاطب

تھی۔

اور پھر۔ شان کی نظروں کا اثر تھایا دیے ہی۔ اس نے خوبصورت پلکیں اوپر اٹھائیں۔

ایک پل کو نظریں شان کی نظروں سے ملیں۔ ایک لمحے کو پلکیں جھپکیں۔ جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

اور پھر ایک دم ہی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی۔ پہچاننے میں کامیاب ہو گئی تھی شاید وہ۔

مگر۔ لمحوں میں ہی وہ چمک معدوم ہو گئی۔ خوبصورت ماتھے پر شکنیں سے ابھرا آئیں۔ شفاف گلابی چہرہ ماند پڑ گیا۔

اور پھر۔ کچھ بیزاری، کچھ ناگواری کی ملی جلی کیفیت چہرے پر لے وہ رنج پھیر کر دوبارہ زیورات دیکھنے لگی۔

شان۔ پھر اسلحہ دیکھنے لگا۔

مگر۔ جانے کیا بات تھی اس لڑکی کے رویے میں۔ اُس رات بیٹھ حامد علی کے یہاں ڈنر پر سے بھی وہ ذہن پر بوجھ سائلے گاؤں لوڑ

تھا۔ اور اس وقت بھی۔ اُسے وہی بھاری وزن ذہن پر پڑتا محسوس

ہونے لگا۔

وہ اب بھی خالی خالی نظروں سے ایک بندوق کے ہتھے پر

سنہری نگارکاری کو دیکھ رہا تھا۔

بھی آہٹ پر چونکا۔

ناصر تیز قدم اٹھاتا چلا آ رہا تھا۔

مگر۔ جوں ہی دروازے کے اندر داخل ہوا۔ سامنے کھڑی لڑکیوں کو دیکھ کر یکدم ہی ٹھٹھک کر رُک گیا۔ ایک نظر بغور دونوں کو دیکھا۔ اور پھر سیدھا شان کے پاس آ پہنچا۔

”پچھے دو لڑکیاں ہیں۔“ اُس نے بے تابی سے اطلاع دی۔

”ہاں۔“ نظریں بندوق پر ہی جمائے وہ دھیرے سے بولا۔

”ایک بہت خوبصورت ہے۔“ وہ پھر آہستہ سے بولا۔

”خلیدہ؟“ شان نے بے نیازی سے کہا۔

”جب میں اندر آ رہا تھا وہ تمہیں ہی دیکھ رہی تھی۔“

”ہوں۔“ اُس کی بے نیازی برقرار تھی۔

”تم بھی دیکھو۔“ ناصر نے مشورہ دیا۔

”NEVER۔“ شان جیسے بدک گیا۔

”خفا ہو۔ اُس سے۔“ ناصر نے کہا۔

”STUPID“ وہ دوسری طرف بڑھا۔

ناصر بھی جا پہنچا۔

”تم نے مجھے STUPID کہا تو اُس نے پھر تمہیں مڑ کر دیکھا تھا۔“

لڑکی نے واقعی فرح محسوس طور پر رخ اُس کی طرف پھیرا تھا۔

”PLEASE NASIR I HATH SUCH NON SENSE“ اُس کے

ہجے میں بیزاری اتہا پر تھی۔

وہ آہستہ ہی بولا تھا۔ مگر اُس نے دیکھا لڑکی کے خوبصورت

چہرے پر تار یک سے سائے لہرانے لگے تھے۔

اور تبھی۔ اپنے لہجے کی تلخی کا احساس ہوتے ہوئے بھی۔ اپنی بات کے غیر مہذب ہوتے ہوئے بھی۔ جلنے کیوں۔ اُسے سکون کا سا احساس ہوا۔ جیسے کسی خفیہ جذبے کی تسکین ہو گئی ہو۔

”تم ان سان تھوڑی ہو۔ جی چاہتا ہے ادھر ہی کسی شوکیں میں بند

کر کے چلا جاؤں۔“

”پتیزیں دیکھو“ اب پھر اس کا لہجہ معمول پر آ رہا تھا۔

”ادیکے۔“ ناصر دو قدم چل کر اُسی شوکیں کے پاس جا کھڑا ہوا۔

جہاں دونوں لڑکیاں کھڑی تھیں۔

شان نے رُخ پھیر کر اُسے دیکھا۔

اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے ہنسی آ گئی۔

زیورات کے شوکیں کے پاس اُس دوسری لڑکی کے بالکل قریب

کھڑا ناصر ان سببنا۔ سراد پر اٹھائے ایک اسٹوپ کے نیچے لکھی اس

کی ہسٹری اور اپنی آواز میں پڑھ رہا تھا۔

رُخ پھیر کر واپس۔ اُس نے جلدی جلدی باقی چہروں پر نظر

دوڑائی۔ اور پھر ناصر کے پاس چلا آیا۔

”ناصر جلدی کرو۔ دیر ہو رہا ہے۔“ شان نے گھڑی دیکھتے

ہوئے کہا۔

کچھ دیر قبل کے ذہن پر بوجھ یا پھر تلخی اور بیزاری کا اب اس کے چہرے پر شائبہ تک نہ تھا سول کا بوجھ ہلکا کر چکا تھا۔ شاید اس لئے۔
 "ایسے ہی عورتوں پر ہمیں گھڑی دیکھنی یاد آ جاتی ہے۔" ناصر
 جھنجھٹا یا سا بولا۔

اور شان سنس دیا۔ خوبصورتی سے۔
 "ری۔" ناصر کے پاس والی لڑکی نے آہستہ سے کہا۔
 ناصر چوتھ کر اٹھیں دیکھنے لگا۔
 "ہوں۔" سفید نازک سی آنکلیوں سے چہرے پر گہرائی بالوں کی لٹ
 پیچھے دھکیلتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔
 "چلو۔ چلیں۔" عالم جان انتظار کر رہی ہوں گی۔" لڑکی
 نے مزید کہا۔

"چلو۔" وہ آہستہ سے بولی۔
 اور مڑ کر دروازے کی طرف ہولی۔
 شان نے دیکھا۔ لڑکی بے حد خوب صورت چہرے پر تاریک سے
 سائے تھے۔ اب کے اُس کے ذہن پر بوجھ نہیں تھا۔ جانے کیوں اُسے
 اطمینان سا ہوا۔

وہ لوگ جا چکی تھیں۔ ناصر کو جلیے پرش آیا۔
 "ملاؤ ہاتھ۔" اُس نے شان سے ہاتھ ملایا۔ "وہ ری ہے۔ تم
 شان ہو۔ یعنی ذی شان۔"

”ہوں۔ اور شان نے آہستہ سے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ چہرہ

پھر سے سنجیدہ ہو گیا۔

”اؤ۔ اب ہم بھی چلیں۔ ناصر کو اب وہاں رکنے سے کوئی دلچسپی

نہ رہی تھی۔

”ایک منٹ۔ یہ موڈل دیکھنے دو۔“ شان پھر مصروف ہو گیا۔

”نہیں۔ اُن کے گھر بھی تو معلوم کرنے ہیں۔ جلدی کرو۔ نکل جائیں گی۔“

ناصر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

”مجھ کو کوئی ایسا شوق نہیں ہے۔“ شان کی نظریں اب بھی موڈل

پر لگی تھیں۔

”تم نے ابھی 'ہوں' جو کی تھی۔“ ناصر بچوں کی سی معصومیت

سے بولا۔

”دہوں، کی تھی وہاں، نہیں کی تھی۔“

”میں نے اُس دوسری لڑکی کا گھر معلوم کرنا ہے۔ چلو۔“ اور شان کو

گھبراواؤں سے باہر کی طرف ہولیا۔

شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ کانپتا ٹھٹھہ سورج مغرب میں
 پناہ لینے کے لئے سرگرداں تھا۔ اونچی برف پوش پہاڑیاں اُسے آغوش
 میں لینے کو بازو داکئے کھین۔ نیلے آسمان پر چھلنے بجلہ سے سفید بادل
 آوارہ آندھی سے برس برس پیکار تھے۔

اور دن بھر کی ہما بھی زوال پذیر تھی۔
 جیب میں بیٹھے وہ دونوں بھی دن بھر کے تھکے ہوئے ہوٹل کی طرف
 جارہے تھے۔ بیدھا راستہ چھوڑ کر شان بازار کی طرف ہولیا۔ ناصر کو
 مارچ کے لئے سیز چاہئے تھے۔ اور خود اُسے۔ باقی کے دنوں کے لئے
 ڈرائی فروٹ۔

ناصر جب معمول سردی کی تہہ ہی کے باعث جیب میں ہی ہینٹھا
 رہا۔ شان نے سیز خریدے اور پھر قدرے آگے چل کر ڈرائے فروٹ کی
 دکان پر جا کھڑا ہوا۔

دو کا تدارد ملے فردٹ لٹا فوں میں ڈال رہا تھا۔ اور شان یونہی
 بے خیالی میں اس ادنیٰ نیچے نیچے پہاڑی بانار کا جائزہ لے رہا تھا۔
 تھی وہ چونکا۔ قدرے فاصلے پر وہی لڑکی۔ اٹل بلوکھڑوں پر سفید
 کوٹ، سر کے گرد کپڑوں کے ہمرنگ دوپٹہ لپیٹے، پاؤں میں سفید شوز پہنے۔
 ہاتھوں میں شاپنگ کے تھیلے تھامے۔ اپنی اسی سا تھی لڑکی کے ساتھ سڑک
 کے کنارے کھارے اسی کے سائیڈ پر چلی آرہی تھی۔ پھر چند قدم پر وہ رُک
 گئی۔ لفافے دوسری لڑکی کو بکڑھائے۔

”تم بکڑور میں تھک گئی ہوں۔ وہ مسکراتی ہوئی بولی تو اس کے بے حد
 خوبصورت موتیوں کے سے دانت اپنا جلوہ دکھا گئے۔

وہی لفافے اٹھانے سے اُس کی تھکن پر۔ غیر ارادی طور پر شان
 کے لب بستم ہو گئے۔ مگر پھر اچانک ہی وہ تبسم معدوم ہو گیا۔ ماتھے پر
 سونہیں سی ابھر آئیں۔

دونوں لڑکیاں قریب پہنچ گئی تھیں۔ پاس سے گزرتے گزرتے اچانک
 ہی اس کی نظریں ادھر اٹھیں۔ شان پر پڑیں۔

خوبصورت شری آٹکھوں میں چمک سی لہرائی۔ معدوم ہوئی۔ شان
 گلابی رنگت سرخ ہوئی۔ سناں پڑی۔ دیکھیں چہرے پر رونق آئی۔
 پھسکی پڑی۔ شان کے قریب سے گزرنے کے بجائے دوسری لڑکی سے
 جگہ بدلی۔ اور یوں۔ کتر اگر آگے نکل گئی۔

ایک مہم سی مسکراہٹ پھر شان کے لبوں پر بکھر گئی۔

چلے صاحب۔ میں جیب میں رکھ آتا ہوں۔ دوکاندار کی آواز پر وہ چونکا۔ اور۔ جیب کی طرف ہولیا۔

بازار ختم ہو چکا تھا۔ سڑک سناں تھی۔ اکاؤنٹ کا آدمی نظر آجاتا تھا اور بس۔ سوچوں میں دو بارہ ڈرائیو کر رہا تھا۔

کوئی فرلانگ بھر گئے ہوں گے۔ اُس نے دیکھا۔ اُس سے تقریباً بیس قدم آگے وہی لڑکیاں سڑک کے بائیں کنارے کچے راستے پر تیز قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے سڑک پر موٹر بائیک پر بیٹھے دو لڑکے تھے۔ شاہ کے دیکھتے ہی دیکھتے موٹر بائیک کچے میں اتری۔ لڑکیوں سے آگے بڑھی۔ ان کے سامنے سے گھوم کر دوبارہ پیچھے مڑی۔ اور واپس بازار کے رخ پر ہوئی۔

اُس کا دل اُچھل سا گیا۔ ایک لمحہ کو اُس کا پاؤں ہریک پر گیا۔ مگر پھر اُس نے دائیں نگے دیوڑھی میں سے دیکھا۔ موٹر بائیک کافی پیچھے چلی گئی تھی۔ اُس نے دیکھا۔ لڑکیاں ہونا۔ بچے راستے پر علی جا رہی تھیں۔ گوکہ قدم اپنے پہلے سے کہیں تیز تھے۔

اُس کو اچانک ان پر غصہ آ گیا۔ ایسے وقت میں۔ ایسے موسم میں۔ دونوں جوان لڑکیاں۔ اکیلی۔

”وہ آہستہ آہستہ ڈرائیو کرتا ہوا۔ لڑکیوں سے قدرے آگے نکل آیا نظریں اب بھی اپنے دیوڑھی پر تھیں۔

اور پھر۔ اُس کے اندازے کے عین مطابق۔ وہی موٹر بائیک اُسے

پچھلے آئی نظر آئی۔ اُس نے وہی رفتار رکھی۔ نظریں البتہ دیوار پر جم کر رہ گئی تھیں۔ موٹر بائیک لڑکیوں کے بالکل پاس آ کر رُک گئی۔

اُس نے دیکھا۔ اُن میں سے ایک لڑکا اتر کر لڑکیوں سے بات کرنے لگا۔ دوسرا بائیک بالکل اُن کے سامنے لاتے ہوئے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اور تھپی۔ شان بجلی کی سی تیزی سے پلٹا۔ چند قدم پر تو تھپی ہی۔ شان جیب روک کر اترنے لگا۔ تودہ دونوں لڑکیاں چھوڑ چھاڑ موٹر بائیک پر بیٹھ گئے۔ ابھی پیڈل پر ہی زور آزمائی تھی کہ شان نے گریباؤں سے پکڑ کر دونوں کو اکٹھا ہی میچے گر ادیا۔

اور پھر۔ جہاں شان نے بائیک ڈرائیور کو گریبان سے پکڑا وہاں ناصر دوسرے کی مرمت گھونسوں سے شروع ہو چکا تھا۔ اچھی طرح دونوں کی پٹائی کرنے کے بعد دونوں سے معافیاں منگوائیں۔ اُن کا ہنر نوٹ کیا اور واپس بھاگنے کے بعد۔ شان ہاتھ جھاڑتا لڑکیوں کی طرف بڑھتا۔ ”دل چاہتا ہے آپ کو بھی ماروں اچھی طرح۔“ وہ بے حد غصہ میں تھا۔ سہمی ہوئی زرین نے جھکی پلکیں اٹھا کر دیکھا۔ آج تو اس کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔

اس سے قبل تک تو وہ اُسے سنجیدہ بے نیاز اور غور سے اکڑا ہوا ہی دیکھتی آئی تھی۔ مگر اس وقت کا غیظ و غضب میں ڈوبا۔ پھنکار مارتا۔ دھاڑتا ڈیٹا تو اس کی سوچوں سے ہی بالاتر تھا۔ اس وقت مخاطب تو اس نے دونوں لڑکیوں کو کیا تھا۔ مگر نظریں اسی پر

مرکوز تھیں۔ گویا عتاب کا شکار وہ ہی تھی۔

پتہ نہیں کیوں۔؟ اُسے اپنی غلطی کا احساس تھا۔ یا پھر اُس کے اونچے،
مُہیے، گر جتے دھماڑتے وجود کی ہیبت۔ گہرا کرا اُس نے بلکیں جھکالیں۔ اس
وقت۔ اس سے قبل کی طرح کوئی بیزاری، کوئی تیز نہ دکھا سکی۔

”میں پوچھتا ہوں آپ کو چین نہیں آتا۔ گھر نہیں بیٹھ سکتا۔ آرام
سے۔“ وہ مزید پھنکارا۔

سر جھکائے۔ بوٹ کی ٹو سے زمین کریدتی۔ وہ اب بھی چپ کھڑی رہی۔

”بڑا بولڈ بنا پھرتی ہے۔“ وہ اُسی کو ہی گھورے جا رہا تھا۔ ”بڑا

CONFIDENT۔ خود کو کچھ سمجھتا ہے۔“

اور اُس کی چھکی پلکیں اُپر اُٹھیں۔ ایک دوبارہ چھکیں گھوریدلیں
کے اُس پار سے پانی کے قطرے جیسے چھلکنے کو تھے۔

شان ایک پل کو چپ سا ہو گیا۔

”نیچے اتریں زمین پر ذرا۔ اُس کو تو پُرانا بیر تھا۔ اس قدر جلد۔ یکدم ہی

قابو نہ پاسکا۔ اور دو موٹی لڑھک کر اُس کے خوبصورت گالوں پر آ رہے۔

شان گڑ بڑا گیا۔ ایک نظر دو قدم پر کھڑی دوسری لڑکی پر ڈالی۔ وہ

بھی پشیمان سی کھڑی تھی۔ دو بارہ اپنے شکار کو دیکھا۔

مگر اب وہ سکون پا چکا تھا۔ کئی دلفن کا جمع شدہ دل کا غبار بکل چکا

تھا۔ شاید اس لئے۔ اور پھر وہ قدرے نرم پڑ گیا۔ ایک قدم آگے بڑھا۔

”آپ لڑکیاں ہے۔ لڑکے نہیں ہے۔ اکیلے گھونٹا آپ جیسے کے۔“ اُس نے اُسے

سر سے لے کر پاؤں تک غور سے دیکھتے ہوئے کہا: "بس کا کام نہیں ہے۔"
اور نازک انگلیوں کی پوروں سے اُس نے اپنے گالوں پر سے آنسو
پونچھ لئے۔ سون کر کے ناک کھینچی۔ اور چہرے پر گہرائی بالوں کی لمبی سی لٹ
جھٹک کر بچھے کر دی۔

"سوں" ایک بار پھر۔ انگلی ناک سے لگاتے ہوئے اُس نے ناک دہری کھینچی۔
اور نہ چاہتے ہوئے بھی شان کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ ابھرائی۔

"جواب" شان نے جیب کی طرف اشارہ کیا۔
"نہیں" اُس نے بچوں کی طرح سرفی میں ہلا دیا۔
اور شان نے ہونٹ بھیچتے ہوئے اپنی ہنسی روک لی۔
"چلیں محترمہ! اُس نے دوسری لڑکی سے بھی کہا۔

ناصر اس دوران خلافِ عادت، خالوش کھڑا تمام کارروائی دیکھتا رہا۔
شان کو جیب کی طرف آتے دیکھ کر چپ چاپ جیب میں جا بیٹھا۔
شان نے پچھلا دروازہ کھولا۔ اور ساکتی لڑکی کے اصرار پر زین
پر سکی بیٹھنا پر ٹٹیا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آیا
اور جیب اشارت کر دی۔

پہلے نسرین کا گھر آتا تھا۔ شان نے اسے اُتارا۔ چہرے پر افسانہ دہری
کے تاثرات لئے شکر یہ ادا کرتی رہا تو گئی۔
وہ یہاں کے لئے اسے مزید آگے جانا پڑا۔

عجب نزاکت کی پوٹ تھی۔ تب سے لے کر اب تک برابر روئے جاری تھی۔
 اب تک نسرین اتری نہیں تھی۔ اسے ہی چپ کرانے کی کوشش میں لگی تھی۔
 ندرین پلیر روئے نہیں۔ غنڈھوں نے محسوس کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا۔
 چند ماہ بعد وہ چپ ہو جاتی۔ مگر پھر۔

"نسرین۔ نسرین۔" ساتھ ہی دوبارہ رونا شروع کر دیتی۔
 اور پھر نسرین اپنے گھر پر اترنے لگی۔ تو "نسرین مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے تم
 میں جاؤ۔" اس کی بھرائی ہوئی آواز شاق اور ناہر صاف سن رہے تھے۔
 ہر مطلق عادت خاموش خاموش سا ہونے کے باوجود سکا دیا۔
 "دیر ہو رہی ہے۔ درخت میں ہتھ مار رہے ساتھ جاتی۔ تم گھبراؤ نہیں یہ
 شریف لوگ لگتے ہیں۔"

"ہاں۔ یکدم شریف ہیں۔ ناہر بول ہی پڑا۔ مگر ابھی بھاری بھاری سا تھا۔
 "آپ لوگ وائینڈ مت کریں۔ یہ ویسے ہی جلد گھبرا جاتی ہے۔"
 نسرین کا ابھی محنت لئے تھا۔

اور پھر وہ اپنے گھر پر اتر گئی تھی۔
 اب وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ وقفے وقفے سے اب بھی اس کی
 چکیاں صاف ستائی دے رہی تھیں۔

دس ندرین۔ کیا آپ بتائے گا پلیر کہ سامنے جو لائننگنگل ہے۔
 اس کا کس طرف مڑنا ہے۔؟

ندرین نے جلدی سے ہاتھوں کی تفصیلات سے آنکھیں رگڑیں۔

”سوں“ کر کے لاک کھینچی۔ جلدی سے سامنے دیکھا۔ مہاوادیہ نے پر پھر
ڈانٹ پڑ جائے۔ ”لفٹ پر“ وہ رنڈھی ہوئی مرغوب کی آواز میں بولی۔
”I, DONT CARE“۔ شان کو اچانک اُس کی سیٹھ حامد علی کے یہاں
ڈنر والی بے نیازی یاد آگئی۔ اور اس کا دل چاہا کہ وہ زور سے ایک
قہقہہ لگالے۔

بائیں طرف مرنے کے بعد۔ چند مکانات کے سامنے سے گزرتے ہوئے۔ وہ قدر
خالی جگہ پر آگئے۔ پھر آگے لائن میں چند اور مکانات نظر آئے۔
”یہیں ہے ہمارا گھر“ زرین سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔
وہ قریب پہنچ گیا۔ یہ چھوٹے چھوٹے سے چار مکان تھے۔ ”یہ ہے۔“
شان پہلے مکان کے دروازے کے پاس جا کر رُک گیا۔
”ہنیں۔ آگے“ وہ سر آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔
اور ’زوں‘ کر کے وہ آخری مکان پر آگیا۔

”بچھے“ وہ جلدی سے بولی۔ تیسرے نمبر والا مکان اس کا تھا۔
”بچھے ہی سے تو آرہا ہے“ اٹا گیر لگاتے ہوئے وہ اچانک رخ
اُس کی طرف کر کے تیزی سے بولا۔

اور وہ بوکھلا کر بچھے بہٹ گئی۔ ساتھ ہی سر پھر گھٹنوں پر چلا گیا۔
”لو بچھے آگیا“ اُس کے ررنے کا ارادہ بھاتپتے ہوئے مذاق چھوڑ چھاڑ
وہ نمبر دو مکان پر آتے ہوئے پھر نرمی سے بولا۔

بھگی آنکھیں لئے اس نے سامنے سے ہی دیکھا۔ یہ دوسرا مکان تھا

اُسے تیسرے پر اترنا تھا۔ مگر اب اس میں مزید آگے کہنے کی ہمت نہیں تھی۔
 ”یہ پاس والا گھر ہے۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔“ وہ اٹھنے لگی۔
 ”آپ تشریف رکھئے۔ ہم آپ کو چھوڑ آتے ہیں۔“ اچانک ناصر بولی اٹھا۔
 اور شان نے جیب تیسرے مکان کے دروازے کی طرف بڑھا دی۔
 زرین کی اتنی دروازہ داگئے پریشان سی کھڑی اندر سے ہی جیب کو
 کھڑی ہوتے دیکھ رہی تھیں۔

”کہاں رہ گئی تھیں زرین بیٹے۔“ شام کے بڑھتے سایوں میں اُسے
 غیر متوقع جیسے اترتے دیکھ کر اُن کا دل دھک سے رہ گیا۔
 ناصر تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے زرین کے ساتھ ساتھ
 ہی اُن کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ہر سواندھیرا چھا گیا تھا۔ مکان کے
 دائیں بائیں ایک دوسرے سے بالکل جڑے ہوئے چند مکان اور بھی تھے۔
 جوان لڑکی کا ایسے وقت کسی اجنبی گاڑی سے اُتار گھر کے اندر گھسنا۔ ماں
 کی پوچھ گچھ۔ پریشانی۔ شکی دنیا کے لئے کوئی نہ کوئی موضوع ہبیا کرنے کو کافی تھا
 اور کچھ معلوم نہیں۔ کیا بات تھی۔

کچھ دیر قبل موٹر بائیک کا واقعہ۔ زرین کی پریشانی۔ اُس پر
 عجیب سا اثر تھا اس واقعہ کا۔ زرین کی پریشانی جیسے اس کے دل
 کو جھنجھوڑے جا رہی تھی۔

”یہ۔ کون ہے۔؟“ وہ ناصر کو قریب آتے دیکھ کر مزید بولیں۔
 ”یہ۔۔۔ اتنی یہ۔۔۔“

اور اُس پورے واقعہ کے بعد۔ اب وہ ماں کی ہمدردی
پاکر پھر رو پڑی۔

”میرا نام ناصر ہے۔ بہن ناحق گھبرا گئی ہیں۔ ایسی کوئی بات
نہیں ہوئی۔۔۔۔“

ماں کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

”اندر چلو۔ اکھنیں بھی شاید دنیا کا خوف کھا۔ آہستہ سے زرین
سے مخاطب ہوئیں۔ تم بھی آؤ بیٹیا۔ اُنہوں نے اُسے بھی کہا۔ شاید پوری
بات سن کر اپنی تسلی کرنا چاہتی تھیں۔

اور شان کچھ لے چین سا۔ اندھیرے میں جیب میں بیٹھا اُس کا
انتظار کرتا رہا۔

مگر جلد ہی اُسے ناصر لمحے لمحے ڈک بھرتا آتا دکھائی دیا۔
اُس کے پیچھے ہی۔ شان نے خاموشی سے جیب اسٹارٹ کر دی۔

رات کا کھانا انھوں نے کمرے میں ہی منگوالیا تھا۔ دونوں کھانے
 میں مصروف تھے۔ مگر خلاف معمول دونوں ہی چپ چاپ تھے۔
 ”ناصر کیا بات ہے۔ چپ چپ سا ہے“ شان نے ابتدا کی۔
 ”کوئی خاص بات نہیں۔ بس پتہ نہیں۔ اس سارے واقعے نے کیوں
 پریشان کر دیا۔“ ناصر جیسے زبردستی مسکرایا۔
 ”ہوتا رہتا ہے۔ کوئی اتنا اہم بات نہیں ہے“ شان اس کا دھیان
 بٹانے کو لا پرواہی سے بولا۔
 ”پتہ نہیں کیوں اُس لڑکی کو پریشان دیکھ کر میں بھی پریشان
 ہو گیا۔“ ناصر مزید بولا۔
 اور شان کے پُرکشش چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔
 ”تو تم گھر تک ساتھ گیا تھا۔ شان سپاٹ سے لہجے میں بولا۔
 ”اسی لمحے تو ساتھ گیا تھا۔ ناصر نے کہا۔

”ہوں۔“ شان نے ہنکا مارا بھرا۔

”ہمارے معاشرے میں لڑکی۔“ ناصر جیسے اپنے آپ سے مخاطب تھا۔
 ”بجاری کچھ بھی تو نہیں۔ دو قدم بھائی کے ساتھ بھی چلے تو دور سے
 دیکھنے والے غلط اندازے لگانا شروع کر دیں۔“

”وہ تو ہے۔“ شان بڑے ٹھہرے انداز میں بولا۔

”بجاری کی ماں پریشان ہو گئی تھی۔ اُسے ہمارے ساتھ دیکھ کر۔“

”ہمارے ساتھ نہیں۔ تمہارے ساتھ۔“ شان کا لہجہ اجنبی

اجنبی سا تھا۔

”کیا مطلب۔؟“ ناصر نے وضاحت چاہی۔

”مطلب یہ کہ۔ میں۔ میں تمہارے جیسا پریشان نہیں ہوا۔ مجھ کو
 کوئی INTEREST نہیں ہے۔ اس پورے معاملے سے۔“ شان کے لہجہ
 میں بے بسی اور طنز کی ملی جلی کیفیت تھی۔

ناصر۔ کچھ تیراں سا اُسے دیکھنے لگا۔

پھر۔ آہستہ سے مسکرا دیا۔

”تم تو اس بے چاری کو ڈانٹتے ہی جا رہے تھے۔“ وہ سن کر بولا۔

جیسے ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کر رہا ہو۔

”ہاں۔“ شان کو اچانک جیسے اپنے لب و لہجہ کا احساس ہو گیا۔

گلاس میں سے پانی پیتے پیتے وہ خوش گواری سے کہنے لگا۔ تم ڈانٹنے

کا کہتا ہے۔ میں تو اُسے لگا بھی آتا۔ دو تین۔ اگر وہ ٹپ ٹپ آنسو

بہانا شروع نہ کر دیتا تو۔

”ویسے ایک بات میں نے نوٹ کی تھی۔“ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے شان کو بٹاش دیکھ کر وہ بھی بٹاش سے بولنے لگا۔
 ”قصور دونوں لڑکیوں کا تھا۔ مگر تم زین کو ہی ڈانٹے جا رہے تھے۔“
 ”تم کو کیا معلوم۔ اُس کا بہت اونچا دھار غبے۔ اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہے۔ آسمانوں پر رہتا ہے محترمہ۔“ چچ میں لئے جیلی کے لال لال شفاف رنگ کو گھورتے ہوئے شان مسکرا مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

کچھ دیر قبل کے تاریک سائے چہرے پر سے معدوم ہو گئے تھے۔
 ”I SEE۔“ جیھی ڈانٹے وقت بھی اُسے زمین پر اتر آنے کو کہہ رہے تھے۔ ”ناصر ہنستے ہوئے بولا۔“ ویسے میری ایک نصیحت مانو۔ غصہ ہو تو اردو کبھی مت بولا کرو۔ سارا IMPRESSION خراب پڑا ہو گا۔“

شان کو احساس تھا۔ غصہ کی حالت میں وہ کبھی اس زبان سے انصاف نہیں کر پاتا تھا۔

کھپانا سا وہ اپنی گردن سہلانے لگا۔
 ”چلو۔ آئندہ خیال رکھنا۔“ ناصر نا صحانہ انداز میں بولا۔
 تو شان خوبصورتی سے ہنس دیا۔
 ”اس کو میں نے پہلے بھی دیکھا ہے۔“

”کہاں۔؟“ ناصر نے پوچھا۔

”سیٹھ حامد علی کے گھر ڈنر۔ تمہارا آنے سے ایک روز پہلے۔“

”یہ وہاں کیا کر رہی تھی؟“ ناصر کو حیرانگی سی ہوئی۔ ایک عام بوسیدہ سے کوارٹر میں۔ ایک اکیلی ماں کا ساتھ۔ اتنی دور۔ اتنے بڑے آدمی کے یہاں ڈنر پر۔؟

”I DON'T KNOW۔ لیکن یہ ہے وہی۔“

”جی بھی تمہیں اُس دن میوزیم میں بھی دیکھ رہی تھی ناصر کو اچانک یاد آیا۔ اُس نے واقعی زمین کو نظریں اٹھا کر شان کی طرف دیکھتے دیکھا تھا۔

”شاید؟“ شان نے جواب دیا۔

”تو یوں کہو پُرانی عادات ہے۔“ ناصر زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

”پکا دشمنی ہے۔“ جیلی کا پیالہ میز پر رکھتے ہوئے شان

اٹھ کھڑا ہوا۔

”دوستی کا کوئی امکان نہیں۔؟“ ناصر اچانک اپنا پاؤں اُس کے

پاؤں کے آگے رکھ کر اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

شان آگے بڑھتے ہوئے ٹک گیا۔

ایک نظر اُس نے بھی ناصر کی آنکھوں میں جھانکا۔

اور پھر اُس کی بے حد خوبصورت آنکھیں شرارت سے چمک اٹھیں۔

بول کے گوشے مسکراہٹ کے بار سے پھڑپھڑا اٹھے۔

”سوں“ انگلی سے اپنی ناک چھوتے ہوئے۔ ”سوں“ کر کے
شان نے ناک اور پر کھینچی۔

اور ناصر کو روتی بسورتی ”سوں“ کر کے ناک اور پر کھینچتی ندین
یاد آگئی۔ ناصر۔ اس دوران پہلی بار جانتا رہا کہ لگا اٹھا۔
”یعنی امکان ہے۔۔۔؟“

”سوں“ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ایک بار پھر زرین
کی نقل اتار لی۔

”نانا کر کے پیار تمہیں سے کر بیٹھے“ ناصر کرسی سے اٹھ کر گنگنا تا ہوا
باتھ روم چل دیا۔

اور شان جلتی لکڑیوں کے آگے فیٹل پیس سے پشت ٹکائے
کھڑا سوچوں میں گم تھا۔

گا ہے گا ہے خوبصورت آنکھیں چمک اٹھتیں۔ دلفریب مکر اسٹ
بوں پر کھیل جاتی۔

کل انہوں نے واپس چلے جانا تھا۔ آج آخری دن تھا۔ یہاں۔
 دن کے گیارہ بجنے والے تھے۔ دو ایک ضروری کام کرنے کو تھے۔ مگر
 جیب میں کچھ گڑ بڑ تھی۔ ایک تو بریک آئیل ختم معلوم ہو رہی تھی۔ تھوڑا
 اور بھی کام نکل آیا تھا اس میں۔ یہ سب ٹھیک کر دانا تھا۔ درجہ
 کل کا پرنسپل راستہ کا ٹنا مشکل ہو جاتا۔ لہذا جیب اس وقت اسی
 سلسلے میں ہوٹل کے منیجر کی تحویل میں تھی۔ اور۔

شان اور نامزد دونوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہوٹل کے کمرے
 میں آگ تاپ رہے تھے۔

دفعۃً ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ شان نے اٹھ کر ریسو کیا۔

”یس۔“ دریشان اسپیکنگ: ”وہ حبیب عادت بردہ مار لہجے میں بولا۔

”میں۔۔۔ میں۔“ زرین بول رہی ہوں۔ ”گھبرائی سی۔“ سہی سی۔

آواز آئی۔ اور۔ شان نے اپنی ہنسی بمشکل روک لی۔

”جی۔ اُس نے اطمینان سے کہا۔

”وہ۔ ناصر صاحب۔ ہوں گے؟“ حواس اب بھی مجتمع نہ ہو سکے تھے۔ اور شان کی آنکھوں میں چھائی شوخی معدوم ہو گئی۔

پُرکشش چہرے پر تاریک سایوں کا جال بچھ گیا۔

”یس۔ بات کریں۔“ اُس کا لہجہ ڈوبا ڈوبا سا تھا۔ اور پھر اُس

نے ریسور ناصر کو پکڑا دیا۔

”جی بول رہا ہوں۔“ ناصر بولا۔ ”ہمیں ہم لوگ کل جا رہے ہیں۔

کیوں؟۔ وہ۔ کیا ہوا انھیں؟ اچھا۔ مجھے آنے کو کہا ہے؟۔ نہیں۔

ہمیں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں آجاتا ہوں۔ اچھا۔ خدا حافظ۔“

ناصر نے ریسور رکھ دیا۔

وہ کچھ پریشان سا نظر آ رہا تھا۔ زرین نے فون کیا تھا۔ رات

اُس کی اتنی کی طبیعت خراب تھی۔ اس وقت اُسے بلانے کو زرین سے

کہا تھا۔ کچھ عجیب سی سچویشن ہو گئی تھی۔ ویسے بلایا ہوتا تو مال بھی جلتا

مگر بیماری کی بات تھی۔ اور پھر اُسے ہی بلایا تھا۔

”چلے جاؤ۔ سوچ کیا رہے ہو۔؟“ کھڑکی کے پاس کھڑا شان

اجنبی سے لہجے میں بولا۔

”زرین کی اتنی کی طبیعت رات سے خراب ہے۔ زرین کہتی تھی۔

انکھوں نے مجھے بلایا ہے۔“

”وہی تو کہتا ہوں۔ چلے جاؤ۔“ چہرے پر اب بھی گہری سنجیدگی کی چھاپ

تھی۔ لہجہ اب بھی بالکل اجنبی تھا۔

”تم بھی چلو۔“ ناصر نے مشورہ دیا۔

”NO۔“ ہرنٹ بھینچتے ہوئے اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”اکیلے جاتے ہوئے کچھ اچھا نہیں لگتا۔“ ناصر اُلجھ سا گیا تھا۔ ”نہ جائے

ماندن نہ پائے رفتن۔“ والی بات ہو رہی تھی۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کل شام بھی تو اکیلا ہی گیا تھا۔ اُس کا لہجہ

سنگینی سی لئے ہوئے تھا۔

آگے بڑھ کر اُس نے روم سروس کے نمبر ڈائل کرتے ہوئے ٹیکسی

کے لئے کہہ دیا۔

ٹیکسی آ رہا ہے۔ تم چلو۔ میں تب تک کچھ ضروری خطوط لکھ لوں گا۔

اب کے اُس کا لہجہ مصالحت آمیز تھا۔

اور پتہ نہیں کیوں۔ چند ثانیہ قبل کے شان کے لہجے سے ناصر

اُلجھ سا اور اب کے COMPROMISING لہجے سے وہ کچھ مطمئن سا

نظر آنے لگا۔

”چلا جاؤں۔؟“ اُس کی پرانی شوخی عود کر آئی۔

”ہاں۔!“ شان نے سادگی سے کہا۔

”کوئی پکڑ تو نہیں لے گا۔؟“

”تم پکڑوائی نہ دو۔ تو کوئی نہیں پکڑے گا۔ شان کا لہجہ ذومعنی تھا۔

”وہاں ہے ہی کون۔ جہں کو میں پکڑوائی دوں گا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے

ناصر ڈرائنگ روم میں گھس گیا۔ اور شانِ اقدسِ قدرت سے ڈرائنگ روم کے پہلے پردے کو تکتارہ گیا۔

تبھی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔

”یس۔“ شان وہیں کھڑکی کے پاس ٹیک لگائے لگائے بولا۔
”صاحب۔ ٹیکسی آگئی ہے۔“ اندر آتے ہوئے بیرے نے موڈ بلیق

سے اطلاع دی۔

”اد۔ کے۔“ آرہا ہے۔“

اور بیرا واپس چل دیا۔

”آگیا ہوں۔“ ناصر اچانک ہی ڈرائنگ روم سے نکل کر ٹائی کی گرہ درست کرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

”اے۔“ اُس نے پکارا۔

ناصر رُک کر مڑا۔

”جلدی آنا۔“ اُس نے کہا۔

”اد۔ کے باس۔“ ناصر نے سیلوٹ مارا۔

اور شان دھیرے سے مسکرا دیا۔

کل شام زرین کی اتنی کی تسلی کی خاطر وہ زرین کے ساتھ اُن کے گھر کے اندر چلا گیا تھا۔ جلدی جلدی مختصراً اکھنیں موڑ بایک والا واقعہ سنایا تھا۔

”اس واقعہ کے بعد ہم لوگوں نے ضروری سمجھا کہ بہن کو گھر تک
چھوڑ آئیں گے۔“

”اور بھی کوئی ساتھ ہے بیٹا۔؟“ زرین کی اتنی کے حواس کچھ
درست ہوئے تو انھوں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ میرا ماماں زاد بھائی ہے باہر جیب میں۔“
”یہاں کس جگہ کھڑے ہو۔؟“ انہیں وہ یہاں اجنبی لگا تھا۔
”جی ہوٹل میں۔“ ہوٹل کا نام بتاتے ہوئے ناصر نے کہا تھا۔
”کہاں سے آئے ہو بیٹا۔ تم لوگ۔؟“ اپنا محسن سمجھتے ہوئے یا
کچھ عذرت ہونے کے ناطے تجسس ہونے کے سبب انھوں نے مزید
پوچھ لیا تھا۔

اور۔ پھر ناصر نے انھیں اپنے علاقے کا نام بتا دیا تھا۔
”شاہان احمد میرے ماماں ہیں۔“

”تمہارا کیا نام ہے بیٹے۔!“
”ناصر علی۔“ اُس نے اپنا نام بتایا۔

”باپ کا کیا نام ہے؟“

ناصر کو دل ہی دل میں ہنسی آئی تھی۔ اتنی جلدی اور اتنے تھوڑے
سے وقت میں وہ اس کا پورا انٹرویو لے رہی تھیں۔ بعض عورتوں کی
عادت ہوتی ہے۔ اُس نے سوچا تھا۔

”یا سر علی۔ اچھا اب میں اجازت چاہوں گا۔ خدا حافظ۔“ اور۔

مزید کچھ کہے سننے بنادہ باہر نکل آیا تھا۔

”بیدھے جاننا ہے صاحب۔“ اچانک ٹیکسی ڈرائیور بولا۔ اور اس کی محویت ٹوٹ گئی۔

”ہاں۔ اگلا لائٹ سگنل آئے گا تو لفٹ پر مڑ جاؤ۔“

”اچھا صاحب۔“ ڈرائیور نے کہا۔

آگے جا کر ٹیکسی بائیں جانب مڑ گئی۔ اور پھر جاتے جاتے آخر کار زرین کے گھر کے دروازے پر جا کر رُک گئی۔

اُتر کر اس نے کرایہ ادا کیا۔ اور آگے بڑھتے ہوئے سولے سے دروازہ پتھ پھایا۔

پل بھر میں دروازہ کھلا۔ زرین نمودار ہوئی۔

”آئیے ناھر بھائی۔“ اُس نے کہا۔ ناھر اندر داخل ہوا۔

چھوٹا سا صحن تھا۔ سامنے ہی چھوٹے سے برآمدے کے ایک سرے پر

بادرچی خانہ اور دوسرے سرے پر شاید غسل خانہ تھا۔

”اتنی کمرے میں ہیں۔“ برآمدے میں کھلتے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رہ آگے آگے ہوئی۔

اور ناھر جھجھکتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

انیس بیس سال قبل۔ یہاں سے کوسوں دور چھوٹے سے گاؤں کے
 چھوٹے سے مکان میں۔ میں اور میری بیوہ ماں رہتی تھیں۔ دگاؤں
 والوں کے کپڑے سی سی کر میرا اور اپنا پیٹ پال رہی تھیں۔ میں نے آٹھ چھ
 پڑھ لیں تو اسی اسکول کی ہیڈ ماسٹر نے ہم ماں بیٹی کی بے کسی پر ترس
 کھاتے ہوئے مجھے اسی اسکول میں پرائمری جماعت کو پڑھانے پر رکھ لیا۔
 اوریوں میرا اور میری ماں کا گزر بسر ہونے لگا۔

الیکشن کے دن تھے۔ ہر طرف یا سرٹلی کے نام کا پول بالا تھا خاندانی
 امارت اور شرافت کی دھوم تھی۔ اور پھر۔
 ایک دن معلوم ہوا۔ وہ ہمارے گاؤں آئیں گے۔ اسکول کا بھی معائنہ
 کریں گے۔ وہ اسکول آئے، معائنہ کیا۔ چلے گئے۔ مگر جانے انھیں ایسی کونسی
 چیز بھاگئی کہ ہفتہ پھر بعد ہی وہ ہماری کٹیا پر بھی تشریف لے آئے ماں
 چونکی۔ ہم غریب ضرور تھے۔ مگر عزت والے تھے۔ جو ان بیٹی کا ساتھ تھا۔ ماں کا

دل دھڑک اٹھا۔ چائے پانی سے تواضع تو کی۔ مگر ماتھے پر بل پڑ چکے تھے۔
 یاسر علی تھوڑی دیر رہ کر ہم لوگوں کا حال احوال پوچھنے کے بعد چلے گئے۔ ماں کا
 خیال تھا کہ اُن کا رویہ یا سر علی کا حوصلہ پست کرنے کو کافی تھا۔
 مگر یہ اُن کا خیالِ خام تھا۔

وہ کوئی اثر لے بغیر دوبارہ آئے۔ سہ بارہ آئے۔ اور اب تو مجھ سے بھی اُن
 کی آمد کا راز چھپ نہ سکا۔ وہ مجھے پسند کرنے لگے تھے۔
 ”بیٹا ہم غریب ضرور ہیں، مگر عزت والے ہیں۔ ہمارا یوں آنا جانا نہیں
 گاؤں میں ذلیل کر دے گا۔“ ماں نے آخر کہہ ہی دیا۔
 اور۔ یاسر علی اپنی چوری پکڑتے دیکھ کر ہم سے گئے۔
 ”ہم تمہاری قدر کرتے ہیں مگر غریب اور امیر کا کبھی میل نہیں ہو سکا بیٹے!
 تم آئندہ مت آنا۔“ ماں غریب ضرور تھیں۔ مگر سخت طبیعت کی مالک تھیں۔
 صاف منہ پر کہہ دیا۔ یاسر علی مڑ جھا کر رہ گئے۔
 کوئی دو ہفتہ بعد پھر آ گئے۔

”تم سکینہ میں دلچسپی لیتے ہو۔ میں سمجھتی ہوں۔ مگر ہمارا مذہب ہمارا معاشرہ
 صرف دلچسپی لینے کا قائل نہیں ہے۔ اگر تم واقعی سنجیدہ ہو تو سکینہ سے نکاح
 کر لو۔ ورنہ آئندہ کبھی اس گھر کا رخ نہ کرنا۔“ گاؤں میں گھر بکھر سونے لگی
 تھی۔ اور ماں مزید برداشت نہ کر پائیں تھیں۔

چند دن اور گزر گئے۔ اور پھر۔ ماں کے خلاف توقع یاسر علی نے
 اپنے ایک دوست ماجد صاحب اور میرے رشتے کے چچا کی موجودگی میں مجھ سے

نکاح پڑھالیا۔ دو دن وہاں رہے اور پھر اپنی زمیندار کی سلسلے میں اپنے گاؤں واپس چلے گئے۔ ہفتہ بھر بعد پھر آئے۔ دو دن رہے۔ جب جانے لگے تو ماں نے مجھے ساتھ لے جانے کو کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ٹال گئے۔ اگلی بار لے جانے کو کہہ کر چل دیئے۔

پھر یوں ہی ہوتا رہا۔ ہفتہ بعد آنے کے بجائے مہینہ بعد آنے لگے۔ اصرار مجھے ساتھ لے جانے پر بڑھتا رہا۔ اب بجائے سر جھکا کر ٹوڈ بھڑکے بات سننے اور کہنے کے جھجھلانے لگے۔ اور پھر تین تین چار چار ماہ گزر جاتے ان کے آنے میں۔

زرین کی پیدائش میں دو ماہ باقی تھے۔ ماں پریشان تھیں۔ یا سر علی کے کہنے پر میں نے اسکول کی ملازمت بھی چھوڑ دی تھی۔ پریشانی میں دن گزر رہے تھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر ہو کیا۔ خود اپنی مرضی سے تو نکاح کیا تھا۔

پھر ایک دن ہیڈ مٹریس ہمارے یہاں آئیں۔ میری حالت زار کا پتہ تھا تو صرف اُکھیں۔ اور اکھوں نے ہی یہ راز افشا کیا۔ کہ یا سر علی تو پہلے سے شادی شدہ ہیں۔ اپنی خالہ زادی سے شادی ہوئے چند برس ہوئے ہیں۔ پانچ چھ سال کا ایک بیٹا بھی ہے۔ ہم لوگوں پر قیامت ٹوٹی۔ نکاح سے قبل جب ماں نے پوچھا تھا کہ ان کی کہیں سنگنی وغیرہ تو نہیں ہوئی تو صاف انکار کر گئے تھے۔ ماں تو یہ کسی طور نہ چاہتی تھیں کہ پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے اپنی بیٹی دے کر اُس پر ظلم کریں یا پھر اپنی بیٹی کی زندگی آگ میں جھونکیں۔

یا سر علی آئے تو اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ پہلی شادی ہوئے سات سال

سوچے تھے۔ بیٹا ناہر علی چہر سال کا تھا۔ ہمیں بتایا اس لئے نہیں تھا کہ بقول
 ان کے ماں تہذیب و تمدن کی تھیں۔ حقیقت معلوم ہو جانے پر یقیناً میرا رشتہ نہ دسے۔
 پھر میں نے۔ ماں نے دونوں نے کہا۔ مجھے ساتھ لے چلیں۔ نوکرائی
 کران کی بیوی کی خدمت کروں گی کہ میری ہی وجہ سے ان پر زیادتی
 ہوئی تھی۔ پھر ماں کی زندگی کا بھی کوئی بھروسہ نہیں تھا۔
 مگر بقول ان کے وہ میری شکل بھی نہیں دکھانا چاہتے تھے اپنی بیوی
 اور یہ درست بھی تھا۔

دن بہر حال گزرنے لگے۔ اب معلوم ہوا کہ وہ مجھے کیوں ساتھ لے
 جانے سے کتر رہے تھے۔

زرین پیدا ہوئی۔ یا سر علی کو اطلاع دینا چاہی بھی تو نہ دے سکے۔
 باوجود اصرار کے کسی بھی قسم کا کوئی پتہ نہیں دیا تھا۔ پہلے تو شک و شبہوں
 کا ماں بیٹی پڑ جاتی تھیں۔ اب کچھ ڈھارس بندھی کہ گھر میں پہلی بیوی
 موجودگی کی وجہ سے ایسا کہہ رہے۔

اب کے آئے تو زرین چار ماہ کی تھی۔ سوچا تھا کہ دیکھ کر خوش
 ہوں گے۔ مگر شکل تک دیکھنی گوارا نہ کی۔ گھنٹہ بھر کو آئے۔ ماں نے بیٹی دیکھنے
 کہا۔ طنز سے مسکرائے۔ اور برہم برہم چل دیے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا
 تھا کہ کس تصور کی پاداش میں یہ صلہ مل رہا تھا۔

دوسری شادی۔ بیٹی کی پیدائش۔ سب راز میں تھا سدا زواں تھا
 رف ماجد صاحب۔ یا سر علی نے کسی کے کان میں کھنک تک نہ پڑے درگاہ

یوں بھی اُن کا علاقہ بہت دور تھا۔ ہم اس گمنام سی جگہ میں پڑے تھے۔ کسی کا آنا جانا ہوتا نہیں تھا۔ اب پتہ چلا کہ اسکول جانے سے بھی اسی لئے روکا گیا تھا اور پھر ہمیں بھی سختی سے منع کیا گیا تھا۔ کہ یوں جو مجھے اور ذرین کو تھوڑا بہت حق حاصل ہے وہ بھی جاتا رہے گا۔

یا سر علی شروع شروع میں تو فراخ دلی سے خرچ دے جاتے تھے۔ بعد میں یہ بھی کم پڑتا گیا۔ اور پھر اب تو ان کا آنا بھی برائے نام ہو کر رہ گیا تھا۔ خرچ ظاہر ان کے آنے کے بعد ہی ملتا۔ ماہوار خرچ بھیجنے والوں نے کبھی گوارا نہ کیا تھا۔ جوں توں کر کے دن گزر رہے تھے۔ یا سر علی کے پیارا اور توجہ کا یوں سوڑے کے اُبال کی طرح بیٹھ جانا اب کوئی مجھ نہ رہا تھا گھر میں بیوی تھی، بچی تھا۔ مگر رنگین طبع ہونے کے باعث ادھر ادھر نو گھنٹے پھر نا اُن کی غارت گئی۔ مجھ سے نکاح۔ ماں کی شروع کی تند خوئی۔ بکاؤں والوں کی کھسکھس اور پھر قسمت کا لکھا تھا۔ اور اب یوں خبر نہ لینا۔ نہ آنا بے رُخی برتنا۔ یہ بھی اُن کی طبیعت کا خاصہ تھا۔

وہ تو پھول پھول سو گھنٹے کے عادی تھے۔ یوں مستقل کسی ایک پھول ہی منڈا ہوتا تو گھر میں ہی اپنی اتنی اچھی بیوی پر قناعت نہ کر لیتے۔ قسمت کے لکھے پر ہم ماں بیٹی شاکر بھی ہو جاتیں۔ اگر زندگی کا کوئی نہ تو اثر چل پڑتا تو۔ مگر یہاں تو نہ خود آتے تھے، نہ خبر دینے دیتے تھے۔ خرچہ بھی اب بڑھ گیا تھا، ذرین کی پیدائش سے۔ میری تنخواہ بھی نہ رہی تھی۔ دے کے ماں کی سلائی تھی، جس پر ہم لوگ پل رہے تھے۔ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ سب کیا دھرا پنا تھا۔

پھر۔ ایک دن بہت مجبور ہو کر میں نے ڈرتے ڈرتے ماجد صاحب کو خط لکھا کہ کوئی اور چارہ ہی نہ تھا۔ وہ شریف اور پھلے آدنی ہیں۔ آئے ہماری حالتِ ^{نار} دیکھی اور واپس جا کر یاسر علی کو سمجھانے کا وعدہ کر گئے۔
 یاسر علی آ تو گئے۔ مگر مجسم عتاب بن کر کہ میں نے ماجد صاحب کو بلایا کیوں، اپنی حالت کیوں بتائی۔

بعد میں بہر حال۔ قدرے نرم پڑ گئے۔
 زرین کو دیکھا۔ بولے۔ "میری کاپی ہے۔" اور مدتوں بعد یہ جملہ میرے کانوں میں رس گھول گیا۔ کچھ رقم بھی دے گئے۔ اور خلافِ توقع مجھے تسلی دیتے ہوئے بولے۔

"اب کے کچھ نہ کچھ بند و بست ضرور کر دوں گا، تم دونوں کو یہاں سے لے جانے کا۔" اور جلدی دوبارہ آنے کو کہہ کر چلے گئے۔
 "میری کاپی ہے۔" چند دن بعد ہی ننھی سی زرین کے کپڑے بدلانے ہوئے میں بڑبڑائی۔

زرین کلکاری مارتے ہوئے سنیں پڑی۔ شاید نادانستگی میں گدگدی ہو گئی تھی۔ "یاسر کی کاپی" میں نے اُس کے گال کو چوم لیا۔
 "کیا کہتی ہو۔ مس شکیلہ۔؟" صحن میں سے ماں کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ پتہ نہیں کیوں میں زرین کو لئے لئے گھبرا کر باہر نکل آئی۔
 ماں سکتے کی حالت میں ہیڈسٹریس کو گھور رہی تھیں۔
 "کیا ہوا مس۔؟" میں پاس پہنچی۔

"انہوں نے اخبار دکھایا۔ یا سر علی کی تصویر تھی۔ ایک دن قبل گاڑی کا
 ایکسڈنٹ ہوا تھا۔۔۔۔" سکیٹھ بیگم چیخ چیخ کر رونے لگیں۔
 جیسے۔ اٹھارہ انیس سال قبل نہیں آج ہی ان کا ایکسڈنٹ ہوا ہو۔
 ناصر بکا بکا انہیں دیکھ رہا تھا۔
 زرین کبھی کی چائے لا کر ناصر کے آگے منر پر رکھنے کے بعد ماں کے
 سر ہانے جا کھڑی ہوئی تھی۔
 "اور یوں میری دکھی زندگی ایک بار پھر خوشیوں سے ہمکنار ہوتے ہوتے
 ہمیشہ کے لئے دیران ہو گئی۔" اچھی طرح رو لینے کے بعد وہ پھر بولیں۔
 ناصر اب بھی گم سم انہیں رہا تھا۔
 اُس کی ماں کی سوکن۔ اُس کی ماں جس نے اُسے جنم دیا تھا۔ اُس پر
 زندگی کا ہر ٹکڑا بچھا دیا تھا۔ کتنا بڑا ظلم ہوا تھا اُن پر۔ باپ کی رنگینی طبع کے
 قصے اُسے معلوم تھے۔ کلی کلی منڈلاتے پھرنا اُن کی عادت تھی۔ مگر کیا اتنا کافی
 نہیں تھا؟ دوسرا نکاح۔ دوسرے نفطوں میں کیا ایک مستقل رقیب لانا ضروری
 تھا؟ ماں کی روح پہلے کیا کم دکھوں تلے دبی تھی۔؟
 نفرت کی ایک شدید لہر اُس کے سراپا میں سرایت کر گئی۔ اُس نے
 غور سے اپنی ماں کی حریف کو دیکھا۔
 اڑنیس انتالیس کا سن۔ زردی مائل سفید سے چہرے پر وقت
 سے پہلے گہرائی جھریاں۔ پرانی سی شاال سے جھلکتے سفیدی مائل بال۔ لامتناہی
 دکھ سپے اندر کو دھنسی غلامی آنکھیں۔ ماتھے پر مستقل نمازی پن کا مقدس
 نشان۔!

” ماں بوڑھی تھیں۔ اکلوتی اولاد کے مستقل غم نے زیادہ مہلت نہ دی۔ چھ ماہ کے اندر ہی مالکِ حقیقی سے جا ملیں۔ ہم ماں بیٹی اس بھری دنیا میں اکیلی رہ گئیں۔ ہیڈ مٹر میں بہت رحمدل تھیں۔ مجھے دوبارہ نوکری دلا دی۔ میں زرین کو ساتھ لے کر اسکول جانے لگی۔ مگر دنیا بہت بُری ہے بیٹا۔ اکیلی عورت کو کسی حال میں جینے نہیں دیتی۔ گاؤں کا ایک اوباش آدمی پہلے تو اسکول آتے جاتے راستے میں تنگ کرنے لگا۔ پھر ایک دن گھرا گیا۔ مجھ سے شادی کا تقاضا کرنے لگا۔ اس کی نظر ہمارے لڑے پھوٹے مکان۔ میری تنخواہ کے چند روپوں اور اُس کے خیال میں یا سرحد دولت میرے لئے چھوڑ کر گئے تھے، اُس پر بھتی۔ اُس دن تو ڈانٹ ڈپٹ کر چلتا گیا۔ مگر ڈھیٹ تھا۔ دوبارہ آیا۔ اب کے اُس کی نیت کچھ ٹھیک نہ لگتی تھی۔ میں زرین کو لے کر بہانے سے کھڑکی کے راستے پاس والے مکان میں چلی گئی۔ وہ رات بھی وہیں رہی۔ اور اگلے دن زرین کو ساتھ لے کر چند ضروری چیزیں سمیٹے ہیڈ مٹر میں کے یہاں چلی گئی۔ اکیس سارا واقعہ سنایا۔ وہ بختہ عمر کی عورت تھیں۔ دنیا دیکھے تھیں۔

اور پھر۔ اکیس کے شورے پر میں نے اپنا مکان بیچا اور زرین کو لے کر چپ چاپ کوسوں دور اس شہر میں اُن کی چھوٹی بہن کے پاس، جو اب بھی یہاں پبلک اسکول کی پرنسپل ہیں چلی آئی۔ مجھ پر ان لوگوں کے بڑے احسان ہیں۔ پرنسپل نے مجھے یہاں بچوں کو اسلامیات پڑھانے پر اسکول میں رکھ لیا۔ اور اسکول کے ساتھ لگے اس کوارٹر میں جس میں پہلے سے ایک استانی رہتی تھی۔ جگہ دلا دی۔ مکان بچنے سے جو بونجی ہاتھ لگی تھی، وہ اکیس کے شورے سے

بنک میں رکھوائی۔ پچاس روپے ماہوار اُس کا آجاتا تھا۔ دوسروں کے سکول
 سے مل جاتے تھے۔ ساتھ ہی رات کو دیر تک بیٹھ کر سلائی کرتی تھی۔ سو ڈیڑھ
 سو اُس کے بن جاتے تھے۔ ادویوں میرا در زین کا گزرا دقات چل نکلا۔
 وقت گزرتا رہا۔ گاؤں کی ہیڈ مٹریس ہمارا حال احوال لیتی رہیں۔
 اُن کی چھوٹی بہن، بہنوں سے بڑھ کر جہربان ہیں۔ زین چار سال کی
 ہو گئی تو انھوں نے اُسے اسکول میں داخلے دے دیا۔ چار پانچ سال
 رہ کر میرے ساتھ اس کو ارٹری میں رہنے والی اُستاد کی تبدیلی دوسرے شہر
 ہو گئی تو پرنسپل نے ازراہ ہمدردی ہمیں اس کو ارٹری میں رکھ لیا۔
 نئی جگہ آ کر ایک تو گاؤں والوں کی نظروں سے بچ گئی۔ دوسرے
 ماحول بھی کچھ تبدیل ہو گیا۔ اور پھر سب سے بڑی بات جس کی ہر وقت
 فکر رہتی تھی کہ زین کو کوئی باپ سے متعلق باتیں بتا کر بدول نہ کرے
 یاد بھی نہ کرے وہ فکر بھی جاتی رہی۔ یوں زندگی ایک مستقل ڈگر پر آ گئی۔
 ماجد صاحب کا خدا بھلا کرے سال دو سال بعد خیریت پوچھ جاتے
 ہیں۔ اب تو ایک زمانہ گزر گیا۔ اُن کے بھی بچے جوان ہیں۔ پچھلے دنوں
 اپنی بیگم اور بیٹی فرزانہ کو بھی ساتھ لائے تھے۔ اصرار کر کے زین کو بھی
 ہفتہ بھر کے لئے ساتھ لے گئے تھے۔ بہت خیال رکھتے ہیں اُن کی بیگم
 تو مقرر تھیں کہ زین اب جوان ہے، اس کی بات اس کے وارثوں سے
 کرنی چاہیے۔ مگر وارث تو خدا ہے۔ میں نے منع کر دیا۔ کیا گڑھے مردے
 اُکھڑنے۔ اور پھر زین میری ساری پونجی ہے۔ مبادا لینے کے دینے پڑ جائیں

وارث اسی کا مطالبہ کر بیٹھیں تو۔؟

نئی فکری لائق ہو گئی تھی۔ بڑی مشکل سے انھیں سمجھایا۔ بہت نیک
 لوگ ہیں۔ کتنے سال گزر گئے۔ یا سر علی کے راز کو راز ہی رکھا ہوا ہے۔ اب تو
 باقاعدہ قرزانہ کی اور زرین کی خط و کتابت بھی ہے۔ وہ بھی بی۔ اے
 کر چکی ہے۔ زرین بھی اب تھرڈ ایئر میں ہے۔ ایف اے کے بعد سے ٹیوشن
 بھی پڑھا رہی ہے۔ بس وقت ہے گزر رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے۔
 ناصر اب بھی انھیں دیکھ رہا تھا۔

ستین چہرے پر قناعت کی روشنی تھی۔ شرافت کا نور تھا۔
 پاکیزگی کا بول بالا تھا۔

اس کے باپ کی مشکوہ۔! اُس نے سوچا۔

خود اُس کے باپ نے اُسے اندھیرے میں رکھ کر اُس سے نکاح پڑھایا
 تھا۔ اُس نے جان بوجھ کر اس کی ماں کو دکھ نہیں دیا تھا۔

اور پھر۔ خود اُس نے کونسا شکہ دیکھا تھا۔

شوہر کی بے رخی۔ بیوگی۔ پہاڑ سی جوانی۔ بچی کا ساتھ۔

زمانے کے ستم سہتی یہ عورت۔

کتنی بے ضرر۔ کتنی مظلوم۔ کتنی نیک۔ کتنی پاک تھی۔

شوہر کے لاکھوں کی املاک تھی۔ چاہتی تو وادیلہ کرتی۔ اپنا حق

کے کر رہتی۔ شاندار کوٹھی میں رہتی۔ کاریں۔ نوکروں کی ریل پیل ہوتی

اس کے پاس۔ مگر

شہر نے ایک بار منع کیا۔ تو آج تک منہ سے بھاپ تک نہیں نکالی۔
 کتنی میطیع و فرمانبردار تھی۔ کتنی صابر و دُشاکر تھی۔
 ”یہ الیم دیکھو بیٹا“ اٹھوں نے سر ہانے رکھا ایک الیم اٹھا کر اُس کی
 طرف بڑھایا۔

اُس کے گھٹنوں پر رکھا۔ خود ہی صفحے پلٹنے لگیں۔

انیس بیس سال قبل کی ابو کی تصویر۔ یہی کاپی گھر میں بھی
 فریم کی ہوئی رکھی تھی۔

اُسی عمر کی، اُن کی اور زرین کی اتنی کی اکٹھی تصویریں۔

خود ناھر کی پانچ چھ سال کی عمر کی تصویر۔ وہ آج بھی اُس کے
 بیڈ روم میں اس کے بیڈ سائڈ ٹیبل پر فریم کی ہوئی رکھی تھی۔
 اُس کے بچپن کی چند اور تصویریں۔ زرین کے بچپن کی۔ پھر
 جوانی کی کئی اور تصاویر۔

”اور یہ ہمارے نکاح کے کاغذات ہیں“ اٹھوں نے تکیے کے نیچے
 سے کاغذ نکال کر اُسے دکھائے۔

”سیکینہ بیگم۔ عمر اٹھارہ سال..... یا سر علی..... حق ہر.....“
 اُسے پہلی بار جنبش ہوئی۔

کاغذ منہ پر رکھے۔ کرسی سے اٹھا۔

مبہری پر اُن کے قریب بیٹھا اور پھر اُس مقدس ہستی کے قدم چھولے۔
 ”اتنی۔ مجھے ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کا پاس آپ کے چہرے سے

نظر آ رہے ہیں۔ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ میرے سر پر ہاتھ رکھئے۔
 شدت جذبات سے اُس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔ اُس نے اُن کا ہاتھ
 پکڑ کر عقیدت سے اپنی آنکھوں سے لگایا اور پھر اپنے سر پر رکھ لیا۔
 ”میرے بیٹے“ اُنھوں نے اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ”میرے
 یا سر علی کے بیٹے“ وہ پھر بے اختیار رونے لگیں۔

”روئے نہیں اتنی“ اُس نے اُن کی مثال سے اُن آنسو پونچھ لئے۔
 ”اب نہیں ہیں مگر آپ کا بیٹا تو زندہ ہے۔ اور بیٹا جوان ہو۔ تو ماں
 پچھلے دکھ بھول جایا کرتی ہے۔ آج سے آپ کے دکھوں کے دن بیت
 گئے۔ آپ کا بیٹا آپ کے ساتھ ہے۔“
 ”مرد کی آواز۔ اور مجھ بے بس کے گھر میں۔ خدایا تو کتنا ہریانہ ہے۔“
 وہ اُس کا ماتھا چوم کر ایک بار پھر رو دیں۔

اور۔ پھر روتی ہی علی گئیں۔
 نامر بھی کچھ نہیں بولا۔ اچھا تھا رد لیتیں۔ سالوں کا بوجھ
 ہلکا ہو جاتا۔

پھر اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ زرین سرہانے کھڑی بازو میں منہ
 چھپائے ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

وہ اٹھا۔ آہستہ قدم چلتا ہوا اُس کے قریب جا کھڑا ہوا۔
 ”زرین“ اُس نے پکارا۔

وہ روتی ہی گئی۔

”زرین“ ہاتھ بڑھا کر اُس نے اُس کا بازو چہرے سے ہٹالیا۔
ایک پل کو۔ ناصر کو لگا۔ اُس کی اپنی تصویر اس کے سامنے ہے۔
تنی شکل ملتی تھی زرین کی اُس سے۔

وہ اور زیادہ رو دی۔

”نہ رو میری بہن“ اُس نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”بھیا“ وہ بے اختیار اُس سے پٹ گئی۔

”میری بہن“ ناصر کے مضبوط بازو اُس کے گرد محیط ہو گئے۔

اور یہیں اُسے معلوم ہوا۔

وہ کیوں اتنا بے چین تھا۔ بے کل تھا۔ پریشان تھا۔؟ کیوں اُسے

تنا خیال تھا کہ اُسے گھر کے اندر تک چھوڑنے آ رہا تھا۔

پڑوسیوں کی، لوگوں کی۔ اُسے کیوں اتنی فکر نہ تھی۔

اُسے سینے سے لگا کر اُسے محسوس ہوا۔

وہ۔ اُس کا اپنا خون تھی۔ اس لئے۔

”زی۔ جاؤ۔ شاہباش اپنے بھیا کے لئے چائے گرم کر کے لے آؤ۔“
 اتنی کو قدرے سکون ملا تو آنسو پونچھ کر ٹھنڈی چائے کو ہاتھ لگاتے
 ہوئے بولیں۔

”اچھا اتنی۔“ رو دھو کر اب وہ بھی سکون پا چکی تھی۔ ”آپ بیٹھے
 بھیا۔ میں چائے گرم کر کے لاتی ہوں۔“
 ناہر دوبارہ اتنی کی مسہری کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ زی چائے مگ
 لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

”بیٹا۔ میں نے تمہیں کل ہی پہچان لیا تھا۔ تم نے اپنے گاؤں کا نام۔ اپنا
 نام اور پھر یا سر علی کا بھی بتایا تھا۔ تو میں صاف سمجھ گئی۔ تمہارے جانے
 کے بعد ساری رات اسی کشمکش میں گزری۔ کہ تمہیں یہ راز بتاؤں یا نہیں۔
 کبھی سوچتی یہ راز افشاں کر کے سب کچھ نہ کھودوں۔ اپنے اعتماد کو زریں
 کو۔ پھر کبھی سوچتی وقت آ گیا ہے۔ یہی وقت شاید خدا نے مقرر کیا ہے۔“

یہی سوچ سوچ کر نڈھال ہو رہی تھی۔ ہتھاری سوچوں میں، میں زہین کے ساتھ بیٹے موٹر سائیکل والوں کے واقعہ کو بھی بھول بیٹھی تھی۔ اچانک اُس کا خیال آگیا۔ ہتھاری سوچ ایک طرف رہ گئی۔

دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پہلی بار خیال آیا کہ اگر تم لوگ نہ آتے تو کیا ہوتا؟ کہیں وہ لوگ اسے اٹھا کر ہی لے جاتے تو؟ میں تو لٹ جاتی۔ جیتے جی مر جاتی۔ ادہ۔ پروردگار۔! یہ سوچتے ہی مجھے لگا کہ میرا دل بیٹھ رہا ہے۔ بمشکل ہاتھ بڑھا کر پانی کا گلاس تلاش کیا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ گلاس چھوٹ کر فرش پر گرا۔ ٹوٹا تو زہین جاگ گئی۔

”کیا ہوا۔ اتنی۔؟ وہ پوچھنے لگی۔

”بیٹا پانی پلاؤ۔“ میں نے بمشکل کہا۔

”اُس نے بتی جلائی۔ سہارا دیا۔ پانی پلایا۔ معصوم سی جان اتنی گھبرا گئی تھی۔ ایک ماں ہی کا آدم تھا۔ بستر ٹھیک کیا۔“

”بیٹے جسم میں جان نہیں ہے۔“ میرے منہ سے نکلا۔

پریشانی میں بے چاری کبھی ہاتھ سہلائی۔ کبھی پاؤں۔ بھاگ کر گلو کو زینا لائی۔

صبح کے چار ہوئے تو کچھ طبیعت سنبھلی۔

”بیٹا۔ کیا بتاؤں جو ان بیٹی کا ساتھ ہے۔ کالج جاتی ہے تو بھی جان اٹکی رہتی ہے۔ دلہنسی کا وقت ہوتا ہے تو دروازے سے کان لگائے کھڑی رہتی ہوں۔ رات کو پتہ بھی کھڑا ہے تو دل بیٹھنے لگتا ہے۔ تھک گئی ہوں

بیٹا۔ نہ ڈھال ہو گئی ہوں۔ مرد کے سہارے کے بغیر زندگی کتنی مشکل ہے۔
 میرے بھر سے پوچھو۔ کل شام میری زلی کو کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتی۔؟ بتاؤ
 بیٹا۔ میں کیا کرتی۔؟

اداب۔ وہ ایک بار پھر رو رہی تھیں۔

”اتی۔ اب پلٹر نہیں روئیں۔ اب میں آگیا ہوں۔ میری بہن کو کوئی
 آنکھ اٹھا کر تو دیکھے۔“

”یہی سوچ کر صبح ہوتے ہوتے میں نے فیصلہ کر لیا کہ پہلے نہ سہی
 اب تو ضرور تمہیں آگاہ کر دوں گی۔ کہہ دوں گی۔ زرین کو سنبھالنا اب
 مجھ اکیلی کے بس میں نہیں ہے۔ سوچا اپنی ماں سے نہ سہی باپ کا تو
 بیٹا ہے۔ بھائی تو ہے۔“

”اتی۔ آئندہ آپ یہ لمبی چوڑی بات نہیں کہیں گی۔ آپ اب تو کی
 سوری ہیں اور میں اور زرین آپ کے بچے۔ بات ختم۔ اور اب آپ
 ایک آنسو بھی اور نہیں بہائیں گی۔“ زرین کو چائے لئے اندر آتے دیکھ کر
 وہ مسکرا دیا۔ ”آپ ایک عدد جوان بیٹے۔ اور ایک عدد جوان بیٹی کی ماں
 ہیں۔ ناشکری کرنا گناہ ہے۔ بناؤ چائے۔ شاباش۔ آخر میں وہ
 بشارت سے زرین سے مخاطب ہوا۔

”ہاں بیٹا۔ توبہ کرتی ہوں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔“ اتی نے
 آنسو پونچھ لئے۔

زلی نے چائے بنا کر ماں کو پیالی پکڑائی۔ پھر ناصر کو دی۔

”تم نہیں پیو گی؟“ اُس نے زرین کی طرف دیکھا۔

”عادت ہی نہیں ڈلوائی“ اتنی مسکرا کر بولیں۔

”گڈ۔“ ناصر چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ذی آرام سے جا کر

ناصر کی کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی۔

”سجیکشن کون کون سے ہیں۔؟“

”انگلش لٹریچر۔ جیا گریفی۔“

”کچھ آتا جاتا بھی ہے یا ویسے ہی آسمانوں پر رہتی ہو؟“ جانے کیوں

اُسے اچانک ہی شان کے اُس کے متعلق کہے الفاظ یاد آ گئے۔

”کیا۔؟“ اُس کے لب و لہجے پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”کچھ نہیں۔ اچھا بتاؤ کالج کہاں ہے۔؟“

”شہر میں۔“ اُس نے جواب دیا۔

”میں آسکوں گا۔؟“ کپٹی پر کے بال کھجاتے ہوئے وہ شرارت سے بولا۔

”یہ بات ہے۔“ وہ بھی سمجھ گئی۔

”ایک ہی تو کمزوری ہے اپنی۔“ وہ انکسار سے بولا۔

”کیا کمزوری ہے بیٹا۔؟“ بھائی بہن کو باتیں کرتے دیکھ کر خوش

ہوتے ہوئے وہ اچانک گھبرائے ہوئے لہجے میں بولیں۔

اور بہن بھائی دونوں۔ ایک ساتھ تہہ تہہ لگا بیٹھے۔

”اتنی۔ ناصر کھائی اس دن میوزیم میں نسرین کے بالکل قریب ایسے

اُس نے ناصر کے کندھے سے کندھا ملا لیا۔“ بالکل یوں کندھے سے کندھا

جوڑ کر۔ اور پھر یوں : "اُس نے سر ادا سجا کر لیا۔" بے نیازی سے اسٹپچوز
دیکھنے لگے۔ جیسے اکھیں پتہ ہی نہ ہو کہ کندھا کسی لڑکی سے ٹکرائے
کھڑے ہیں۔

اور۔ ناھر کو اچھو لگ گیا۔ جلدی سے پیالی مینر پر رکھ دی۔
"جھوٹی کہیں کی؟" اُس نے اُس کی چوٹی دیکھنے لی۔ "میں کیوں
اُس سے کندھا ٹکرانے لگا۔"

"ایک ہی تو کمزوری ہے آپ کی۔" اپنی چوٹی واپس کھینچتے ہوئے
زی ناھر ہی کے سے ٹکرا لہجے میں کہا۔
ناھر حیف سا سنس دیا۔

زی نے پھر اپنی پوزیشن بغوال لی۔ اور
اتنی دونوں کو دیکھ دیکھ نہال ہو گئیں۔

زرین خوشی خوشی دوپہر کا کھانا تیار کرنے میں لگی تھی۔ ناہر نے بازار سے آکر کھانا جو کھانا تھا۔ آج وہ کتنی خوش تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے؟ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے؟۔ وہ بار بار سوچتی۔
اُسے تو بس اتنا معلوم تھا کہ وہ چند ماہ کی تھی کہ ابڑا یکسٹنٹ میں ختم ہو گئے تھے۔ اور بس۔

پھر۔ وہ تھی اُس کی اتنی تھیں۔ اس کوں تھا اور بس یہ کواریٹر۔
پھر ذرا سی تبدیلی آئی۔

وہ کالج میں داخل ہوئی۔ پچھلے سال ابڑے پرلتے دوست ماجد صاحب مجبہ فیملی کے آئے۔ فرزانہ سے دوستی ہوئی۔ ابھی چند روز قبل یہاں سے کافی دور واقع وہ اُن کے گھر گئی۔ اور بس۔ اور ہاں، اُسے یاد آیا۔ وہ فرزانہ کے ساتھ کسی سیٹھ حامد علی کے یہاں اُن کی بیٹی ٹینا کی امریکہ سے ملنے کے سلسلے میں دئے گئے ڈزپر گئی تھی۔ وہاں ناہر کے کزن ذیشان کو

دیکھا تھا۔ اب تو وہ اُس کا بھی رشتہ دار لگتا تھا۔ ناصر کے ماموں کا
رٹکا تھا۔ تو اس کا بھی کچھ تو ہوا ہی۔

ہو نہ ہو۔ سنا تھا مغزور ہے۔ ہے بھی۔

اور پھر اُسے اچانک موٹر بائیک والے واقعے کے بعد جھگڑا۔
دھار تا ذیشان یاد آ گیا۔

غصہ والا بھی بہت ہے۔ اُس نے مزید سوچا۔ خیر اُسے کیا۔
”بھیا۔“ ناصر کو لے پھندے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ کچن
سے ہی چلی آئی۔ وہ سیدھا اُدھر آ گیا۔

کریٹ رکھا۔ پھر دروازے پر گیا۔ دوسرا کریٹ اندر لایا۔ اور پھر کئی
چھوٹے موٹے لفافے تھے۔

گھی تھا۔ چینی تھی۔ والیں تھیں۔ چائے کے بریکٹ۔ دودھ کے
ڈبے۔ پھل اور نہ جانے کیا کیا تھا۔

اتنی بھی ہادرچی خانے میں آگئیں۔ آنکھوں میں تشکر اور احساسِ مندی
کا احساس لے۔

”بیٹا....“ انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔

”اتنی۔ کچھ کہہ کر مجھ سے میری خوشیاں مت چھینیں۔ ماماؤں جان
نے بہت پیار دیا ہے۔ شان نے کھائی بن کر دکھایا ہے۔ مگر ماں اور
بہن کو تو پہلی بار دیکھا ہے نا۔ اتنی مجھے خوش ہونے دیں کہ میرا بھی ایک
گھر ہے، جس میں بہن کھانا پکاتے ہوئے کھائی کی منتظر ہے۔ جس میں ماں

آنکھیں بچھائے بیٹھی ہے کہ اُس کا بیڑا آنے والا ہے۔ اتنی....
 ”میرے بیٹے مال تیرے صدقے۔ پروردگار تو کتنا ہریان ہے۔
 اللہ۔ میرا تجھ سے وعدہ ہے میں بچھے دکھ سارے قبول جاؤں گی....
 اتنی آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

زرین نے دم پر رکھے چاول کی دگچی اتاری۔ اُس کی جگہ توارکھ
 دیا۔ دوسرے چولہے پر رکھی دگچی کا ڈھکنا ہٹا کر دیکھا کوفتے تیار تھے۔
 دگچی اتار لی۔ اور جلدی جلدی آٹے کے پیڑے بنانے لگی۔
 ناصر اتنی کے ساتھ صحن میں دھوپ میں کرسیوں پر بیٹھا باتوں
 میں مصروف تھا۔

”بیٹا۔ ابھی اپنے گھر مت بتانا۔“ مدتوں سنبھال کر رکھے ہوئے
 زار کو صیے وہ یکدم ہی کھولنے کی اپنے میں ہمت نہیں پا رہی تھیں۔
 ”اچھا اتنی۔ نہیں بتاؤں گا۔ مگر....“
 ”مگر کیا؟“ انھوں نے کہا۔

”یہ بہت بڑی بات ہے۔ بڑی اہم۔ چھپے گی کیسے۔؟ میں تو حیران
 ہوں اب تک یہ چھپی رہی تو کیسے۔؟“

”بس بیٹا۔ کچھ تو جگہوں کی دوری تھی کچھ ہماری غریبی۔ گمنامی کی وجہ
 سے۔ اور پھر اڑتے اڑتے بھٹک پہنچی بھی ہوگی کسی کے کان تک۔ تو ہمتا ہے
 تو کے لئے یوں بھی مشہور تھا کہ رنگین مزاج ہیں۔ نکاح کو افواہ کہہ کر ادھر
 دھر ٹال دیا ہوگا۔ میں نے کون سا کبھی اپنا حق طلب کیا تھا۔ یا پیغام

بھیجے یا وصول کئے تھے اور پھر سب سے بڑی بات اُن کی بہت جلدی
بے وقت کی موت کی تھی۔ اُن کے ساتھ ہی میرا بھی قصہ ختم ہو گیا۔ شاید
پتہ بھی ہو کسی کو۔ لیکن مجھ غریب کی کے پرواہ۔“

”امی ایسا مت کہئے۔ مجھے دکھ ہو رہا ہے۔ جو ہو گیا۔ سو ہو گیا۔ اب تو
آئندہ کا سوچنا چاہئے۔ ہمیں آئندہ کیا کرنا ہے۔؟“

”بیٹا۔ تم ہی کچھ سوچو۔ تم اپنے خاندان کو بہتر سمجھتے ہو۔“

”ہاں اتنی۔ فی الحال میں کچھ نہیں کہوں گا۔ ماموں جان بہت
سخت طبیعت کے اور اصولوں کے پابند انسان ہیں۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا
کہ یہ خیر سن کر اُن کا رد عمل کیا ہو گا۔ کیا پتہ اچھا ہی ہو۔ لیکن بہت
ممکن ہے اس کے برعکس ہو۔ وہ کچھ سوچتے سوچتے آہستہ آہستہ بول
رہا تھا۔ دلچسپ جائیداد کو بے شک بیٹھالا ہوا انھوں نے ہی ہے۔ مگر
آمدن میرے نام ہے۔ مالی لحاظ سے مجھے آپ لوگوں کی کوئی فکر نہیں ہے۔
فکر ہے تو یہی۔ کہ آپ لوگوں کو یکدم ہی یہاں سے لے جا نہیں سکوں گا۔
یوں بات فوراً سامنے آجائے گی۔ اور ماموں جان“

”کیا تمہارے ماموں جان، میں قبول نہیں کریں گے۔؟“ اتنی تشویش
نہرے لہجے میں بولیں۔

”قبول تو آپ کو خدا نے کرا دیا ہے اتنی۔ آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔؟“
وہ بشارت سے بولا۔ مگر اُن کی طبیعت اور طرح کی ہے۔ کبھی لگتا ہے
یہ جھرا نہیں دھلکے کی طرح لگے گی۔ پتہ نہیں کیا رد عمل ہو؟ اتنی آپ

بُرائے منائیں۔ مگر وہ خاندان، خاندانی، اچھے اونچے۔ بس عجیب ہی منطق ہے اُن کی۔ چند ماہ قبل میں نے ایک جگہ منگنی کرنی چاہی تو اس قدر پوچھ گچھ اور معلومات میں لگے رہے۔ شجرہ نسب منگو کر چھان بین کرتے رہے۔ بس کیا بتاؤں۔؟“ اُس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”پھر راضی ہوئے بیٹا۔؟“ وہ خوش ہو کر پوچھنے لگیں۔
 ”ہاں اتنی۔ خدا خدا کر کے۔“

”صدقے جاؤں میرا بیٹا۔“ انھوں نے اُس کا سر قریب کر کے اُس کا ماتھا چوم لیا۔ ”بڑی کیسی ہے۔؟“
 ”اچھی ہے اتنی۔!“ اُس نے کہا۔

”کبھی ملو اوڑھ بیٹا۔ مگر....“ وہ اچانک اُداس ہو گئیں۔ ”ہم بھی کیا قسمت بے کرائے ہیں۔ ساری زندگی چھپتے چھپتے ہی رہیں گے۔“
 ”ہنیں۔ اتنی نہیں۔ میں آپ کو ضرور ملو اوڑھ گا۔ آپ لوگ چھپتی چھپاتی کبھی نہیں رہیں گی۔ میں آپ لوگوں کو ساری دنیا کو دکھاؤں گا۔ اپنی ماں اور اپنی بہن کو۔“

اتنی آنکھوں میں آئے آنسو پونچھنے لگیں۔

”بس چند دن کی بات ہے۔ میں ذرا ماموں جان اسٹڈی کروں گا۔ ہموار کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کو بے گریباؤں تو وہ کھلے ماتھے سے خوش آمدید کہیں۔ کوئی ایسی بات نہ ہو جس کا مجھے دکھ ہو۔ آپ کو دکھ ہو۔ بس۔“

”وہ کچھ کہیں گے بیٹا۔“

”کہہ نہیں سکتا۔ ظاہر ہے اچھا تو نہیں لگے گا۔ اور پھر انھوں نے میری پرورش اپنی اولاد کی طرح کی ہے۔ اُن کی سوچ بھی باپ جیسی ہے۔ مخالفت تو ضرور کریں گے۔“

”پھر کیا ہوگا۔ بیٹا۔؟“

”آپ کا بیٹا آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ آپ فکر مت کریں۔ خدا کوئی نہ کوئی حل نکال ہی دے گا۔ سر دست تو آپ کوئی اچھا سا مکان کرائے پر لینے کی کوشش کریں۔ فی الحال میں رُک نہیں سکتا۔ ایک نو چھٹی ختم ہے۔ دوسرے ذیشان کو شک پڑ جانے کا ڈر ہے۔ اس وقت بھی پریشان ہو رہا ہوگا۔۔۔“

وہ ایک پل کو چپ ہو گیا۔

ہونٹوں پر ہلکی سی سکراہٹ ابھرائی۔

شان کچھ کچھ جلتا سا بھی تھا۔

”تو آپ ایسا کریں۔ ایک تو مکان لے لیں اچھا سا۔ اور سب ضروری

بات یہ کہ چوکیدار رکھیں۔ زرین کو کہیں اکیلا مت جانیں دیں اس

وقت تو آپ یہ رکھ لیں۔“ اس نے جیب سے ایک ہزار روپے نکالتے ہوئے

اُن کی طرف بڑھائے۔ ”اُد یہ میرا کارڈ بھی۔“ اُس نے اپنا وزٹنگ کارڈ

بھی اکھین دیا۔ میں جانتے ہی اُد بھی رقم ارسال کر دوں گا۔ یہ دونوں

کام جلد سے جلد کریں۔ اور مجھے فوراً اطلاع دیں۔ ضرورت پڑے تو فون نمبر

ہے کارڈ پر فون کر لیا کریں۔ مجھے باخبر رکھیں۔ میں ایک ماہ بعد پھر
پھر لگاؤں گا۔

زرین نے وہیں میز لا کر رکھ دی۔

”زرین جلدی۔ بھوک بھی لگی ہے۔ اور وہ جو ہے نامیرا کزن۔
غصے کے مارے خود کو کاٹ رہا ہوگا۔“ ناہرنے شرارت سے کہا۔
اور۔ زی کے خوبصورت ماتھے پر ہل پر گئے۔

”وہ بھی غصے والا ہے بیٹا۔“ اتنی نے سادگی سے پوچھا۔

”ہنیں اتنی۔ یہ تو میں ویسے ہی کہہ رہا تھا۔ ویسے پریشان تو ہو رہا
ہوگا نا جلدی آنے کو کہا تھا۔ اور یہ ٹائم ہو گیا۔

”بہت مغرور ہے وہ سنا ہے۔“ زی میز پر برتن رکھتے ہوئے
نخوت سے بولی۔

”لوگوں کا خیال ہے۔ بلکہ زیادہ تر لوگوں کا۔“ اُس نے شرارت

سے زرین کی طرف دیکھا۔ کہ وہ مغرور ہے۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ

ایسا نہیں ہے۔ مجھ سے زیادہ CLOSE اُس کے ساتھ کوئی نہیں

ہے۔ وہ بے حد سادہ اور بے حد اچھے دل کا مالک ہے۔ یہ تو اس

کی پرورش اور تربیت ہی ایسی ہوئی ہے کہ اس کے رکھ رکھاؤ۔

اٹھنے بیٹھنے کے طریقوں سے لوگ غلط اندازہ لگا لیتے ہیں۔ کچھ لوگ بھی

بہت پیسہ اور اونچی طرزِ رہائش بعض اوقات لوگوں کے دلوں میں

غلط فہمی پیدا کرتی ہے۔ کئی کئی ملازم صرف اُس کی خدمت پر مامور

ہوتے ہیں۔ کبھی اُس کو اپنے تسمے باندھتے ہیں نے مشکل سے دیکھا ہے۔

اجنبی لوگوں سے بات چیت کے دوران وہ بہت لڑے دیئے رہتا ہے۔

اسی طرح کسی سے جلد ہی بے تکلف ہو جاتا کبھی اُس کی عادت نہیں۔

مگر۔ کبھی تم اُسے اپنی ماما کے ساتھ دیکھو۔ ایسے ہی کریم بابا کے ساتھ۔

بعض اوقات تو یا قاعدہ لاڈکراتا نظر آتا ہے۔ پھر جہاں وہ اپنا

تسمہ نہیں باندھتا۔ وہاں وہ اپنے گھوڑوں اور کتوں کی تمام دیکھ

بھال وہ خود کو ٹلے۔ یہاں وہ نوکروں پر کبھی بھروسہ نہیں کرتا۔۔۔۔۔

”بڑے لوگوں کی بڑی باتیں بیٹا۔ انی آہستہ سے بولیں۔

”سو نہ۔ بڑے لوگ۔“ زی پلیٹ ناصر کو دیئے ہوئے بڑ بڑائی۔

”تجھے نہیں اچھا لگا وہ؟“ ناصر نے وہی پلیٹ انی کو تھما دی۔

”جو اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہے۔ مجھا اچھا نہیں لگتا۔“

”تمہیں کیسے لگا کہ وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہے؟“ ناصر نے چاول کی

ڈس انی کے آگے پکڑی۔

”میں کسی کو ایسا موقع ہی نہیں دیتی کہ میرے سامنے اپنے آپ کو کچھ

سمجھے۔“ زی نے کھائی کی پلیٹ میں کو فتنے ڈال دیئے۔

تو پھر خواہ مخواہ بچارا زیر عتاب ہے۔“ ناصر کھانے میں مصروف ہو گیا۔

”زیر عتاب نہیں ہے مگر۔۔۔۔۔“ وہ کچھ سُرخ سی ہو گئی۔

”مگر۔ تمہیں اچھا نہیں لگتا۔ ویسے یہ خدا واسطے کا بیر کیوں ہے بے چارے

سے۔“ ناصر نے کہا۔

”بچارا۔ بچارا۔ آپ اُس کی اتنی حمایت کیوں کرتے ہیں۔؟“

اور۔ ناصر نے ایک جاندار قہقہہ لگایا ”میرا بھائی جو ہوا۔“
”ہو نہ۔ اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہے۔“

”CORRECTION, CORRECTION۔ ابھی ابھی تم کہہ رہی تھیں۔“

”کہ میں کسی کو ایسا موقع ہی نہیں دیتی کہ میرے سامنے اپنے کو کچھ سمجھے۔“
”مجھے ڈانٹ کیوں رہا تھا کل۔“ وہ معصومیت سے بولی۔

”ادہ۔ تو یہ بات ہے۔“

”وہی DONT CARE، اے بڑے دیکھے ہیں۔“ وہ لاپرواہی سے

بولی۔ اور۔ ناصر نے شرارت سے آنکھیں نیچائیں۔

”تم میرے کزن کی انسٹ کر رہی ہو۔“ وہ مسکرائے ہوئے بولا۔

”کہہ دیا نہ مجھے آپ کے کزن کی کوئی پرداہ نہیں ہے۔“ اُس نے لاپرواہی

سے ہاتھ ہلایا۔

”او۔ کے، او۔ کے۔ کہہ دوں گا اُس کو بس۔“

”مزور کہہ دیں۔“

اورانی بہن بھائی کی نوک جھونک سے مخطوط ہوتی رہیں۔

”اتنی۔ اب میں چلوں گا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔“

”گو دل نہیں چاہ رہا تھا جانے کو۔ مگر مجبوری ہے۔۔۔۔۔“

”بیٹا۔ دل تو میرا بھی نہیں چاہ رہا۔ خواب لگ رہا ہے سب۔“

”بھئی۔ یہ رات ادھر رہ لیں نا۔ رُی کی ڈیڈیا کی آنکھوں میں التجا تھی۔“

”میری بہن! شان کو شبہ ہو گا۔ ورنہ میں ضرور یہ لیتا۔ کیا میرا دل چاہتا ہے یہاں سے جانے کو۔“ ناصر نے زرین کا سر اپنے پہلو سے لگا لیا۔
 ”شان۔ شان۔ بس۔۔۔ اُس نے غصہ بمشکل روکا۔“
 ”اچھا اتنی۔ مکان اور چوکیدار کی تلاش آج سے ہی شروع کر دیں۔ مجھے جلد سے جلد خط لکھیں۔۔۔۔۔“

”اچھا بیٹا۔ اتنی کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔“ خدا عمر خدا ذکرے۔“
 ”اچھا۔ خدا حافظ۔ اُس نے زی کو سر پر پھیر لیا۔ اور اپنا سر اتنی کے آگے جھکا دیا۔

”خدا حافظ۔“ اتنی نے اُس کا ماتھا چوم لیا۔ ”اللہ حافظ۔ ناصر ہو۔“
 ”بھیا۔ جلدی واپس آئے گا۔“ حب معمول ”سوں“ کر کے ناک اوپر کھینچتے ہوئے زرین نے کہا۔

اور ناصر کو شان یاد آ گیا۔

”اچھا خدا حافظ۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

”خدا حافظ۔“ زی نے کہا۔

ناصر دروازے سے باہر نکلا۔

زرین اور اتنی دونوں دروازے میں کھڑی تاحہ نظر اُسے دیکھتی رہیں۔“

ناصر۔ کچھ جھجکتا سا۔ حقیقت سا اندر دا قل ہوا۔
 آگ کے قریب گر سی پر بیٹھا شان اُنکھی سی سوچوں سے چونکا۔
 ”ہیلو سر۔“ ناصر نے کہا۔

”ہیلو۔“ شان کا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔
 ”سوری شان مجھے دیر ہو گئی۔ ناصر اُس کے لب و لہجے پر نادم سا صفا
 دینے لگا۔ دراصل وہ۔ وہ زرین کی انجی کی طبیعت....“
 ”ہاں۔ ہاں معلوم ہے۔ صبح یہی کہہ کر گیا تھا۔“ وہ تند سے لہجے میں بولا۔
 اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”بابا جان گاؤں آیا ہے۔ فون کیا تھا۔ فوراً آنے
 کو بولا ہے۔“ کہتے کہتے وہ ڈرائنگ روم میں گھس گیا۔
 ”آج ہی چلنا ہے کیا۔“ ناصر بھی اُس کے پیچھے چلا آیا۔
 ”ابھی۔ اسی وقت۔ ہمارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ باقی کام کر لئے ہیں۔
 وہ اسی سنجیدگی سے بولا۔

ناہرنے دیکھا۔ سامان جوں کا توں پڑا ہے۔

شان بھی تولیہ اٹھاتا۔ پھر رکھ دیتا۔ کبھی شیو کا سامان با تھو روم سے لاتا تو ڈرینگ روم میں ہی ٹیبل پر رکھ دیتا۔
ناہر کو سنہی آگئی۔

سارے کام بقول خود نمٹ لئے تھے۔ مگر پھر بھی ہر چیز جوں کی پڑی تھی۔ کبھی کوئی چیز اٹھا ہی لیتا تو سمجھ میں نہ آتا کہ رکھے کیسے۔؟ خاصی عادت خراب کر دی تھی کریم بابا اور ناظم نے۔ پتہ نہیں لندن میں کیسے گزارا چلایا تھا۔

”کون کون سے کام کر لئے ہیں۔؟“ ناہر جلدی جلدی سوٹ کیس میں کپڑے بھرتے ہوئے بولا۔ مگر اگر۔

”جیب ٹھیک ہو چکا ہے۔ اور۔ ہوٹل کا PAYMENT بھی ہو گیا ہے۔ وہ سادگی سے بولا۔ چہرے پر کی تسلی اب معمول پر آ رہی تھی۔
”بڑے کام کئے ہیں سر۔“

”اور کیا؟“ اُس نے وہی شیو کا سامان اٹھا کر ناہر کو دکھا دیا۔
ناہر پھر ہنس دیا۔ اور پھر جلدی جلدی سامان اکٹھا کرنے لگا۔
”سر شان۔“ ناہرنے اُسے مخاطب کیا۔

”ہوں۔“ اُس نے کہا۔

”آپ بہت نکمے ہیں۔“ ناہر بڑے سے بیگ کا زپ بند کرتے ہاتھ جھاڑ کر
سجیدگی سے بولا۔

”دقت کا پابند ضرور ہوں۔“

ناصر۔ اُس کی چوٹ پر مسکرا دیا۔

اور پھر کسی خوبصورت خیال کے تحت اُس کا چہرہ جگمگا اٹھا
”کچھ کامیابی ہوا۔؟“ اُس کے چہرے کو بغور دیکھنے کے بعد، شان
مکرمے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

ایک پل کو ناصر سمجھ نہ سکا۔ کس بات کی کامیابی۔؟
کیا اُسے زرین اور انی کے متعلق کچھ معلوم ہوا تھا۔

پندرہ منٹ کے اندر اندر۔ وہ چھوٹے سے پہاڑی بازاری میں
گزر رہے تھے۔

دائیں طرف ایک سڑک جاتی تھی۔ جو کچھ دور چل کر چند موڑ مڑنے
کے بعد۔ زلی کے گھر کو جاتی تھی۔ اُس کی ماں کے گھر کو۔
غیر ارادی طور پر ناصر رُخ موڑ کر اُدھر دیکھنے لگا۔
”جانا ہے کیا۔؟“ اچانک شان گمبھیر لہجے میں بولا۔

”ن۔ ن۔ نہیں تو۔ کہاں۔؟“ ناصر اُٹھائے راز کے دُور سے جلدی
سے رُخ سامنے کرتے ہوئے بولا۔

اور پھر۔ اُس نے دیکھا۔

شان کے پُرکشش ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ اکبر آئی تھی۔
ایسا کیوں تھا۔؟

اگر بھی چلا بھی گیا۔ تو ایسی کوئی بڑی بات ہو گئی تھی اور پھر دیر
سویر تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ شان کو برا کیوں لگا تھا۔
مگر۔ نہیں۔ یہ اس کا وہم تھا۔

شان تو بہت وسیع قلب و ذہن کا مالک تھا۔
"ماموں جان پروگرام سے قبل گاؤں پہنچ گئے ہیں۔" جیب
شہر سے باہر والی سڑک پر ہوئی تو ناصر اُور کوٹ اچھی طرح درست
کرتے ہوئے بولا۔

اور۔ ہنسی جیسے بھٹک کر شان کے لبوں پر آ گئی۔
ناصر حیب عادت بابا جان کا سا مذاکرتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔
"میرا خیال ہے۔ میں نے کوئی لطیفہ نہیں سنایا۔ شان کو ہنستا ہوا
دیکھ کر ناصر چونکا۔ اور شان نے ایک گہری سانس لی۔
"ناصر کبھی کبھی مجھ کو تم پر رشک آنے لگتی ہے۔"
"وہ کیوں۔؟" ناصر بولا۔

"اپنا وقت اچھا گزار لیتے ہو۔"
"تو تمہیں کس نے روکا ہے۔ تم بھی اچھا گزارو۔"
"یہ ہی تو مشکل ہے۔"

"مثلاً۔؟" ناصر نے پوچھا۔

"بعض لوگ پیدائشی خوش قسمت ہوتے ہیں۔" شان سڑک پر
نظریں جمائے آہستہ سے بولا۔

”مکڑ مثلاً۔“ ناصر نے معلوم کیا۔

”جیسے تم۔“ شان کی مسکراہٹ میں گمبھیرا تھی۔

”وہ تو ہے۔“ اُس کا چہرہ کسی خوش آئند خیال کے تحت جگمگا

اُٹھا۔ میں واقعی خوش قسمت ہوں۔“

”اچھا بتاؤ اتنا دیر وہاں کیا کرتا رہا۔؟“ شان ایک نظر اُس کے بشاش

چہرے پر ڈالتے ہوئے پھر سامنے دیکھنے لگا۔ لہجہ اب بھی جھجھکسا تھا۔

”وہ۔ وہ۔ بس ڈاکٹر لایا۔ اتنی کو۔ میرا مطلب ہے۔“

زرین کی اتنی کودکھایا۔۔۔۔۔“

”پھر۔؟“ اس چھوٹے سے لفظ میں بلا کی بے چینی تھی۔

”سمجھ کر کیا۔ بس گپ شپ کرتے رہے۔“ ناصر کو جھوٹ پر جھوٹ

بولتا پڑ رہا تھا۔

”ہوں۔“ بے چینی۔ بے قراری میں بدل رہی تھی۔

”کیسا لڑکی ہے۔؟“ ناصر کی طرف رخ کرتے ہوئے اُس نے مزید پوچھا۔

اُس کی مسکراہٹ میں بے بسی گھل گئی تھی۔

ناصر نے چونک کر شان کو دیکھا۔

چند ثانیے دیکھتا ہی رہا۔ ادھر پھر۔

”ادھ۔ پروردگار۔“ ناصر کا سر غیر ارادی طور پر جیب کا دستہ

تھامے اپنے ہاتھ پر ٹک گیا۔

شان کیا سمجھ رہا تھا۔؟

ایک پل کو اُس ذہن بھٹا اٹھا۔

اور پھر وہ مزید چونکا۔

اگر شان کو ایسا کوئی شبہ تھا بھی۔ تو وہ ناصر سے بس
اوقات اکھڑا اکھڑا۔ روکھا روکھا۔ اور اس وقت کچھ بے چین اور
بے قرار سا کیوں تھا۔ اور پھر۔ اُس کی اس وقت کی مسکراہٹ میں
بے بسی کیوں تھی۔؟

چپ کیوں ہو گیا۔؟ اُس کے لہجے سے چھین صاف عیاں تھی۔
ناصر نے سر اٹھا کر سڑک پر نظریں جمائے شان کو دیکھا۔
”سوچ رہا تھا۔“

”کیا۔؟“ شان نے اس کی طرف دیکھا۔

”کہ.....“ ناصر اکھن میں پڑ گیا۔

”کہ کیا جواب دو۔“

”ہاں۔“ ناصر نے کہا۔

”جواب دے بھی کیا سکتے ہو۔؟“

ناصر نے کٹکھیروں سے شان کو دیکھا۔

سامنے دیکھتے ڈرائیو کرتے ہوئے وہ صاف دکھی نظر آ رہا تھا۔

اور۔ پھر ناصر کو۔

شان اچانک بہت اچھا لگا۔ بہت اپنا۔ بہت قریب لگا پہلے
کئی گنا اچھا۔ پہلے سے کہیں زیادہ اپنا۔ پہلے سے کہیں بڑھ کر قریب۔

”تم یوں جرح کر رہے ہو جیسے میں تمہاری کوئی چیز لے لی ہو۔“
 ”کسی اور کا لیا ہو تو لیا ہو۔ میرا کوئی چیز نہیں لے سکتا۔“ یکدم ہی
 شان گڑبڑا گیا۔ مگر اپنی آن اپنی جگہ قائم رکھی۔
 ”شان۔“ ناصر نے کہا۔

”ہوں۔“ شان نے جواب دیا۔
 ”اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔“
 اور۔ شان اُس کے انکار پر مسکرا دیا۔ اُداس سا۔
 ”بولو۔ مگر کوئی NON SENSE نہیں۔“ شان خائف تھا کہ میر
 پھر وہ ذی کا ذکر کر دے۔

”نہیں NON SENSE نہیں۔“
 ”جو کہو گے۔ ٹھیک کہو گے۔“ شان نے عدالتی لہجے میں کہا۔
 ”جو کہوں گا۔ سچ کہوں گا۔ سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔“ ناصر نے
 شان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

اور شان نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس دیا۔
 ”تمہیں ندین اچھی لگنے لگی ہے۔“ ناصر بھرپور اعتماد سے گویا ہوا۔
 ایک پل کو شان کو۔ جیسے سکتا سا ہو گیا۔
 پھر اُس نے آہستہ سے سر ناصر کے ہاتھ کی گرفت سے نکال لیا۔
 ”بابا جان بولتے تھے کہ بچھلے دنوں اُس نے جو ٹینڈرز بھیجا تھا
 اُن کا منظوری آ گیا ہے۔ اور اسی لئے انھوں نے مجھ کو فوراً بلا لیا ہے۔“

رات وہ IMPORTANT POINTS, DISCUSS کریں گے۔ کل وہ واپس اپنا ہیڈ کوارٹر جائیں گے اور مجھ کو شاید جلد ہی SITE پر آنا پڑے گا۔
 "سوال گندم، جواب جو۔"

"بھئی۔ تمہارا سوال کا جواب یہ ہے کہ۔ وہ۔ دوسرا لڑکیوں سے کچھ
 "THAT'S ALL-DEFFRENT ہے۔"

اور ناصر نے یہ بھی غنیمت سمجھا۔
 کھلے لفظوں میں ہارمان لینے کی وہ ویسے بھی اُس سے توقع نہیں
 کر رہا تھا۔

موڑ پر اچانک ایک گاڑی آئی اور سوچوں میں کھوئے شان نے
 اسٹرنگ زور سے گھا کر جیپ قابو میں کر لی۔
 "لگڑ۔ بگڑ صاحب دھیان سے۔" ناصر نے اُس کی گردن پر ہاتھ پھیرا۔
 شان زور سے ہنس دیا۔

"یہ ٹائٹل کس خوشی میں دے رہا ہے؟"
 "جس چیز کی گردن نہیں جھکتی حقیقت کے سامنے۔ ہماری زبان
 میں اُس کو لگڑ بگڑ کہتے ہیں۔"

"اور جس چیز کا ہر وقت ہر جگہ گھومتا رہتا ہے۔ آگے پیچھے۔ دائیں
 بائیں۔ اوپر نیچے۔ اُس کو کیا کہتے ہیں تمہاری زبان میں؟"
 "ناصر۔" ناصر نے اپنی غائب ٹونچھوں پر تاد دیا۔

اور ساتھ ہی شان نے پھر اچانک موڑ پر سے برآمد ہوئی بس سے

بشکل جیب بچالی۔

”سر عشق کے قدموں میں جھکانا ہی پڑے گا۔“ ناصر خوبصورتی سے گنگٹنایا۔

”آنا ہی پڑے گا۔“ شان نے اگلی لائن کہتے ہوئے شرارت سے ناصر کو دیکھا۔

”کیا مطلب ہے؟“ ناصر نے کہا۔

”یہ سر نہیں جھکے گا۔“

”اُس کو آنا پڑے گا۔“

”ٹھیک سمجھا ہے۔“

”ویسے وہ بھی کچھ کم نہیں۔ یہ ابھی سے بتا دوں۔“

”سوں“ کر کے انگلی سے ناک چھوتے ہوئے شان نے دوبارہ ناصر کو

دیکھا۔ ناصر نہیں دیا۔

اور پھر۔ رُخ پھیر کر کھڑکی میں قدرت کا لازوال حسن نظروں

ہیں نظروں میں سامنے لگا۔

جو خوب صورت حقیقت ناصر کو ہفتہ بھر سے خواب لگ رہی تھی۔
 اُس کی تصدیق کرنے وہ اِس ویک اینڈ پر انکل ماجد کے یہاں جا
 پہنچا تھا۔ اور پھر واقعی تصدیق ہو گئی۔ کبھی کبھی خواب بھی تو سچے
 نکلتے ہیں۔

انکل ماجد کو وہ بچپن سے ابو کے فاصلہ دوستوں کی حیثیت سے جانتا
 تھا۔ اُس کی خیریت دریافت کرنے وہ اکثر شاہان احمد کے گھر آتے اور
 ہر بار اُس کی پردہ گریس جان کر اور دیکھ کر خوش ہوتے۔ ناصر بھی جب
 موقع ملتا ضرور اُن کے یہاں جاتا۔ آنٹی۔ بیگم ماجد اُس کا اپنے بچوں
 کی طرح خیال رکھتیں۔ اُن کے بیٹے حامد اور ساجد ناصر ہی کی عمر کے
 لگ بھگ تھے۔ چھوٹا بیٹا ساجد آجکل میڈیسن میں ایم اے کرنے کا طریقہ
 میں تھا۔ اور حامد ہیں باپ کے ساتھ بزنس میں شامل تھا۔ فرزانہ،
 اُن کی بیٹی بی اے کر چکی تھی۔ اور آج کل گھر پر ہی تھی۔

شام کا وقت تھا۔ سردی اچھی خاصی تھی۔ ماجد صاحب اور
حامد تینوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے مختلف موضوعات پر بحث کرتے
چائے پی رہے تھے۔

حامد نے آخری چند گھونٹ جلدی جلدی لئے اور اٹھ کھڑا ہوا۔
"ناصر میں تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔ ذرا فرزانہ اس کی دوست
کے گھر سے لینے جانا ہے۔"
"ہاں۔ ہاں ضرور۔" ناصر نے کہا۔
اور پھر حامد چلا گیا۔

زرین اور سکینہ بیگم۔ ماجد صاحب کی اولاد کے لئے بھی باپ کے
مرحوم جگری دوست کی یتیم بچی اور بیوہ بھتیجی اور بس۔ باپ کے
جگری دوست کا نام یاسر علی تھا۔ مگر اس کے علاوہ اور کوئی تفصیل
کسی بچے کو نہیں بتائی گئی تھی۔

"دل میں یاسر علی کا راز چھپائے غصہ بیت گیا بیٹے تمہیں دیکھتا
تھا تو اکثر خیال آتا زرین۔ تمہاری بہن۔ تمہارے باپ کی بیٹی۔
تمہارا خون۔ کس قدر گمنامی اور کمپرسی کی زندگی گزار رہی ہے۔ اکثر
بھابی سکینہ سے کہتا کہ وہ اجازت دیں تو یہ بات شاہان احمد۔ تمہارے
ماموں کو بتا دی جائے۔ آخر ان کا اور زرین کا، یاسر علی کی اتنی
بڑی جائیداد میں کچھ تو حق بنتا تھا۔ مگر۔ وہ بے چاری۔ غریب گھرانے
کی بے کس عورت۔ گھبراتی تھیں۔ ڈرتی تھیں۔ اس راز کے افشا

ہونے سے۔ بہتر سمجھایا کہ کچھ نہیں ہو گا۔ آخر کب تک چھپائے رکھیں
گی اور پھر کب تک چھپی رہے گی یہ بات؟۔ جیسا کہ تم نے دیکھا۔ ہم
لوگوں نے منہ پر مہر لگا رکھی تھی چپ کی۔ مگر تمہیں دیکھ کر وہ خود ہی
بے قابو ہو گئیں۔ بتا دیا سب کچھ۔ اور پھر اس میں اُن کا بھی قصور
نہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ وہ زرین کی وجہ سے بہت پریشان رہتی ہیں۔
وہ چھوٹی تھی تو انھیں صرف مالی تنگی کی فکر تھی۔ مگر چوں ہی جوان
ہوئی۔ بھابی سودائی ہوئے لگیں۔

”کیا ہو گا بھائی جان۔ دُنیا بہت بُری ہے۔ جوان لڑکی کا ساتھ
ہے۔ کوئی جھوٹ موٹ کا ہی اُڑا دے تو کیا کروں گی۔“ وہ ہر ملاقات
میں پریشانی سے کہتیں۔

میں نے ایک بار یہ کبھی تجویز پیش کی کہ اگر وہ چاہیں تو میں تمہیں
مطلق کر دوں۔ آخر تم زرین کے بھائی ہو۔ زرین کا تم پر حق ہے۔ مگر
وہ بے چاری۔ حیا کی پتلی۔ اس عمر میں شرمناک کہتیں۔ ”نہیں بھائی جان
وہ کیا سوچے گا میرے اور آپ کے بھائی کے بارے میں۔“

بے چاری اپنے سیدھے پن اور شرافت سے مار کھا گئیں۔ بہر حال
مجھے خوشی ہے کہ حق دار کو حق خود بخود مل گیا۔ بیٹا کچھ بھی سہی وہ
تمہارے باپ کی بیوی ہے۔ تمہارا باپ۔ خدا اُس کو معاف کرے۔
تم سے کیا چھپانا۔ جوان ہو تم بھی اب۔“ وہ مکرائے ”خاصا رنگین
مزاج تھا۔ کبھی ادھر، کبھی ادھر۔ شادی کے بعد بھی بڑے اطمینان سے

عشق لڑاتا پھرتا۔ دور پار کے علاقوں میں تو کسی کو کبھی یہ تک نہ بتایا کہ وہ شادی شدہ بھی ہے۔ تھا بھی جوان جہان۔ کیسی بے وقت موت آئی تو بہ۔ "اکھوں نے اُداس سی سانس لی۔" ہاں تو میں بات کر رہا تھا۔ کہ جب بھابی سکینہ پر نظر پڑی تو دیوانہ ہو گیا۔ مجھے فوراً نئے عشق کی اطلاع کرتا تھا۔ پتہ نہیں کیا وجہ تھی۔ شاید اس بار یہ بات نیازنگ لے کر آنے والی تھی۔ میں نے بھابی سکینہ کے بارے میں ہمیشہ سے زیادہ باز رکھنے کی کوشش کی۔ دور پار کے غریب لوگ تھے۔ بیوہ ماں کی محصور سادہ بیٹی تھی۔ نہ دنیا کا کوئی تجربہ تھا نہ لوگوں کا۔ پھر اُن کے چھوٹے سے گاؤں میں بات پھیل رہی تھی۔ کسی کی عزت سے خواہ مخواہ کھیلنا۔ میں نے بہت لعنت ملامت کی۔ تو فوراً جوش میں آکر نکاح کے لئے تیار ہو گیا۔ میں اس بات پر بھی خوش نہیں تھا۔ مگر وہ سُن ہی نہیں رہا تھا۔ پھر میں نے کہا۔ اکھیں اپنی شادی اور بیٹے کا ضرور تہاؤ۔ تو یوں بدکا جیلے میں نے کوئی اہوئی بات کہہ دی ہو۔

"کبھی نہیں۔ اُس کی ماں سخت قسم کی عورت ہے۔ پھر نکاح کی

اجازت دے گی ہی نہیں۔" اُس نے کہا۔

میں نے کہا پھر کیا اتنی ہی ضروری ہے۔ یہ دوسری شادی۔ اُلٹا مجھے الزام دینے لگا کہ دیے جاتا ہوں تو بھی روکتے ہو۔ نکاح کرنے لگا ہوں تو بھی منع کرتے ہو۔ مختصر یہ کہ کسی طرح نہ مانا۔ شادی کر ہی لی۔ پھر میں نے رائے دی۔ کہ اب کی ہے شادی تو بٹھاؤ۔ اگر پہلی بیوی کا سامنا

ہیں کر سکتے تو چھپا کر دکھو مگر صحیح طریقے سے۔ گھر دلاؤ تمام حقوق دو۔
 مگر شادی کے فوراً ہی بعد وہ پچھتانے لگا تھا۔ بھابی سکینہ کو وہ
 خواہ مخواہ کا بوجھ سمجھنے لگا تھا۔ پھر بات بگڑتی گئی۔ وہ اُن کے نام
 سے چڑنے لگتا تھا۔ اُن کے ذکر سے فرار کی سوچتا تھا۔ ایک دن تو کہنے
 لگا "طلاق دے دیتا ہوں۔ مفت کی مصیبت پال رکھی ہے۔ میرا دماغ
 خراب ہو گیا تھا۔ وغیرہ۔"

اس پر میں نے سختی سے منع کیا۔ زرین کی پیدائش پر وہ مزید برا فروختہ
 ہوا۔ لڑکی کے نام سے اُسے چڑھتی۔ بھابی سکینہ۔ بچاری ناکردہ گناہوں
 کی پاداش میں پس رہی تھیں۔ ایک دن مجبور ہو کر مجھے خط لکھا۔ تمام
 حالات لکھے۔ جب کہ حالات اُن سے کہیں بڑھ کر مجھ پر عیاں تھے۔ میں
 گیا۔ اُن سے ملا۔ زرین کو دیکھا۔ ہتھارے باپ کی دوسری تصویر تھی۔
 کتنا بد قسمت تھا یا سر۔ نہ اپنی پہلی بیوی کا ہو سکا۔ سکون تو وہاں تھا۔
 مگر۔ اور نہ ہی دوسری بے چاری کو کوئی سکھ دے سکا۔ خیر۔ واپس آکر
 میں نے یا سر کو سمجھایا۔ لعنت ملامت کی۔

اور پہلی بار اُس پر کچھ اثر ہوا۔ بھابی سے ملنے گیا۔ سچی کو دیکھا۔
 جیسے کہ بعد میں مجھے سکینہ بھابی نے بتایا۔ عرصہ بعد اُن سے اچھے طریقے سے
 ملا تھا۔ آئندہ کے لئے کچھ تسلی دی تھی۔ اور میری نصیحت کے مطابق انھیں
 گھر دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر۔

افسوس زندگی نے وفانہ کی۔ چند ہی دن بعد بھابی جانِ سلمیٰ کے ساتھ

شہر تک جا رہا تھا کہ ایکسڈنٹ ہو گیا.....“

چائے کا گھونٹ لیتے لیتے ماجد صاحب نے دکھ بھری داستان کا اختتام کیا۔

”اب بھی کچھ نہیں کیا بیٹا۔ بلکہ اصل وقت اب آیا ہے۔ ذرین کو عمر کے عین اس موڑ پر تمہاری ضرورت سب سے زیادہ تھی۔ تم ان لوگوں کو پا کر خوش ہوئے ہو۔ تو میرا بھی ذہن پر سے عرصہ کا گراں بوجھ ہٹ گیا ہے۔“
 ”انکل میں واقعی بہت خوش ہوں۔ ماماؤں جان اداشان نے ابو اور بھائی کی جگہ پر کی ہے۔ اس طرح سے کہ میں بھی نہیں بچھتاؤں گا کہ میرے ابو اور میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ اور اب آپ دعا کریں کہ خدا مجھے صحت اور استقامت دے کہ اچھی ٹو کبھی یہ خیال نہ آئے کہ وہ بے سہارا ہیں اور ذرین کبھی یہ محسوس نہ کرے کہ اُس کا باپ زندہ نہیں ہے۔“
 اُس نے خالی کپ مینز پر رکھتے ہوئے کہا۔ اُس کے لہجے میں غم تھا۔
 استحوکام تھا۔

”مجھے بھی تم سے یہی امید تھی بیٹا۔“ انھوں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”مگر انکل۔ آپ کی ڈیوٹی اب بھی وہی ہوگی۔ آپ اُن کو پہلے کی طرح ملتے رہیں گے۔ میں اکیلا کافی نہیں ہوں۔ ہمیں اب بھی آپ کی ضرورت رہے گی۔“ ناصر حسبِ عادت خوشگوار لہجے میں بولا۔

”کیسی بات کرتے ہو بیٹا۔ ساری زندگی کا نااُمید میں اب توڑ دوں گا۔ وہ بھی مکرادیئے۔“

”انکل۔ اب اجازت چاہوں گا۔ اب بھی پہنچے پہنچتے رات کے بارہ بج جائیں گے۔ گھڑی دیکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے وہ مغذات کے لہجے میں بولا۔
 ”ہاں بیٹا۔ رات رہنا ہوتا تو الگ بات تھی۔ وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔“ ذرا ٹھہرو۔ تمہاری آنٹی کو بتا دوں۔

”ضرور۔ اور انکل۔ ایک بات اور۔ اتنی کہتی تھیں۔ یہ بات جب تک چھپی رہ سکے اچھا ہے۔ میرا مطلب ہے مائوں جان اور شان سے۔ آپ کو مائوں جان کی طبیعت کا پتہ ہے۔ گننام سے گاؤں کی، گننام غورت کو پتہ نہیں وہ قبول بھی کرتے ہیں یا نہیں۔؟ وہ پھر سے دکھی ہو گیا۔
 ”ہاں یہ تو ہے۔ مگر تم دکھی نہ ہو۔ آہستہ آہستہ شاید ہموار ہو ہی جائیں۔ اللہ پر چھوڑ دو سب۔“

”اچھا انکل۔ خدا حافظ۔“ اُس نے ماجد صاحب سے ہاتھ ملایا۔ ”خدا حافظ آنٹی۔“ اندر آتی ہوئی آنٹی کو بھی اُس نے ”خدا حافظ“ کہا۔
 بیگم ماجد نے بہتیرا کھانے پر روکنا چاہا۔ مگر ماجد صاحب ہی نہ ملنے۔ پورے پانچ گھنٹہ کا راستہ طے کرنا تھا۔ شام پہلے ہی ہو چکی تھی۔
 ”خدا حافظ بیٹا۔“ بیگم ماجد نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔
 اور۔ پھر۔ وہ منٹوں میں اپنی خوبصورت نئی کار میں ہموار چلتی سڑک پر رواں دواں تھا۔

پہاڑ پر آئے آج اُسے دو ہفتے ہو گئے تھے۔ گومیہانی علاقوں
 میں سردی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ زندگی معمول پر آ گئی تھی۔
 مگر یہاں اب بھی پھلی برف باری کے آثار جگہ جگہ برف کے
 تودروں کی شکل میں نظر آ رہے تھے۔ نیچے بل کھاتی سرسبز سرسبز البتہ بالکل
 صاف تھی۔ ادنیٰ نیچے درخت ادرا کا دکا کچے پکے مکانات بھی اپنا
 سفید لبادہ اتار کر پھینک چکے تھے۔ سردی اگرچہ اب بھی بہت تھی۔ مگر
 وہ منہمک کرنے والی خاصیت کھو چکی تھی جو کچھلی بار اُس کی اور ناصر کی
 یہاں دورات قیام کے دوران تھی۔
 کیسے سردی سے گھبرائے اُسے ناصر صبح ہی صبح یہاں سے چلتا کر کے
 نیچے شہر میں اتار لے گیا تھا۔
 چھوٹا سا خوب صورت شہر
 خیال آتے ہی۔ اُسے وہاں جانے کا خیال آیا۔

اچانک ہی وہ یہاں بوریست محوس کرے لگا۔ کتنے دن ہو گئے
تھے اُسے یہاں آئے ہوئے۔

ہوسپٹل کی تعمیر کے سلسلے میں اُسے یہاں آنا پڑا تھا۔ قیام یہاں
واقع اپنی ہی کو کٹھی پر تھا۔ ان دنوں وہ میٹر میں اکٹھا کرنے کا بندوبست
کر رہا تھا۔ کام سردی کا زور کم ہونے پر اگلے ماہ شروع کروانا تھا۔
”ذیشان کنسٹرکشنز“ بڑے سے اپنے نام کے لگے بورڈ کے پاس
ہی وہ کھڑا تھا۔

سامنے تاحید نظر مشینریز۔ گریڈرز۔ لکڑی کی پیٹیاں اور متعدد
تعمیر سے متعلق چیزیں نظر آرہی تھیں۔ مزدور اب بھی ادھر سے ادھر
مہروف نظر آرہے تھے۔

اُس نے گھڑی دیکھی۔ دن کا ایک بج رہا تھا۔

کافی دنوں سے کام کر رہا تھا وہ۔

اب ذرا آؤٹنگ ہونی ہی چاہئے۔

بابا جان بھی کل چکر لگا چکے تھے۔ اُن کی آمد بھی فی الحال متوقع نہ

تھی۔ جلدی سے جیب میں بیچہ کر وہ نزدیک ہی اپنی رہائش گاہ پر آیا۔

ناظم کو وہاں شہر کے ہوٹل میں ریزولیشن کے لئے فون کرنے کو کہہ
کر وہ تیار ہونے لگا۔

گھنٹہ بھر بعد ہی وہ کریم بابا کی ہمراہی میں خود ہی ڈرائیو کرتا۔
چھوٹے اُس خوبصورت شہر کی طرف گامزن تھا۔

ڈرائیور کو آج اُس نے بھی ساتھ نہ لیا تھا۔ مطمئن ہو کر RELAX
ہونا چاہتا تھا شاید۔

مختصر سے بازار سے ہوئے وہ ہوٹل کی طرف جانے والی سڑک پر
ہو لیا۔ اور وہیں اُس کی نظر دائیں طرف دیوار پر لگے پکچر کے پوسٹر پر
پڑی۔ "DIRTY DOZEN"

یہاں اتنی اچھی پکچر بھی آجاتی ہے؟ اُس نے سوچا۔
گھڑی دیکھی۔ پکچر شروع ہونے میں کچھ دیر اب بھی تھی۔
پتہ نہیں کیا بات تھی۔

اس شہر کے لئے روانگی پر بھی اُس کا دل۔
نجیب سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔

اور پھر اس وقت پکچر کا یہ پوسٹر دیکھ کر بھی اس کا دل اسے
دیکھنے کو بچوں کی طرح چلا تھا۔ ورنہ تو۔
سنجیدہ ماحول میں پیدائش۔
مدبر فضا میں تربیت۔

اور تدبیر ہی کی توقع میں تودہ مشین کی قسم کی چیز بن کر رہ گیا تھا۔
تدبیر۔ اصول۔ آن۔

زندگی ان ہی اصولوں کا نام ہو کر رہ گئی تھی جیسے۔
ہوٹل پہنچتے ہی اُس نے کافی مشکواتی۔
کریم بابا سامان لگانے لگے۔

شیو کا سامان خود نکال کر وہ ڈرلنگ روم جانے لگا۔ تو بابا کو حیرت سی ہوئی۔ شان کو شاید وہ پہلی بار کام کرتے دیکھ رہے تھے۔
 ”آپ آگ کے پاس بیٹھو بابا۔ میں تیار ہوتا ہوں۔“ بیرے نے
 آکر مٹی کا تیل بڑی سی انگلیٹھی میں رکھی لکڑیوں پر ڈال کر تیلی دکھائی
 تو شان نے بابا سے کہا۔

کسی کی مدد کے بغیر شان کا تیار ہونا۔ بابا کے لئے یہ بھی نئی بات تھی۔
 آج شان نے تیاری میں وہ اہتمام بھی نہیں برتا۔
 گرم پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ سوٹا وہی رہنے دیا اور بالوں میں
 برش کرتے ہوئے کمرے میں آگیا۔

وقت کی کمی تھا شاید یا پھر۔ کسی خوشگوار تبدیلی کا اثر۔
 بابا نے دھیر ساری کافی کپ میں ڈالی۔ ذرا سا ابلا پانی چائے دانی
 سے ٹپکایا۔ تو شان نے کپ اٹھا کر خود پھینٹا شروع کیا۔
 پیٹ تیار ہوا تو بابا نے مزید ابلا پانی ڈال دیا۔
 ”چینی۔“ کپ میز پر رکھتے ہوئے شان بولا۔
 اور بابا کو ایک اور تبدیلی نظر آگئی۔

”کتنی۔ چھوٹے صاحب؟“ اس پہلے وہ کافی میں چینی نہیں ملا تا تھا۔
 ”آٹھ چمچ۔“ اور بابا نے آدھا چمچ چینی ڈال دی۔
 اور پھر شان نے خلافِ عادت اس میں چند قطرے دودھ ٹپکایا۔
 ”بہت اسٹرائنگ پیتے تھے پہلے آپ۔“ بابا اس تبدیلی پر خوش

نظر آرہے تھے۔

"باں بابا۔ ناصر نے پلایا تھا دودھ اور چینی ملا کر۔ اچھا لگا
تھا ہم کو۔" چچہ چلاتے ہوئے اُس نے کپ اٹھالیا۔
اور بابا نے۔ اپنے لئے مشکوائی چائے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے
سوچا۔ اُن کا چھوٹا صاحب عمر کے لحاظ اور تقاضے سے ہر کام
کرنے تو کتنا اچھا ہو۔

"بابا۔ میں بکچر دیکھنے جا رہا ہے۔ آپ آرام سے اپنا ڈنر منگا کر
کھا لو۔" اُس نے جلدی جلدی کوئی حلق سے اُتار کر خالی کپ میز
پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بہتر سرکار۔" بابا نے ہینگر پر سے اُس کا اوڈر کوٹ اُتارتے
ہوئے کہا۔ پھر اُس کے قریب چلے آئے۔

"اپنا خیال رکھئے گا سرکار۔ ڈرائیور کو ساتھ لے آتے تو اچھا
ہوتا۔" اُسے اوڈر کوٹ پہناتے پہناتے وہ حسبِ عادت تشویشناک
لہجے میں بولے۔

"اد کے بابا۔" شان نے کہا۔

اور۔ دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

اس میں بابا کا بھی قصور نہیں تھا۔

لندن کے قیام کے علاوہ۔ اُس سے قبل اور اس کے بعد ہمیشہ

بابا جان کے حکم کے مطابق ملازموں کی تحویل میں ہی رہتا تھا۔

زمینداری اور کاروبار کا بھاری بوجھ سنبھالنے کے باوجود بعض
وقت اُسے اپنا چھوٹا سا ذاتی کام کرتے ہوئے بوجھ سا محسوس ہونے لگتا۔
ہال میں اندھیرا ہو چکا تھا۔ گیٹ کیپر کی ٹارچ کی روشنی کی رہنمائی
میں وہ گیلری میں سے چلتا لائن کی آخری سیٹ پر آ بیٹھا۔
ہال میں خاصی سردی تھی۔ بیٹیں بھی آرام دہ نہیں تھیں۔
بہر حال اُس نے پاؤں ایک طرف کر کے سامنے پھیلا لئے اور کورٹ
کا کالر اچھی طرح سے درست کیا اور نظریں اسکرین پر جمادیں۔
کسی پکچر کا ٹریلر دکھایا جا رہا تھا۔
خدا خد اگر کے پکچر شروع ہوئی 'WORLD WAR' کی پکچر تھی۔
بہت ہزنے کی۔ وہ ارد گرد سے بے خبر ہو گیا۔
پھر انٹرول ہوا۔ بتیاں روشن ہو گئیں۔
رائٹس سمیٹ کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
اُس نے دیکھا گیلری تقریباً خالی تھی۔ دائیں طرف چار پانچ آدمی
بیٹھے تھے۔ اور پھر اُس سے آگے ایک لائن چھوڑ کر ایک فیملی بیٹھی ہوئی
تھی۔ چار لیڈیز ایک لڑکا۔
رہ کے کی شکل کچھ جانی پہچانی سی معلوم ہوئی۔ اور پھر اُسے یاد
آیا۔۔۔ ساجد تھا۔ ماجد صاحب کا چھوٹا بیٹا شاید۔
پھوپھا جان یا سر علی کی ماجد صاحب سے پرانی دوستی ہونے کے
نظم یہ لوگ کبھی کبھی اُن کے یہاں تاہر کی خیریت دریافت کرتے آتے تھے۔

اب تو باہا جان سے بھی اچھے خاصے تعلقات تھے۔ ناصر بھی کبھی کبھی جاتا تھا۔
ان کے یہاں۔ شاید بیٹوں سے بھی گپ شپ تھی۔ مگر خود شان سے ایسی
کوئی قاصد بے تکلفی نہ تھی۔

ساتھ لیڈر تھیں۔ ماں بہنیں ہوں گی شاید۔
چوتھی سیٹ پر بیٹھی لڑکی کی شکل بھی کچھ جانی پہچانی سی تھی۔
شاید دیکھا تھا کہیں۔ کسی پارٹی وغیرہ میں۔ اور۔
آخری سیٹ پر بیٹھی لڑکی نے سیٹ پر سے جھولتی اپنی لمبی سی
چوٹی کو سنبھالنے کی کوشش میں سائیڈ پر دیکھا اور پھر۔ غیر ارادی
طور پر پچھلی سیٹ کی طرف نظریں اٹھیں۔
تو جانے کیوں۔؟

شان کو ایک لمحے کے لئے۔ اپنے دل کی دھڑکن بے ترتیب
ہوتی محسوس ہوئی۔

زرین تھی۔ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ۔
ایک پل کو زرین کی نظریں شان کی نظروں سے ٹکرائیں۔
اور پھر۔ دلکش چہرے پر حیالی کی لالی بکھر گئی۔
گھنی خوبصورت پلکیں جھپک گئیں۔
اُس نے رخ واپس موڑ لیا۔
ادر شان کو۔

چھوٹا سا یہ خوبصورت شہر بہت حسین لگا۔

"I DON'T CARE" اُسے اُس کے الفاظ یاد آ گئے۔

"SHE DOES CARE" اُس نے سوچا۔

اُس کی پلکوں پر چھائی لالی۔

پلکوں کا تیرا کر گرنا ہی کہتا تھا۔

اور پھر اُسے یاد آیا۔ سیٹھ حامد علی کے یہاں اُس نے زرین کو
اسی لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا۔ بڑی عمر کی خواتین ماں و خالہ ہوں گی۔
اُس نے سوچا۔ اسی طرح ساجد سے بھی درمیان میں بیٹھی خواتین کے
ذریعہ ہی کوئی رشتہ ہو گا۔

زی۔ یہ لو۔۔۔ ساجد اُسے کھنی مونگ پھلیوں کا پیکیٹ دینے
لگا تودہ چونکا۔

"نو۔ ٹھینکس۔ میں نہیں کھاؤں گی۔ گلا خراب ہے۔ مہینے نے
معذرت کی۔

"کچھ نہیں ہو گا۔ میں دوائی دلا دوں گا۔ ساجد نے وہیں سے
ہی آگے جھکتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر مونگ پھلی کا لٹاقہ اس کے
ہاتھ پر رکھ دیا۔

اور پتہ نہیں کیوں۔ شان نے سوچا۔

اس دوائی کے بچے "کوکرسی سمیت گیلری سے نیچے لڑھکا دے۔
پکچر ختم ہو چکی تھی۔

وہ جلدی جلدی بیڑھیاں طے کرتا ہوا باہر پارکنگ میں آ گیا۔

چوکیدار کو پے منٹ کر ہی سر ہاتھا کہ وہ لاگ یکے بعد دیگرے
سیڑھیاں اترتے دکھائی دئے۔

لڑکیاں آگے آگے اور خواتین پیچھے پیچھے تھیں۔
جیب میں داخل ہونے سے قبل جانے کیوں اُس نے ایک دانستہ
نظر زرین پر ڈالی۔

شان کی نظروں کا رد عمل تھا شاید۔

زرین کی بھی نظریں اٹھ گئیں۔

اور پھر۔۔۔ پلکیں گرنے اٹھنے لگیں۔

تو نشان کا دل چاہا۔

چھوٹے سے اس خوبصورت شہر میں بیرا کرے۔

بتسم لب۔ مسکراتی آنکھیں۔ ہنسا چہرہ لئے۔ وہ اپنی جیب

میں چای بیٹھا۔

شام کے تین بج چکے تھے۔ چھوٹے سے خوبصورت بازار کی ہمارا بھی
 چھوڑ کر وہ قدرے کھلی۔ ہوٹل کی طرف جانے والی سڑک پر ہوا لیا۔
 پہاڑی علاقے بھی کتنے پُر فریب ہوتے ہیں۔
 دن چھوٹے اور راتیں لمبی محسوس ہوتی ہیں۔
 طلوع آفتاب مدہوش کن۔ اور شا میں اُداس ہوتی ہیں۔
 تین ہی بجے تھے۔ مگر سورج تیزی سے اونچے سرخی پہاڑوں میں
 پناہ ڈھونڈنے کے لئے سرگرداں نظر آ رہا تھا۔ نیلگوں آسمان شفاف تھا۔
 اور۔ بڑا سا سفید بادل کا ایک ٹکڑا۔
 دھیرے دھیرے پیلے آکاش پر آوارہ گردی کرتا۔
 جانے کیوں۔ اُسے اپنے جیسے لگا۔
 کل شام سے وہ بھی زندگی میں شاید پہلی بار۔
 بلا مقصد۔ ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔

کام نہ کاج۔ مزدی کا موں سے فرار اختیار کئے۔
اس شہر میں آوارہ گردی کرتا۔

دور۔ بہت دور اوپر آسمان کی وسعتوں میں۔ شاہانہ شان سے
تیرے عقاب پر نظریں جمائے وہ آہستہ رفتار سے ڈرائیو کر رہا تھا۔
بھی وہ چونکا۔

دائیں جانب سڑک کے کنارے زرین کھڑی تھی۔ اپنی اسی دوست
کے ساتھ۔ نسرین نام تھا غالباً۔ کالج کی عمارت کے قریب ہی تھی۔ شاید
چھٹی ہو جانے پر کسی ٹرانسپورٹ کی منتظر تھیں۔

بلا سوچے سمجھے اُس نے پاس جا کر جیب روک لی۔

”آئیں۔ لے جاؤں آپ لوگوں کو۔“ آخر تو اب وہ ایک دوسرے
کو اتنا تو جانتے ہی تھے۔ اور پھر لڑکیوں کا یوں سر راہ کھڑے رہنا
اُسے کبھی اچھا نہ لگا تھا۔

”او۔ زی۔ نسرین اُسے پہچانتے ہی آگے بڑھی۔

”تم جاؤ۔ میں بس سے آجاؤں گی۔“ زرین سڑک پر نظریں
جماتی ہوئی بولی۔

اور شان کے چہرے پر تاریک سے سائے لرز اُٹھے۔

”آئیں مس نسرین۔“ شان نے فوراً ہاتھ بڑھا کر اُس کے لئے
دروازہ کھول دیا۔

اور نسرین واقعی آگے بڑھ آئی۔

نسرین نے چونک کر اٹھیں دیکھا۔ شاید اُس کا خیال تھا نسرین
اُسے چھوڑ کر نہیں جائے گی۔ اور یا پھر اگر وہ جلے گی بھی۔ تو شان
اُسے اکیلے لے کر نہیں جائے گا۔

ایک پل کو زی کا رنگ بدل سا گیا۔
اُس کو ایک ہی پل میں شان نے دیکھا۔
اُس کے چہرے پر غصہ کی کیفیت ابھری۔
وہ مٹی تو حد نے جگہ لے لی۔

وہ بھی مدھم پڑ گئی۔ تو اپنی ہتک کا احساس جھٹکنے لگا۔
اور۔ شان کو ایک گونہ اطمینان کا احساس ہوا۔

”زی۔ تم بھی آجائیں تو اچھا تھا۔ آج بہت دیر ہو گئی ہے۔
نسرین کو اپنی ماں کی فکر لگی ہوئی تھی۔ ذرا سی دیر ہو جانے پر پریشان
ہو جاتی تھیں۔ زی کے دلی جذبات کے بے خبر حیرت میں بیٹھتے بیٹھتے وہ بولی۔
”کہہ دیا تا بس سے آجاؤں گی۔“ اُس کی طرف دیکھے بغیر وہ بولی۔ اور
اُس کے لہجے کی تلخی محسوس کر کے شان کو مزید اطمینان ہوا۔

”آپ چلیں۔ آجائے گا بس سے وہ۔“ ایک بھر پور نظر زی پر ڈالتے
ہوئے اُس نے جیب اسٹارٹ کر دی۔

اور پھر نظروں سے اوجھل ہونے تک۔ برابر وہ سڑک کے کنارے
کھڑی زی کو دیکھ رہی تھی۔

نسرین کو چھوڑ کر وہ سیدھا ہوٹل گیا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ آگ کے

قریب صوفے پر بیٹھا۔ ٹانگیں سامنے کی میز پر سیدھی پھیلائیں۔
اور۔ کافی کی چسکیاں لیتا۔ رائیڈر ہیگرڈ کو پڑھتا رہا۔
کبھی کبھی البتہ ذہن کھٹک جاتا۔

زی۔ کیوں اُس کے ساتھ جانے پر رضامند نہ تھی۔؟
کل رات پکچر ہاؤس میں تو ٹھیک ٹھاک تھی۔
آج اچانک کیا ہو گیا۔

"I DON'T CARE" اُسے اچانک یاد آیا۔ تو محترمہ کو اپنی
آن کا خیال تھا۔

پھر اُسے کل رات پکچر ہاؤس میں اُس سے نظریں ملنے پر اُس کے
چہرے کی لالی اور پلکوں کا گرنا یاد آیا۔ ان پر شاید اُسے اختیار نہیں
بعض حرکات غیر ارادی بھی تو ہوتی ہیں۔

تو میڈم شعوری طور پر اُس سے انکار کر رہی ہے۔
اور غیر شعوری طور پر۔؟

اُس کے لبوں پر خوبصورت مسکراہٹ بکھر گئی۔
فی الحال اُس کا لا شعوری کافی تھا۔

شعور بعد میں دیکھا جائے گا۔ دیکھتے ہیں کب تک انکار کرتی
ہے۔؟ اُس نے سوچا۔

اور پھر اُسے اچانک یاد آیا۔
نرسین اُس کی چپ میں بیٹھنے کے لئے آگے بڑھی تھی۔

تو وہ - واضح طور پر جل گئی تھی - اُس کا لا شعور -

کتاب بند کر کے اُس نے میز پر رکھ دی - سرھونے کی پشت سے
 "ٹکا کر آنکھیں موند لیں -

کبھی وہ کچھ سوچتا نظر آتا اور کبھی خوبصورت لبوں پر دلکش
 مسکراہٹ ابھرتی - اور پھر -

اُسے اچانک نا صریح یاد آ گیا - اس وقت ہوتا تو کیا کچھ نہ کہتا -
 "بابا" اُس نے ڈرلینگ روم میں معروف کریم بابا کو آواز دی -
 "جی سرکار" وہ نمودار ہوئے -
 "پن اور پیڈ لادیں" اُس نے کہا -
 "اچھا حضور" وہ بولے -

اور پھر - وہ وہیں بیٹھا - دیر تک ناھر کو خط لکھتا رہا -
 کبھی بخیدہ نظر آتا - کبھی لکھتے لکھتے مسکرا دیتا -
 شاید آج کی پوری رپورٹ دے رہا تھا -
 اگلے دن - وہ واپس پہاڑ پر چلا گیا -

یوں فارغ دن اُسے کم ہی نصیب ہوتے تھے - اور توقع کے
 مطابق کام کی رفتار بھی کم پڑی ہوئی تھی -
 بہر حال - وہ پھر کام پر لگ گیا - ساتھ ساتھ ہر دوسرے روز
 بابا جان کو کام کا پروگرام بھی بتاتا جاتا تھا -

دو روز ہوئے وہ گاؤں سے واپس آیا تھا۔

بابا جان گاؤں پہنچے ہوئے تھے۔ چند ضروری نکتے لیے تھے، جن پر فون پر تفصیل سے بات چیت نہ ہو سکتی تھی۔ اسی لئے وہ گاؤں چلا گیا تھا۔

گاؤں میں بھی زمینداری کے سلسلے میں بیسیوں مسائل منتظر رہتے تھے۔ اسی لئے باوجود یہاں ضروری کام کے وہاں چار دن رُکنا پڑا۔

دو دن پھر یہاں مسلسل کام میں لگا رہا۔ جسمانی اور ذہنی طور پر وہ سخت ٹھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔

نیچے وادی میں شہر جانے کا سوچا۔ مگر۔

کل کا دن یہاں لگانا اشد ضروری تھا۔ اُس کے بعد اس کا پیالے بھی کام کر داسکتا تھا۔

اور پھر۔ اسی طرح ایک دن مزید وہ صبح آٹھ بجے سے لے کر سہ پہر تک مسلسل کام میں مصروف رہا۔ کئی فائیلوں سے نمٹنا تھا۔ کئی چیزیں

گودام میں چیک کرنی تھیں۔ اور پھر باقی کا سارا وقت وہ SITE پر موجود رہا۔
کوٹھی پر واپس پہنچا تو سخت تھکا ہوا تھا۔ اُس نے کھانا بھی
نہیں کھایا۔

”کافی لاؤ“ اُس نے آگ کے قریب رکھی آرام چیر پر ڈھیر ہوتے
ہوئے ناظم سے کہا۔

اچانک اُس کے دل میں شہر جانے کی سہمی۔

مگر تھکن۔ اُس نے مضموں سی انگڑائی لی۔

اور پھر۔ اُسے زی کا خیال آگیا۔

لب خواہ مخواہ ہی مسکراٹھے۔ وہ کسی مشینی طاقت سے اٹھا۔

بیل دبائی اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

”جی سرکار۔“ کریم بابا تھے۔

”بابا تیاری کریں۔ شہر جانا ہے۔“

”مگر۔ آپ تھکے ہوئے ہیں بیٹا۔ اگر ضروری کام نہ ہو تو۔۔۔۔۔“

مضموں نے اُسے گودوں میں کھلایا تھا۔ کبھی کبھی اپنی اولاد کی طرح
حسرت کرنے لگ جاتے۔

”ضروری کام نہیں ہے مگر۔“ وہ مسکرایا۔ ”تھکن ضرور ختم ہو جائے گا۔“

”جیسے حکم ہو۔“ اور کریم بابا تیاری میں مصروف ہو گئے۔

اُس نے کوئی پی۔ ناظم نے جیب میں سامان رکھوایا اور حسیب سابق

کریم بابا کو لے کر ڈرائیور کو ساتھ لے کر بخیر ہی چل دیا۔

بادل صبح سے ہی سہرے چمکے سورج سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ کچھ
 بادلوں کا پلہ بھاری ہو جاتا تو کبھی سورج کا۔ مگر ان دنوں اس موسم میں
 بادلوں کی جیت یقینی تھی۔ دوپہر ڈھلتے ڈھلتے بادلوں نے ہلہ بول دیا۔
 سورج بے چارے کو چھپتے ہی بنی۔ ہر سو بادل ہی بادل نظر آنے لگے۔
 اُس نے گھڑی دیکھی۔ شام ہونے میں ابھی دیر تھی۔ مگر آسمان پر چھا
 گھاؤں نے وقت سے پہلے ہی اندھیرا پھیلا دیا تھا۔
 کتنا اچھا لگتا تھا اُسے یہ سب۔ مسحور ہوتے ہوئے اُس نے اُٹھ کر
 پر نظر ڈالی۔

اونچے پہاڑ۔ گہری کھائیوں، سدا بہار پائینز۔ سب اس وقت
 جنگلوں ایسے سفید بادلوں کی لپیٹ میں تھے۔
 پتلی کی چکر دار سڑک پر بادلوں کا راج تھا۔ اُس نے ہیڈ لائٹس
 رکھی تھیں۔ اس کے باوجود راستہ دیکھنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔
 مگر ان سب کے باوجود اُسے موسم سے پیار تھا۔
 ”ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ“ اچانک جیپ کی چھت بج اُٹھی۔ اور اس سحر
 سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اس کے جیپ کے وائپرز چلا دیئے۔
 شہر کے قریب پہنچ کر بابا کو اُس نے اُسی چھوٹی سی دکان سے
 چائے پلائی۔ جہاں ناہر نے اُسے چائے پینے کے لئے روکا تھا۔
 آج اُس نے خود بھی پی۔ اُسے الو کھا ہوا آیا۔
 ناہر سچ کہتا تھا۔ دودھ میں بنی چائے کی اس چھوٹی سی، سی سی

پیالی میں جو مزا تھا وہ اندر کوئی شیشی کے موٹے بھاری کپ میں نہیں تھا۔
شہر کے اندر داخل ہو۔ تو
اُسے عجیب سا احساسِ خوشی ہو رہا تھا۔ اٹکھا سا مزا محسوس
ہو رہا تھا۔

رات کا کھانا اس نے وہیں کمرے میں منگوا کر کھایا۔ اور پھر وہ
جلد ہی سو گیا۔

اوپچائی پر بنے خوبصورت سی کیفے کے بیرونی حصے میں بیٹھا دوپہر
کا کھانا کھا لینے کے بعد وہ کافی پینے میں مصروف تھا۔
مطلع آج پھر ابراؤد تھا۔ سردی اختتام پر تھی۔ بادلوں نے ابھی
دنوں برس کر تو دل کا غبار نکالا تھا۔

اس نے اوپر نگاہ کی۔ سیاہ گھٹائیں پورے آکاش کو گھیرے
میں لئے تھیں۔

سامنے دیکھا۔ ہلکی ہلکی بوندیں بھی پڑ رہی تھیں۔

نیچے دیکھا۔ سڑک پر افراتفری سی دکھائی دے رہی تھی۔ ابھی
ابھی شاید قطرے پڑنا شروع ہوئے تھے۔

ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا۔ اور اُس کے سارے جسم میں سرایت کر گیا۔
اُسے بھی تو ایسی ہی یخ منجمد کرنے والی ہواؤں، گھٹاؤں اور بارشوں
سے عشق تھا۔ ورنہ اس وقت کیفے میں دو تین ہی لوگ دکھائی دے رہے تھے۔
وہ بھی اندر ہال میں گھسے آگ کے قریب کرسیوں پر سرکڑے بیٹھے تھے۔

”ویٹر۔“ اُس نے سامنے سے آتے ویٹر کو قریب بلایا۔

مودب ویٹر مرعوب نظر آ رہا تھا۔

”بل لاؤ۔“ اُس نے کہا۔

”اد۔ کے سر۔“ اور ویٹر اندر کی طرف چل دیا۔

بارش زور پکڑ رہی تھی۔ نیچے سڑک پر پیدل چلنے والے مچھٹ گئے تھے۔ اکا دکا لوگ البتہ اب بھی چھتریاں سروں پر لٹکائے سکرٹے سیکڑتے چلے جا رہے تھے۔

اُس نے بل ادا کیا۔ رین کوٹ کی ٹوپی سر پر کھٹیک کی۔ اور نیچے تلے قدم رکھتا لکڑی کی سیڑھیاں اترتے نیچے آیا۔

جیب میں بیٹھا اور چل پڑا۔

آہستہ آہستہ وہ ہوٹل کی طرف جا رہا تھا۔

تبھی اس نے دُور سے دیکھا۔

وہیں۔ چند دن قبل والی جگہ پر سڑک کے کنارے ندین کھڑی

تھی۔ اُس نے فوراً پہچان لیا۔

آج اکیلی تھی۔ شاید اس کی دوست پہلے ہی جا چکی تھی۔ یا شاید آج

کالچ ہی نہیں آئی تھی۔ یا پھر وہ کالچ ہی میں رہ گئی تھی۔ بہر حال

وہ قریب آتا گیا۔

بارش اور آندھی کے زور سے وہ جیسے اپنا توازن کھوئے جا رہی تھی۔

وہ پاس آ کر رُک گیا۔

”آؤ۔ تم کو گھر ڈراپ کروں۔ دروازہ کھول کر اُس کی طرف بھاگے۔
 ہوئے وہ بارش میں بھیگی زرین سے اپنا بیٹا سے بولا۔
 ایک پل کو وہ زرین کو اس طوفانِ باد و باران میں رحمت کا
 فرشتہ نظر آیا۔ مگر۔ پھر۔

”میں بس سے چلی جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے جاؤ۔“ اُس کے لہجے میں غصہ کی جھلک تھی۔ اُدا سی تھی،
 تلخی تھی۔ مایوسی تھی۔ اُس نے گاڑی آگے بڑھا لی۔

اس غیر متوقع جواب پر زرین بارش و آندھی کے طوفان کو بھول
 بھال اُسے جاتے دیکھنے لگی۔

شان آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

کچھ باہر طوفان تھا۔ کچھ اُس کے اندر۔

قریبی موڑ کاٹتے ہوئے اُس نے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی دیو مر میں سے
 دیکھا۔۔۔ زی کے پاس ایک سفید کار کھڑی تھی۔

کوئی اُسے لفٹ دینے لگا تھا شاید۔ یا پھر وہی کچھ غصہ قبل والا
 واقعہ دہرایا جانے لگا تھا۔

غصہ کی شدت سے وہ پاگل ہوا کھا۔

اور کوئی پراہ کئے بغیر موڑ کاٹتے ہوئے نکل گیا۔ مگر۔ پھر۔

جانے کیسے؟ ایک شارٹ کٹ طے کرتا وہ دوبارہ اسی سڑک

پر نکل آیا۔

سفید کا ناہستہ آہستہ زرین کے پاس سے آگے رینگنے لگی تھی۔

”بیٹھو۔ ورنہ اتنا ماروں گا۔ کہ سارا زندگی یاد رکھے گا۔“ قریب پہنچے ہوئے اُس کے لئے دروازہ کھول کر اُس نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔

کتابیں ہاتھ میں لئے گھبرائی۔ یہی زرین بغیر کسی چوں و چراں کے جلدی سے جیب میں آ بیٹھی۔

”تم کو بہت شوق ہے کوئی موٹر بائیک پر یا کار پر اگر تہا اے سے ضرور بات کرے؟“ گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے وہ مزید جنگھاڑا۔

زرین نے مزید گھبرا کر، سہم کر اُس کی طرف دیکھا۔

”میں جب کہتا ہے بیٹھو۔ پھر تو نہیں بیٹھتے سو۔ اور وہ....“

”اُس کے ساتھ بھی تو نہیں بیٹھی۔“ وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔ اور

شان کو غصے میں کہی اپنی بات کی تصحیح پر اور بھی غصہ آگیا۔

”بیٹھ جاتے اُس کے پاس بھی۔“ اُس کے طنز اور تلخی پر زرین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولی کچھ نہیں۔

”تم۔ اپنے کو۔ اتنی اونچی کیوں سمجھتی ہے؟“ اُس کی چپ شاید اُسے اچھی نہ لگی۔ اور بھی۔ تلخی سے بولا۔

اور آنسو لڑاھک کر زری کے گالوں پر آ رہے۔

کیسا عجیب آدمی تھا۔ کھلائی بھی کرتا تھا۔ رُلاتا بھی تھا مڈی نے

نازک سی خوبصورت انگلیوں کی پلروں سے اپنے آنسو پونچھ لئے۔

شان نے منکھیوں سے دیکھا۔

اُسے ایک گونہ اطمینان ہوا۔ پتہ نہیں کیوں؟
 اور پھر۔ وہ چپ چاپ ڈرا بیٹھ کر رہ گیا۔
 "سوں" کر کے زرین نے ناک کھینچی۔ اور شان نے رخ پھیر کر ایک
 مرد پر نظر اُس پر ڈالی۔

کوٹ۔ کپڑے۔ جوتے تک سب بھیگے ہوئے تھے۔
 ڈارک براؤن بالوں کی ایک لٹ بھیگ کر سرخ گال سے
 پک گئی تھی۔

وہ واقعی بہت خوب صورت تھی۔
 "تم کو اکیلا گھومنے کا اتنا شوق کیوں ہے۔" لہجے کی تلخی اب کم
 گئی تھی۔ مگر انداز اب بھی وہی تھا۔

زی کو اچانک اپنی توہین کا احساس ہوا۔ سرخ سرخ آنکھوں
 سے اُس کو دیکھا۔

"میں گھوم نہیں رہی تھی۔ کالج آئی تھی۔
 اور شان چپ سا رہ گیا۔ نظریں سامنے سڑک پر جمادیں۔
 "کھٹیک ہے۔ لیکن جب میں بیٹھنے کو کہتا تھا تو آئی کیوں
 میں تھی۔؟"

عجیب زبردستی تھی۔ اگر وہ آ نہیں رہی تھی۔ تو اس میں اتنا بلا فروغ
 نے کیا ضرورت تھی۔

"میری مرضی۔" سامنے دیکھتے ہوئے وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"تم بہت RROUD ہے۔" وہ پھر تیز ہونے لگا۔

"ٹھیک ہوں۔" اُس کی اُردو اور پختون زرہ لہجے پر مٹکل ہنسی روکتی وہ اُس کے لہجے میں بولی۔

"اوہ۔" اُسے پھر سے غصہ آنے لگا۔ "تم۔ تم بہت سر بہ چڑھا ہے۔
زرین نے اُسے دیکھا۔

اور پھر پتہ نہیں کیوں وہ اپنی ہنسی نہ روک سکی۔
"تم ہنستا کیوں ہے۔؟" اور زرین کو مزید ہنسی آ گئی۔

اچھا آدمی تھا؟ بات بے بات پر غصہ ہو رہا تھا۔

شان نے اُس پر ایک گہری نظر ڈالی۔ اور پھر سامنے دیکھتے ہوئے
ڈرائیو کرتے لگا۔

"آپ مجھے یہاں میری دوست کے گھر چھوڑ دیں۔" وہی جگہ قریب
آ رہی تھی۔ جہاں کچھ غرصہ قبل اُس نے اُس کی دوست نسرین کو اتارا تھا۔
"NEVER" وہ جیسے بدکا۔

"کیوں۔؟" وہ خیرانگی سے اُسے دیکھنے لگی۔

"میرا مرضی۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

کچھ دیر قبل کی وہ تندی اب اُس کے چہرے پر نہیں رہی تھی۔
"نگر۔ میں آپ کی مرضی کی پابند نہیں ہوں۔"

"ہم دیکھتا ہے، کیسے نہیں ہو۔" وہ نسرین کا گھر دیکھے چھوڑتے ہوئے
سیدھا آگے نکل گیا۔

”مجھے ضروری نوٹس لینے تھے۔“

”کارڈ میں لیتے۔“

”آج وہ نہیں آئی تھی۔“

”I CAN'T HELP IT“ وہ لاپرواہی سے کندھے اُچکا کر بولا۔

اور زلی جزبہ ہو کر رہ گئی۔

”آپ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں؟“ وہ غصہ سے بولی۔

”سمجھتا ہوں - SO WHAT؟“

”آپ بہت PROUD ہیں۔“

شان نے چونک کر زلی کی طرف دیکھا۔

ایک پل کو غور سے اُس کی غصہ اُگلتی آنکھوں میں دیکھا۔

”دو PROUDS کا آپس میں دوستی ہو جائے تو کیسا ہے۔؟“

اچانک ہی اُس کا نازک سا نرم سا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لیتے ہوئے اُس نے ہولے سے کہا۔

اور۔ غصہ اور تیزی بھول کر۔ گہرا کر زلی نے اپنا ہاتھ واپس

کھینچ لیا۔ شان محفوظ ہوتے ہوئے سامنے دیکھنے لگا۔

”میم صاحب۔ تم نے ہمارا بات کا جواب نہیں دیا۔ قدرے توقف

کے بعد اُس نے پھر کہا۔

اور وہ پھر گہرا گئی۔ کیا جواب دیتی۔ رُخ کھڑکی کی طرف کرتے

ہوئے اُس کے پختون لہجے پر آئی مسکراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

ناصر بھائی سچ کہتے تھے۔ شان کو اردو بولتے کبھی سنو تو تم ہنسی نہ
 روک سکو۔ بچارا بہت مشکل سے بول لیتا ہے۔ مجھ سے بھی زیادہ تراپنی
 آسانی کے لئے انگلش میں بات کرتا ہے۔ میرا بھی یہی حال ہوتا اگر
 ابو کی رہائش گاہ مستقل گاؤں میں ہوتی۔ ماموں جان البتہ گزارا
 کر لیتے ہیں۔ ویسے ان کی انگلش سے میں بہت متاثر ہوں۔ بہت
 خوب صورت ACCENT ہے اُن کا.....“

”BY THE WAY MY DEAR“۔ تم کو نسا کلاس میں پڑھتی ہے؟
 شان ہی بولا تھا۔

”تھر ڈائیر میں“ رُخ اندر کی طرف کر کے نظریں اپنی کتابوں
 پر جماتے ہوئے اُس نے دھیرے سے جواب دیا۔
 ”SEE“ چند لمحے وہ چپ رہا۔

”اگر میں تم کو ہر دن گھر ڈراپ کروں گا۔ تو تمہارے بڑے تو ناراض
 نہیں ہوں گے؟“

ضرور ہوں گے۔“ زی نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے اُسی کے
 لہجے میں کہا۔

”اچھا“ وہ کچھ بھی سمجھ بغیر سنجیدگی سے بولا۔ تم کے گھر میں کون
 کون ہوتا ہے۔؟“

”میری امی اور میں۔“

”WHAT ABOUT YOUR FATHER“

”اُن کی DEATH ہو چکی ہے۔“

”اوہ۔ تمہارا بہن بھائی نہیں ہے؟“

”نہیں۔“ اُس کے لب دلہجے سے محفوظ ہوتی وہ سر نفی میں ہلا کر بولی۔

”ہوں۔ اس لئے تم بہت MEAN....“ اُس نے اپنے سر کو

چھوتے ہوئے کہا۔ ”سر پر چڑھا ہے۔“

”میں سر چڑھی نہیں ہوں۔ آپ۔ آپ سر چڑھے ہیں۔“ جانے

کیے کہہ گئی وہ۔ انداز میں شکوے کی ٹھٹھک نمایاں تھی۔

”ایم۔ سوری۔ اگر میں نے تم کو HURT کیا ہے۔“ سامنے دیکھتے

ہوئے وہ متاسف سا بولا۔ ”ویسے میں براؤڈ بالکل نہیں ہوں۔“

لوگ غلط اندازہ کرتا ہے۔“

اور زری۔ پھر۔ اُس کے لب دلہجے پر سگرائے بنا نہ رہ سکی۔

جانے کیا بات تھی؟ خالصتاً اپنے مادری لہجے میں الٹی سیدھی

اُردو اُسے معصوم بنائے دے رہی تھی۔

”ناصر مجھ سے بہت اچھا واقف ہے۔“ وہ مزید بولا۔

”ناصر۔ ک۔ ک۔“ اور وہ فوراً چپ ہو گئی۔

”ناصر۔ میرا کزن۔“ وہ جو.... وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُس کی

طرف دیکھنے لگا۔ اور زری کا رنگ بدل سا گیا۔

اُسے اپنی طرف دیکھتے پا کر شاید وہ افتائے راز کھانڈیشہ سے

گھبرا گئی تھی۔

”میرا یار ہے۔“ اُس نے کہا۔

”اچھا۔ وہ سبھل کر بولی۔

”ہاں۔ جیسے تمہارا یار نسرین ہے۔“

اور وہ خوبصورتی سے سنیں دی۔

”کیوں۔؟“ اُس نے اپنائیت سے ہاتھ کی پشت سے اُس کا چہرہ چھوا۔

”دلچسپ ہے۔“ وہ مزید سنیں دی۔

”تم ہمارا اردو پر سنہتی ہے۔ ہے نا۔؟“

اور زی کھلکھلا کر سنیں دی۔

”کیا کرے میم۔ فارن لینگویج جو ہے۔“ وہ بھی مسکرانے لگا۔

”ہمارا تو یہ ہے۔“ اُس نے جبرے کو ہاتھ لگایا۔ ”JAWS دُکھنے

لگا بولتے بولتے۔ اور تم۔ تمہارا زبان بہت مشکل ہے۔ اُس نے

معصوم سی بے بسی سے کہا۔

اور زی کو وہ اس سمے بہت اچھا لگا۔

وہ ہنستے ہوئے ڈرائیو کرنے لگا۔

زی کا گھر قریب آنے لگا تھا۔

”میں کل ادھر ہوں۔ تم کو گھر کو لانے کو کالج آئے گا۔“ اُس نے ہرے

سے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے اپنائیت سے کہا۔

”ہنیں۔ آپ تکلیف نہیں کریں۔ میں خود ہی آجاؤں گی۔ زی نے

ہاتھ چھڑاتے ہوئے گھبرا کر کہا۔

روز روز ایسا ہونا اچھی بات نہیں تھی۔

ایک سایہ سا شان کے پُرکشش چہرے پر لہرا گیا۔
 "کتنے بچے چھٹی ہوتا ہے۔؟ جیب اُس کے دروازے کے آگے
 روکتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

"دو بچے۔" کتاب میں ہاتھ میں لے کر وہ اترنے لگی۔

"میں آؤں گا۔" اُس کے لہجے میں عزم تھا۔

"شکریہ۔" اُن سُنی کرتے ہوئے زی نے اُس کا گھر پہنچانے کے

لئے شکریہ ادا کیا۔

"ہائے۔" شان بولا

"ہائے۔" زی نے کہا اور۔ گھرائی سی گھر کے اندر داخل ہو گئی۔

رات ہوتے ہوتے زرین کو بخار نے آیا۔

گھنٹہ پھر تیز بارش اور آندھلی میں کھڑے رہنے کے باعث اتنا

تو ہونا تھا۔

کل ہی اُس کی اتنی نے سامان نے گھر بھجوا دیا تھا۔ ضرورت کی دو

چار چیزیں ہی رہتی تھیں۔ آج خیال تھا زی کالج سے لوٹے گی تو یہ چیزیں

بھی تانگے میں رکھ کر نئے گھر شفٹ ہو جائیں گے۔

مگر زرین کے گھر پہنچتے پہنچتے ہی چار رنگ گئے تھے۔ پھر کیڑے بدلتے

کھانا کھانے میں ہوتے ہوتے گھنٹہ بھر ادرا لگ گیا۔

شام ہونے کو تھی۔ اتنی نے نئے گھر میں دن کے اس لمحے منتقل
ہونا مناسب نہ سمجھا۔

کچھ زرین کی بھی طبیعت سست تھی۔ ہمت ہی نہیں پڑ رہی
تھی۔ گو کہ نئے گھر میں جانے کی خوشی اُسے کتنے دنوں سے بے قرار
کئے ہوئے تھی۔

سر شام ہی وہ بستر میں گھس گئی۔

”بیٹے۔ تاجر کو نئے گھر میں جانے کا خط آج ہی ڈال دو۔ نیا پتہ
بھی لکھ دینا۔ پریشان ہو رہا ہو گا۔“

”اچھا امی۔ لکھ دوں گی۔ سر میں درد ہے اس وقت تو۔“

اور اتنی نے دودھ گرم کر کے گلاس میں لا دیا۔

”لو بیٹی! یہ گولی دودھ کے ساتھ لے لو۔ ٹھنڈ لگ گئی ہے
شاید۔“ مسہری کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے انھوں نے شفقت سے اس کے
سر پر ہاتھ پھیرا۔

”ٹھنڈ۔ جیسی ٹھنڈ۔ اس وقت بھی ناصر کھانہ کا کزن آکر نہ لاتا تو
کھڑی ہی رہتی اسٹاپ پر۔“

”وہ لے کر آیا ہے۔“ اتنی نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں اتنی۔ وہ ادھر ہی ہے۔ شاید کسی کام سے آیا ہوا ہے۔
آج کالج کے پاس سے گزر رہا تھا۔ میں بارش میں کھڑی تھی تو
لفٹ دے دی۔“

”اچھا۔“ وہ کچھ متفکر سی بولیں۔ بیٹا کسی اور کے ساتھ بغیر سوچے
سمجھے نہ بیٹھ جانا۔“

”پہلے کسی کے ساتھ بیٹھی ہوں اتنی۔ ناصر کھائی کا رشتہ دار تھا۔
اس لئے آگئی۔ ورنہ....“

”وہ تو ہے۔ مگر۔ ناصر کے بارے میں تو کچھ نہیں کہتا تھا۔
”نہیں تو۔“ زرین نے کہا۔

”تمہ نے تو کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔“

”نہیں۔ اب میں اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں۔ جس بات کو
آپ چھپانا چاہتی ہیں۔ وہی کروں گی جاکے۔“ وہ دودھ ختم کیے
گلاس سرمانے رکھی تپائی پر رکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔ ناصر نے ویسے بھی لکھا ہے کہ وہ خود ہی سب ٹھیک
کرنے کی کوشش کرے گا۔ آہستہ آہستہ۔“
اتنی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ادر پھر۔ رات ہوتے ہوتے اُسے تیز بخار چڑھ گیا۔
صبح وہ کالج بھی نہ جاسکی۔ ناشتہ کے بعد اتنی نے بخار اتارنے

دالی گولی دودھ کے ساتھ کھلائی۔ اور خود مختصر سامان اکٹھا کرنے لگیں۔

دس بجتے بجتے اس کا بخارا ترچکا تھا۔ نقابہت تھی۔ مگر نئے گھر کی خوشی میں سب بھول بھال وہ اتنی کے ساتھ بمعہ سامان کے تانگے میں جا بیٹھے۔

نیا گھر بہت پیارا تھا۔
دو بیڈ روم کی خوبصورت سی انیکسی تھی۔ دو ہی باتھ روم۔
کچن۔ اور ڈرائینگ ڈائننگ اکٹھے تھے۔
زی اپنا بخارا بھول بھال اُسے چوکیدار کی مدد سے صاف کرانے اور پیٹ کرنے میں لگ گئی۔
تھوڑا سا تو سامان ہی تھا۔ دوپہر تک کسی نہ کسی طرح لگا ہی لیا۔

اتنی اور زی کا اکٹھا بیڈ روم تھا۔ دوسرا صر کے لئے ٹھیک کرایا۔

ڈرائینگ روم میں دو چار دن قبل کا خریدا سیکنڈ ہینڈ سادہ سا صوفہ رکھا۔ اسی طرح ڈائننگ روم میں میز کرسیاں لگائیں۔ اور صر کے لئے خریدا بیڈ اُس کے بیڈ روم میں ڈال دیا۔

اور پھر۔ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد چوکیدار نے گھر کی مزید صفائی کی۔ تو چھوٹا سایہ خوبصورت گھر نکھارنے سے چمکا اٹھا۔

شام کو زی کو دوبارہ بخار نے آلیا۔ اتنی پریشان تھیں۔ اُس کی ذرا سی تکلیف سے وہ بے چین ہو جاتی تھیں۔ انہوں نے چوکیدار کو ڈاکٹر کے پاس بھگایا۔ اور جب تک وہ دوا لے کر آتا۔ زی کو پھر بخار کی دوا دے دی۔

اور۔ بستر میں گھسی بخار کی شدت سے بے تاب زی کو جانے کیوں شان کا خیال آ گیا۔

آج وہ دو تین بجے کے قریب حب سابق کالج اسٹاپ پر آیا ہوگا۔ زی کا تو ویسے بھی اُس کے ساتھ آنے کا ارادہ نہ تھا۔ مگر اُس نے اُس کو وہاں موجود نہ پا کر ضرور سوچا ہوگا کہ اُس نے جان بوجھ کا ایسا کیا ہے۔

معا اُس کی نظروں میں اُس کا پرکشش چہرہ گھوم گیا۔ اُس پر تاریک سائے لرزتے دیکھے۔ اور۔ پھر اُسے غصہ میں دیکھا۔

”تم۔ اپنے کو۔ اتنی اونچی کیوں سمجھتی ہے۔؟“ غصہ میں سمجھناشان اُردو میں بمشکل لفظ جوڑ جوڑ کر بولا تھا۔ اور۔ بخار میں تپتی زی بے اختیار ہنس دی۔

مگر پھر۔ باوجود اُس کے ساتھ گھر تک نہ آنے کے ارادے کے۔
اس وقت اُسے انوس ہوا۔

بقول اُس کے خود "فارن لینگوئج" کے لفظ بمشکل جوڑتا۔
ایک ایک کر ادا کرتا۔ پھر کچھ خفیف سا مسکراتا۔ وہ کتنا معصوم
لگتا تھا بے ضرر سا۔ سادہ سا۔!
اکھڑا۔ مغرور سا۔

"دو PROUDS کا آپس میں دوستی ہو جائے تو کیسا ہے؟"
اُس کی آواز کی بازگشت۔

کانوں میں پڑتے ہی وہ چونکی۔
اور پھر۔ نہ چاہتے ہوئے بھی، وہ اُسی کے متعلق سوچتی رہی۔

وہ مقررہ وقت پر وہاں گیا۔ مگر زی نہیں تھی۔
 کالج کی تو چھٹی ہو چکی تھی۔ پھر؟ اُسے مایوسی سی ہوئی۔ آگے
 زرتے ہوئے وہ چھوٹے سے بازار کا ایک اور چکر کاٹتے ہوئے پھر
 اسی طرف آنکلا۔

دور سے اُس نے دیکھا نسرین اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ اکیلی ہی۔
 مزید مایوسیوں نے اُن گھیرا۔
 کافی دور سے ایک بس آرہی تھی۔ نسرین کے پاس آکر ڈکی۔ تو وہ
 جلدی سے جا بیٹھی۔ وہ پھر وہاں سے گزرا۔ آہستہ آہستہ۔ مگر کوئی اُٹار نہ
 تھے زی کے۔ گول چکر کاٹتے ہوئے وہ تیسری بار وہاں سے گزرا۔
 اور پھر۔ سیدھا ہوٹل چلا گیا۔

زی نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔ یا تو جان بوجھ کر وقت سے پہلے
 ہی گھر چلی گئی تھی۔ یا پھر جان بوجھ کر گھر سے کالج ہی نہ آئی تھی۔ یقیناً اُس
 سبب کے لئے۔ اُس نے جان بوجھ کر اُسے AVOID کیا تھا۔

کل صبح کے بجائے اُس نے ابھی ابھی جیب میں ساٹھان ڈلوایا اور
واپس پہاڑ پر جانے کے روانہ ہو گیا۔

تمام راستہ اُس کا ذہن غصہ سے بھٹاتا رہا۔

واپس پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ سخت ذہنی تناؤ کے بعد اس وقت
وہ تھکا تھکا۔ مضمحل ہوا سا تھا۔

کپڑے تبدیل کئے۔ نرم و گرم بستر میں گھسا۔ تو قدرے سکون احساس
ہوا۔ اُداسی البتہ اب بھی پُرکشش چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔

”کھانا نہیں لاؤں صاحب؟“ ناظم نے آکر پوچھا۔

”کھانا نہیں۔ کیک کا ایک پیس اور کافی۔“ اُس نے بیدھے ہوتے
ہوئے نرم نرم تکیوں سے بستر کی پشت سے ٹیک لگالی۔

گرم اسٹرونگ کوئی پی۔ تو جیسے ساری تھکن دور ہو گئی اُداسی
بھی معدوم ہونے لگی۔ اور پھر۔ فون پر وہ دیر تک بابا جان سے کنٹرکشن
سے متعلق اہم باتیں کرتا رہا۔

رات کو کئی کروٹیں بدلنے کے بعد وہ سو گیا۔

اگلے دن۔ سارا کام کر داتا اور کرتا رہا۔

موسم اب بہتر ہو رہا تھا۔ تعمیر کا کام چند دنوں میں شروع کر دینے کا
سوچتے ہوئے اُس نے گاؤں جانے کا پروگرام بنالیا۔

چند دن گاؤں میں رہا۔

موسم اب بہتر ہو رہا تھا۔ گندم کی فصل سنہری ہو رہی تھی۔ مزارعوں
کی مصروفیت بڑھ گئی تھی۔

اُسے گاؤں میں رہ کر سکون کا احساس ہو رہا تھا۔

مدتوں بعد۔ کیا جانے کیا ہوا تھا۔ شان نے دل کھول کر ماما سے گپ
پپ کی تھی۔ کتنی ہی دیر اُن کے پاس بیٹھ کر کتنی ساری باتیں کی تھیں۔
یہ نہیں تھا کہ وہ واقعی ہی مغرور تھا۔ یا پھر اُس کی تربیت ایسی کی گئی
تھی کہ اُسے ماما کے پاس بھی بیٹھ کر کھل کر بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ بلکہ حالانکہ
ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے۔ منہ کی مانند کہ اُسے موقع ہی نہ ملتا گاؤں میں سکون
سے بیٹھ کر۔ ماما سے سکون سے بات کرنے کا۔

وہ چھوٹا سا ہی تھا کہ اتنی فوٹ ہو گئی تھیں۔ اور پھر ماما نے ہی اُس کی
پرورش کی تھی۔ بابا جان نے بے شک کہ ملا اور باپ دونوں بن کر اس کی تربیت
کی تھی۔ مگر اُس کی پرورش میں ماما کا بھی پورا پورا ہاتھ تھا۔

"شان بیٹے۔ اب تو اس سونے سونے گھر میں بہو آئی ہی چاہئے۔"
ماما کی زبان پر اُن کی دیرینہ آرزو آج مچل ہی تو گئی۔

"اوہ۔ ہاں ماما۔ اب تو واقعی آنا چاہئے۔" سر پر کھسکا سفید ملل کا
دوپٹہ اُن کے سر پر ٹھیک سے اوڑھاتے ہوئے وہ خوشگواہی سے بولا۔

"سچ کہتے ہو بیٹا۔؟" ماما نے تصدیق چاہی۔ وہ جو آج تک اس
موضوع کو ٹالتا آیا تھا۔ حیرانگی کی تو بات تھی۔
"ہاں۔ اُس کے لہجے میں شرارت تھی۔

"تو پھر کروں بات۔ بڑے صاحب سے۔؟"
"ہوہ۔ نہیں ماما۔" اُس نے گہرا کر کان چھوئے۔

”کیوں نہیں۔ وہ بھی فکر مند رہتے ہیں اسی خیال سے۔ یہی تو عمر ہے
 بوڑھے ہو کر تو کوئی شادی نہیں کرتا۔
 ”مگر۔ ماما.....“

”کیا۔؟“ اکھنوں نے پوچھا۔
 ”مجھ کو کوئی لڑکی اچھا تو لگے نا۔“ اور اُسے زری کا خیال آگیا۔
 بات کرتے کرتے اُداس ہو گیا۔
 ”بڑے صاحب تو ابھی پچھلے دنوں بھی کسی گھرانے کی بات کر رہے تھے۔ کہتے
 تھے گھرانہ تو اچھا ہے۔ مگر لڑکی بہت۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ سوئی سوڑن ہے۔“
 اور۔ شان نے جاندار قبضہ لگا لیا۔
 ”سوڈرن۔ ماما سوڈرن۔“ اُس نے تصحیح کر دی۔

”ہاں وہی۔“ ماما نے کہا۔
 ”پھر۔؟“ شان نے سوال کیا۔
 ”بس انھیں پسند نہ آئی۔ تمہیں معلوم ہے بڑے صاحب کی طبیعت۔“
 ”تو پھر ماما اب ہم کیا کر سکتا ہے۔“
 ”تو بیٹا۔ تم خود کوئی لڑکی پسند کر دنا۔ یوں بیٹھے تو نہیں رہو گے۔
 دو بچوں کے باپ ہوتے۔ وقت پر شادی کی ہوتی تو۔“
 اور پھر شان زور سے سنسن دیا۔
 ”اب شان بوڑھا ہو گیا ہے ماما۔“

”اے خدا نہ کرے میرا بچہ بوڑھا ہو۔ مگر اپنے صاحب کا پتہ ہے

کتنی عمر میں شادی کی تھی۔

"کتنا عمر تھا۔؟" اُسے ماما کی باتوں میں مزا آ رہا تھا۔

"مشکل سے اٹھارہ سال کے ہوں گے۔"

"اچھا۔ اُس نے مصنوعی حیرانگی سے پوچھا۔

"بس۔ اب اور زیادہ مذاق میں مت ٹالو۔ پورا گھر۔ پورا گاؤں

اُس دگائے بیٹھا ہے۔

"اور کے ماما۔ اب ضرور سوچے گا اس بارے میں۔

رات سونے سے قبل بابا جان کا فون آ گیا۔ ابھی بنٹام کوستان نے

خود انھیں اپنے گاؤں میں آنے کی اطلاع دی تھی۔ کافی دیر تک مختلف

موضوعات پر تبادلہ خیال بھی کیا تھا۔ مگر شاید کوئی فردری کام پیش آ گیا تھا۔

اور پھر اُس کا اندازہ درست نکلا۔

جس پلاٹ پر کنٹرکشن ہونے والی تھی۔ اُس کے ڈھلان والی رُخ پر

زمین کے سابق مالک سے ایک اور شخص کا تنازعہ نکل آیا تھا۔ دونوں وہیں

نیچے شہر کے رہنے والے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر قبل وہ شخص بابا جان سے

ملا تھا۔ شان سے اس وقت وہی مسئلہ موضوع گفتگو تھا۔ کام شروع

کروانے سے قبل مذکورہ اشخاص سے شان کا بنات خود ملنا اور کوئی

کسلی بخش تھنیدہ کر لینا فردری تھا۔

"وہاں جا کر کسی موزوں جگہ پر اُن لوگوں کی میٹنگ بلاؤ۔ IT IS A MUST"

"لو کے بابا جان - DON'T WORRY - میں سب کھٹیک کر لوں گا۔

کل ہی روانہ ہو جاؤں گا۔

اور پھر اگلے دن۔ پہاڑ پہ پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ سونے کی
کوشش کی۔ مگر بار بار آنکھ کھل جاتی۔ سکون سے سو ہی نہیں سکا۔
صبح شہر جانے کا خیال آیا۔ تو نیند ہی اڑ گئی۔ زی ایک بار پھر
اُس کے تھوڑے میں اُبھر آئی۔

اُسے واقعی زی اچھی لگنے لگی تھی۔
اس سے قبل وہ کئی لڑکیوں سے مل چکا تھا۔ متاثر بھی ہوا تھا۔
مگر صرف اُن کی خوبیوں سے۔

کوئی اگر خوب صورت تھی تو اُسے تو صیفی نظروں سے دیکھتا۔ کوئی
نیک سیرت تھی۔ تو بھی دل میں سراہا تھا۔ اور بس۔
مگر۔ عجیب سی بات تھی اب کی بار تو۔

زی خوبصورت تھی۔ مگر اُس کی خوبصورتی اُسے کھینچتی تھی۔ جیسے اپنی
طرف۔ نیک سیرت تھی تو اُس کی سیرت اُس کے دل کو چھوتی تھی۔ جیسے
جا کر۔ اور پھر۔ کچھ اور بھی تھا۔

اس میں خود داری تھی۔ اُس کے ساتھ ساتھ اکھڑی تھی۔
اور شاید۔ یہی وہ چیزیں تھیں۔ جو شان کو کھانے لگی تھیں۔
وہ پہلی ہی ملاقات میں اُس کے پاس خود نہیں آئی تھی۔
بلکہ تب تو اُس نے شان سے بیزاری کا اظہار کیا تھا

اور پھر۔ جب اتفاقاً وہ بار بار سرِ راہ ملنے بھی لگی۔
تو اپنی خود داری ہاتھ سے جانے نہیں دی۔

اُسے شاید پسند بھی کرنے لگی تھی۔ مگر جھکنا نہیں جانتی تھی۔
ایک معمولی گھرانے کی لڑکی تھی۔ مگر اپنی آن رکھنا جانتی تھی۔
”ٹنگ.... ٹنگ.... ہال میں لگے کلاک کی آواز تھی۔

ہاتھ بڑھا کر اُس نے لیمپ آن کیا۔ گھڑی دیکھی صبح کے پانچ بج رہے
تھے۔ وہ بستر سے نکلا۔ ہاتھ روم گیا۔ اور نماز کی تیاری کرنے لگا۔
نماز پڑھی۔ فارغ ہو کر دوبارہ بستر کی طرف بڑھا ہی تھا
کہ ناظم بیڈ ٹی لے کر حاضر ہوا۔
”سلام چھوٹے صاحب“

”سلام“ اُس نے جواب دیا۔

ناظم نے ٹرے میز پر بستر کے قریب لگادی اور خود انگیٹھی میں بڑی
بڑی لکڑیاں جاکر اُن میں آگ سلگادی۔

شان نے گرم گرم چائے کا گھونٹ حلق سے اُتارا تو طمانیت کا
احساس ہوا۔ بیڈ ٹی میں دیر وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

”صاحب۔ رات نیچے شہر سے جہان عالم صاحب کا فون آیا تھا۔
آپ سے خود بات کرنا چاہتے تھے۔ مگر آپ تھکے ہوئے تھے۔ میں نے بے آرام
کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ پیغام دینے کا کہہ دیا اُن کو۔ کہتے تھے اُن کے
بیٹے کی شادی پر آپ نہیں جاسکے تھے۔ کل جمعہ کو ولیمہ ہے۔ آپ ضرور

آئیے گا۔ ورنہ وہ خفا ہوں گے۔

”ہوں۔“

آج شہر تو جانا ہی تھا۔ کل ولیمہ بھی ایٹنڈ کرے گا اُس نے سوچا۔
بابا جان شاذ ہی ایسے موقعوں کے لئے وقت نکال سکتے تھے۔ یہ
کام بھی شان کو ہی کرنے پڑتے تھے۔

ناظم خالی برتن اٹھا کر چلا گیا تھا۔ شان کو پھر سوچوں نے
آن بگھرا۔ کون تھی زرین؟ اچانک اُسے خیال آیا۔
اگر وہ اس کا ذکر بابا جان سے کر دے تو کیا وہ مان جائیں گے؟
اور پھر اُسے سنسی بھی آئی۔
اتنی جلدی۔ اتنا آگے سوچنا۔

جب کہ اُسے یہ بھی اچھی طرح نہیں معلوم تھا کہ آیا زرین بھی اُسے
پسند کرتی تھی یا نہیں۔

اگر اشاروں کنایوں کی کوئی زبان تھی تو پھر زرین بھی اُسے اچھا
سمجھتی تھی۔ اُسے دیکھ کر بلیش بھی ہو جاتی تھی۔ پلکیں گرنے، اٹھنے لگتی
تھیں۔ وہ اُسے چھوڑ کر سرین کو گھر ڈراپ کرنے چل پڑا تھا۔ تو وہ
 واضح طور پر ہل گئی تھی۔ لیکن اگر۔

اُس کی باتوں پر غور کیا جاتا۔ تو ایسی کوئی قابل توجہ بات ہاتھ نہیں
آئی تھی۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا کہ وہ بھی اُسے پسند کرتی تھی۔

اور پھر۔ شان نے اُسے اگلے دن گھر ڈراپ کرنے کو کہا تو منع کر گئی

تھی۔ شاید اپنے گھر والوں کا لحاظ تھا۔
 مگر پھر۔ اگلے دن آنی ہی نہیں۔ اگر تھوڑا بھی اس کا خیال ہوتا
 تو۔ آتی تو سہی۔ ! وہ پھر سے دکھی ہو گیا۔
 اور پھر وہ الجھ گیا اپنے آپ سے۔ اُسے کیا ہو گیا تھا۔
 ایک عام سی لڑکی کے لئے اپنی سوچیں فضول گنوانے لگا تھا۔
 مگر۔ کیا وہ۔ عام سی لڑکی تھی۔؟
 وہ تو عام سے ہٹ کر تھی۔ دل نے سرگوشی کی۔
 جی بھی تو وہ بے چین سا تھا۔ بے قرار سا تھا۔
 ان دکھی سی چہن محسوس کرتا تھا۔ اپنے پہلو میں۔
 بے نام سی خلش کا احساس رہتا تھا دل میں۔ اور پھر۔
 وہ آنی کیوں نہیں؟ اُسے اتنا ہی گیا گزرا سمجھتی تھی۔ اُسے
 اچانک اپنی توہین کا احساس ہوا۔
 اُس پر۔ غصہ آنے لگا۔ بے طرح۔ بے تحاشہ۔
 اور پھر۔ اُس نے فیصلہ کر لیا۔
 شہر جا کر اُس سے مٹ بیٹھ سوتی بھی تو کوئی لفظ نہیں کرائے گا۔

”اللہ۔ دیر ہو گئی ہے۔ بس کمبخت نظر ہی نہیں آتی۔“ نسرین نے گھڑی دیکھ کر جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

وہ لوگ گھنٹہ بھر سے کالج کے نزدیک، بس اسٹاپ پر گھڑی بس کے آنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ بسیں آئی بھی تھیں۔ مگر کھنچا کھنچ بھری ہوئی۔ رُکے بغیر ہی سامنے سے گزر گئیں۔ کھڑے کھڑے اُس کی ٹانگیں جواب دینے لگی تھیں۔

”روز یہی ہوتا ہے۔ مصیبت...“ زی بھی بڑ بڑائی۔

دُور دُور تک بس کا پتہ نہیں تھا۔

”پتہ نہیں۔ وہ ذیشان پھر نظر نہیں آیا۔“ اس مصیبت کے موقع

پر اچانک نسرین کو ذیشان یاد آ گیا۔

ایک بار اسی طرح کھڑے کھڑے جب ہمت جواب دینے لگی تھی تو اُس نے اچانک آکر لفٹ دینے کی پیش کش کر دی تھی۔

زرین کا رنگ بدل سا گیا۔

اُس کے پھر نہ آنے سے تو وہ خود بھی پریشان تھی۔

پتہ نہیں کیوں؟

”جہانے کون لوگ ہیں۔ دیے ہیں بہت شریف۔“ نسرین نے اُس کا

توٹس لئے بغیر پھر کہا۔ ”دیے زی تم کیوں نہیں بیٹھ رہی تھیں۔ جیب وہ

ہمیں گھر چھوڑنے کو کہہ رہا تھا۔ اس دن؟“

”بس یو نہی۔ اب ہر بار ضروری تھوڑی ہے کہ بیٹھا جلتے۔“

اُس نے لا پرواہی سے جواب دیا۔

”دیے لگتا شریف ہے۔ ہمیں کوئی غلط رائے قائم نہیں کرنی

چاہئے۔“ نسرین نے کہا۔

”ہوں۔“ زی دھیرے سے بولی۔

اور ابھی۔ دور فاصلے پر فاصلے پر ایک جیب آتی دکھائی دی

”اوہ۔ خدا کرے ذیشان ہو۔ اور ہمیں گھر چھوڑ آئے۔“ نسرین

خوش ہوتے ہوئے بولی۔

زی کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا۔

اتنے ڈھیر سارے دن بعد۔

شاید وہی تھا۔

اور زی کو واضح طور پر احساس ہوا۔

وہ اتنے ڈھیر سارے دن اُس کی منتظر رہی تھی۔ اُس کی راہ دیکھی تھی۔

چاہا تھا کہ وہ آئے۔ اُسے ملے۔

”پتہ نہیں کون کبھی تھا۔ دھول ہی اڑا کر چلا گیا۔“ نسرین
زی کے دلی جذبات سے بے خبر مایوس انداز میں آگے بڑھتی جیپ کو
دیکھتے ہوئے بولی۔

اور زی کے۔ خوبصورت چہرے پر تاریک سائے گھر آئے۔

کہاں چلا گیا تھا وہ؟ اُس نے اُداسی سے سوچا۔

گھر پہنچ کر اُس نے کپڑے تبدیل کئے۔ اور کھانا کھائے بغیر ہی بستر
میں جا گھسی۔

زی کھانا کیوں نہیں کھایا۔؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ اتنی
پاس آتے ہوئے تشویشناک لہجے میں بولیں۔

”ٹھیک ہوں اتنی۔ آپ بلا وجہ فکر مند ہو جاتی ہیں۔“
”تو پھر کھانا کیوں نہیں کھایا۔“

”بس دل نہیں کر رہا۔“ اُس نے کہا۔

”دونو اے ہی کھا لیتیں۔ مٹریچہ پکایا ہے۔“ انہوں نے اُس کی
پسندیدہ ڈش کی لالچ دی۔

”نہیں اتنی۔ رات کو کھالوں گی۔“ اُس نے رضائی پھر سر
تک کھینچ لی۔

”جیسے تمہاری مرضی۔“ اتنی اپنے کام میں لگ گئیں۔

اور زرین۔ اپنے سے اُلجھ پڑی۔

کیوں۔ وہ ایک سائے کے نیچے کھاگ رہی تھی۔

وہ ایک مغرور شخص۔

کسی لڑکی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔

اور وہ۔ خواہ مخواہ اُس کے لئے اُداس ہو رہی تھی۔

”دو PROUDS کا آپس میں دوستی ہو جائے تو کیسا ہے؟“

اُس نے کہا تھا۔

مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ اُسے پیار بھی کرنے لگا تھا۔

پیار۔؟ وہ چونک پڑی۔

کیا وہ اُس سے پیار کرنے لگی تھی۔؟

اوہ۔ اُس نے سر ہٹا م لیا۔

اتنی بے چین۔ اتنی بے قرار

اُداس اور مُرجھائی ہوئی وہ اس لئے رہنے لگی تھی

کہ وہ اُس کو چاہنے لگی تھی۔

گھبرا کر۔ اُس نے لحاف منہ سے ہٹا یا۔ اور اُٹھ کر اتنی کے

پاس آ بیٹھی۔

وہاں بھی دل نہ لگا۔ تو باہر چھوٹے سے لان میں نکل آئی۔

”کیا کرے سیم۔ فارن لینگوئج ہے نا۔۔۔“ نل سے پانی بھرتے پھٹان

جو کیدار کو دیکھتے ہی اُس کے کانوں میں جیسے کسی نے کہا۔

اور۔ تھک کر وہ اندرا آگئی۔

اپنے بیڈ روم میں۔ پھر باتھ روم میں۔

چہرے پر پانی کے چھینٹے ڈالے۔ تو لیے سے خشک کرنے لگی۔ تو سامنے
شیٹے میں اپنے چہرے پر نظر پڑ گئی۔

کتنی اُداس اُداس تھیں اُس کی آنکھیں۔ بدلیاں منڈ لائیں۔

اُس نے۔ پلکیں جھپک کر پار دیکھنے کی کوشش کی تو۔

گھٹکھور گھٹائییں برس پڑیں۔

”زی۔“ یکایک اتنی کی آواز آئی۔

”جی اتنی۔“ اُس نے جلدی سے آنکھیں رگڑیں۔

”اپنا سوٹ تو دیکھو۔ آج درزی سے لے کر آئی ہوں۔“ اُسے آتے

دیکھ کر اتنی نے لفافے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کرسی پر سوٹ پھیلا کر وہ جلدی سے اس پر جھک آئی۔ مبادا

اتنی کی نظر، اُس کی آنکھوں پر پڑ جائے۔

”کل جانِ عالم صاحب کے بیٹے کا ولیمہ ہے نا۔ سوچا اُس

میں پہن لوں گی۔“

”کون سے جانِ عالم صاحب؟“ وہ بے دھیانی میں بولی۔

”ارے وہی یہاں کے ٹھیکیدار۔ کچھلے جمبہ بیٹے کی شادی ہوئی تھی۔ اس

جمبہ کو ولیمہ دے رہے ہیں۔“

”ہوں۔“ قمیض کو الٹے پلٹے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔

اتنی۔ زی۔ نسرین اور اس کی اتنی۔ ٹھیکیدار جانِ عالم کے گیٹ
کے اندر داخل ہوئیں۔

باہر مردانہ سائید پر گاڑیاں ہی گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔
قدرے فاصلے پر بیرونی لان میں شامیانوں کے تلے کرسیوں پر
بیٹھے اُن گنت ہرمان نظر آرہے تھے۔
عورتیں البتہ اندرونی دروازے سے گھر کے اندر داخل ہو
رہی تھیں۔

”زی۔“ نسرین نے اچانک سرکوشی کی۔ ”ذیشان کی گاڑی
بھی کھڑی ہے۔“

”ہوگی۔“ زی نے لاپرواہی سے کہا۔

”وہ دیکھو۔ وہی بھر ہے۔“

اور۔ زی نے دیکھا۔ واقعی اُسی کی گاڑی تھی۔

دل ایک بار پھر۔ زور سے دھڑکا۔

اور پھر۔ وہ نسرین کے ساتھ اندرونی دروازے میں

داخل ہو گئی۔

تمام وقت وہ ایک انجانی سی خوشی محسوس کر رہی تھی۔

گو کہ دل کبھی کبھی کسی انجانے ہی فحشے سے ڈک ڈک سا جاتا۔

رنگ برنگے آنچل لہرا رہے تھے۔ عورتیں خوش گیتوں میں مصروف

تھیں۔ پھر کھانا لگایا گیا۔ لیڈیز نے یہاں بھی خاصی مستعدی دکھائی۔

فنکشن ختم ہو چکا تھا۔ کئی جہان جا چکے تھے۔

زرین اور نسرین کی اتنی نے بھی بیگم جان عالم سے اجازت لی۔
اندیہ لوگ بھی باہر نکل آئیں۔

جان عالم صاحب۔ شان سے مصافحہ کرتے ہوئے اُس کے
ساتھ اُس کی گاڑی تک آئے۔

وہ گاڑی میں بیٹھنے لگا۔ تو نظریں غیر ارادی طور پر اندر کی
طرف سے آتی خواتین کی ٹولی پر پڑیں۔

ایک پل کو اُس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔
اُس نے زرین کو دیکھا۔

ڈھیر سارے دنوں کے بعد۔

ارکارلٹ۔ ریڈڈریس میں کتنی پُرکشش لگ رہی تھی۔

مگر پھر۔ اُس کی آنکھوں کی چمک بجھ گئی۔

گاڑی میں بیٹھا۔

جان عالم صاحب کو "خدا حافظ" کہا۔

اور تیزی سے گیٹ کی طرف مڑ گیا۔

رات اُس نے کر دٹیں بدل بدل کر بے چینی سے گزار دی۔ کیا ہو گیا
 تھا اُسے۔؟ وہ جھنجھلا جھنجھلا اُٹھا۔
 کسی لڑکی سے معاشرہ ہونا اتنا کہ انسان اپنی ممد مدد ہی کو بھیجے۔
 اس چیز پر وہ یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔
 جی بھی۔ شاید۔ اس وقت ناشتہ کے بعد بھی کرسی کی پشت سے
 سرٹکائے بیٹھا وہ اپنے آپ سے اُلجھ رہا تھا۔
 جانِ عالم صاحب کے بیٹے کا ولیمہ تو وہ کل ایئرڈ کر چکا تھا۔
 چلا ہی جاتا یہاں سے۔ مگر جس کام کے لئے وہ با با جان کی ہدایت
 پر آیا تھا۔ وہی رُکا ہوا تھا۔
 دراصل مذکورہ اشخاص میں سے ایک باہر شہر سے گیا ہوا تھا۔ اُس نے
 آج رات کو آنا تھا۔ اور کل صبح دس بجے اُس نے سب کی میٹنگ ہوٹل کے
 ہال میں بلوائی تھی۔ کل کا دن لازمی اُس نے یہاں رُکنا تھا۔

ورنہ خود اُس کا دل۔

اس بار یہاں پٹھرنے کو ایک پل کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔
وہ سستی سے اُٹھا۔ رات کے کپڑے تبدیل کئے۔

چند ضروری ٹیلی فون کالز کرنے تھے۔ باری باری اُن سے فارغ ہوا۔
دو چار ضروری خط لکھنے تھے۔ جن کے لئے پہاڑ پر وقت نہ نکال سکا تھا۔
وہ لکھ ڈالے۔

ادھر پھر۔ بے سہم ہو کر بستر پر پڑا رہا۔ رات بھر سویا تو نہیں تھا۔
بے خبر ہو کر آنکھیں موند لیں۔

آنکھ کھلی تو چار بج رہے تھے۔ شام کے۔

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ ایسی غفلت کی نیند وہ بہت کم سویا تھا۔
اُٹھ کر اُس نے گرم گرم پانی کا شاہ درلیا۔ طبیعت بشاش ہو گئی۔
ڈریس آپ ہو کر وہ کمرے میں آ گیا۔

”کھانا۔ چھوٹے صاحب۔“ کریم بابا تھے۔ جو کمرے سے باہر کتنی دیر
سے اُس کے جاگنے کے منتظر بیٹھے تھے۔

”نہیں بابا۔ صرف چائے۔“ وہ چوڑی سی کھڑکی کے پاس آتے
ہوئے بولا۔

”سینڈوچ ہی کھا لیجئے۔ سرکار۔“ بابا کو اُس کا اس قدر کم کھانا
پینا کبھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

”اد۔ کے بابا۔ جیسا آپ کہے گا۔“ نظروں ہی نظروں میں کھڑکی سے

باہر کا لازدال حُسن سراہتے ہوئے وہ خوشگواہری سے بولا۔

اور۔ بابا اُس کی چائے کا آرڈر دینے چل دیئے۔

کل کا دن مزید یہاں۔ اُس نے نیراری سے سوچا۔

کمرے کی طرف رُخ کرتے ہوئے وہ یوں ہی خالی نظروں سے ادھر

ادھر دیکھنے لگا۔

پھر آگے بڑھ کر۔ روم سروس کے نمبر ڈائل کئے۔

گولف کے بارے میں اپنی خواہش ظاہر کی۔ اور پھر چائے سے فالغ

ہوتے ہی وہ گولف کلب کی طرف ہولیا۔

پیدل ہی۔ فرلانگ کا تو فاصلہ تھا۔

گو کہ کوئی اور موقعہ ہوتا۔ تو یہاں بھی۔ اُس کا ڈرائیور مستعد کھڑا

اُسے کلب پہنچانے کو منتظر کھڑا نظر آتا۔

مگر۔ کچھ عرصے سے۔ اُس میں تبدیلیاں آرہی تھیں۔

نمایاں طور پر۔

یہ الگ بات تھی۔ کہ وہ خود اکیس محسوس نہیں کر پارہا تھا

کافی دیر وہ وہیں مصروف رہا۔ اُسے اچھی کمپنی ملی تھی۔ وقت

گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ پھر گھڑی دیکھی۔ چھ بجنے ہی والے تھے۔

تھکا تھکا سا وہ باہر نکل آیا۔

شارٹ کٹ کرنے کے لئے اُس نے ایک مختصر سی کھیتی کی پگڈنڈی

کا انتخاب کیا۔ اور سر جھکائے گم سا آگے بڑھنے لگا۔

معا پیچھے آہٹ ہوئی۔ شاید کوئی اور بھی آ رہا تھا۔

پگڈنڈی شاید عام طور شارٹ کٹ کے لئے استعمال میں آتی تھی۔
پیچھے دیکھے بغیر ہی وہ بائیں طرف پر ہو گیا۔
آنے والے کو راستہ دینے کے لئے۔

”آپ.....؟“ زی شاپنگ کے لفافے دونوں ہاتھوں میں اٹھائے
میجر سی کھڑی رہ گئی۔

اور شان کوئی جواب دیئے بنا رک گیا۔

شاید اس اچانک اور اتفاقاً مڈ بھیڑ کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔
”آپ ابھی یہیں ہیں۔ میرا مطلب ہے اس شہر میں؟“ زی نے
حواس مجتمع کر کے مزید پوچھا۔

”ہاں۔“ اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور جانے کے لئے
قدم بڑھا دیئے۔

زیرین بھی ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

دراصل اُس کی رت کا پی ختم ہو گئی تھی۔ اور اُسے ابھی تھوڑی دیر
قبل ہی خیال آیا کہ خرید لی جائے۔ کلاس میں اس کے بغیر گزارہ نہ تھا۔
اسی کھیتی سے ہوتے ہوئے پیچھے گولف کلب کے دائیں طرف
دکانیں کھیں۔ اور اسی کھیتی سے ہو کر بالکل سامنے نظر آتی دو چار
کوٹھیوں کے پاس اُن کی انیکسی تھی۔ اسی لئے وہ بلا خوف و خطر اکثر
خریداری کے لئے گھر سے نکل آتی تھی۔

"آپ کی یہاں کوئی کام ہوتا ہے؟" زرین نے محسوس کیا۔ شان
نچا کھنچا سا تھا۔ شاید اُس کے پھلے رویہ کی وجہ سے۔ تلافی کے طور پر
لیڈ اس نے بات کرنا ضروری سمجھا۔
"ہاں۔" شان نے ایک نظر اُس سے دیکھا۔ اور پھر سامنے دیکھتے ہوئے
تھرسا جواب دیا۔

آج تو وہ بوئے جبار ہی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ نہیں بول رہا تھا۔
"کیا کام ہوتا ہے۔؟" اُسے اختصار سے کام لیتے دیکھ کر وہ
معصومیت سے پوچھنے لگی۔

اور شان کو اپنا ارادہ ڈالناں ڈول ہوتا محسوس ہوا۔
اتنی چھوٹی سی چیز۔ اتنے بوجھل کاموں کا پوچھ رہی تھی۔ بس
م ہوتا ہے۔" اُس کی ہنہ پھر اڑے آگئی۔

اور وہ لا جواب کی ایک نظر اُس پر ڈال کر آگے بڑھنے لگی۔
"دائیں کب جائیں گے۔؟" اُس نے ایک اور سوال کر دیا۔
اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کیسے اُسے نارمل کرے۔
اُس کے چہرے پر تو ایک سختی تھی۔ چٹان جیسی۔
"جب کام ختم ہو جائے گا۔"

"کام کب ختم ہو گا۔؟" اُس کے لہجے میں بلا کی معصومیت تھی۔
س سے کھل کر بات کر لینے کی اپیل تھی۔
"جلدی۔" اُس کا لہجہ اب بھی جذبات سے عاری تھا۔

زی کا خوب صورت چہرہ مایوسیوں کی زد میں تھا۔ کسی طرح ٹھیک ہو ہی نہیں رہا تھا۔

”پھر چلے جائیں گے آپ؟“ ہجہ ملتے جلتے ساتھ۔

”OF COURSE“ وہ بے رحمی سے بولا۔

”اُف“ زی جلدی سے وہیں بیٹھ کر اپنا پاؤں دیکھنے لگی۔

شان نے دیکھا۔ اُس کے پاؤں کے تلوے سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا تھا۔ شیشے کے نوکیلے ٹکڑے سے اُس کا پاؤں زخمی ہو گیا تھا۔

لفافے ایک طرف رکھ۔ وہ اپنے پاؤں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ سینڈل اتاری۔ خوب صورت گلابی نازک سے پیر سے سرخ سرخ خون ابل ابل کر اُسے بھگوئے دے رہا تھا۔

غیر ارادی طور پر اُس کی نظریں شان کی طرف اٹھیں۔ تکلیف شدت سے اُس کی خوبصورت آنکھوں میں کرب اتر آیا تھا۔

شان میں جیسے کسی مشینی قوت سے جنبش ہوئی۔ ساری رنجش بھول بھال۔ وہ اُس کے قریب زمین پر دو زانو ہو کر بیٹھا۔

تلوے کی طرف دیکھا۔ کافی گہرا زخم آیا تھا۔ اُس کا پاؤں اپنے زانو پر کھڑے ہوئے اُس نے اپنی ہتھیلی اُس کے تلوے پر سختی سے دبا دی۔

ایک نظر زی کو دیکھا۔

اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ درد کی شدت دبانے کی کوشش میں اُس نے ہونٹ بھینچ لئے تھے۔

نقاہت سے بند ہوتی آنکھوں سے اُس کی تکلیف عیاں تھی۔
 "زی۔ اُس نے اُس کا سراپے بازو کے حلقے میں لے لیا۔
 "ورد ہو رہا ہے۔" زی سنجیدہ آواز میں بولی۔ ساتھ ہی
 آنکھیں نم ہو گئیں۔

"OH NO MY LOVE" ٹھیک ہو جائے گا۔ اُس نے
 بے اختیار اپنے ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ دیئے۔
 شان نے دیکھا خون کسی طرح رُک نہیں رہا تھا۔ "گھر جاؤں گی۔"
 "نہیں۔ پہلے ہاسپٹل جانا چاہئے۔"

اُس نے جلدی سے کوٹ کی جیب سے رومال نکال لیا اور
 کس کر زخم پر باندھ دیا۔

"اتنی پریشان ہو رہی ہوں گی۔" زربین سر اٹھا کر بولی۔
 "DON'T WORRY"۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" شان نے آہستہ
 سے اس کا پاؤں اپنے زانو سے اٹھا کر نیچے ٹکا دیا۔ "میں ٹیکسی کی
 کوشش کرتا ہوں۔" وہ اٹھنے لگا۔

"میں گھر جاؤں گی۔ وہ سامنے تو ہے۔" اُس نے پریشانی سے
 سامنے دیکھا۔

ڈارلنگ۔ اُس نے اٹھتے اٹھتے اُسے اپنے پہلو سے لگاتے
 ہوئے اس کے سر پر پیار کر لیا۔ "خون بند نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر کو
 دکھانا ضروری ہے۔"

دہ اُٹھ کر تیزی سے سڑک کی طرف بڑھا۔ چند قدم پر تو تھا۔
 زی کی محوسات عجیب سی ہو رہی تھیں۔
 تکلیف کی اس شدت میں بھی جیسے دنیا بھر کے خزانے اُس پر
 پھار ہو رہے تھے۔

پھر اُس نے دیکھا۔ شان ٹیکسی پالینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔
 تیز قدم چلتا اُس کے پاس آیا۔
 اصرار کر کے اُسے اپنے ہاتھ کا سہارا لینے پر مجبور کرتے ہوئے
 ٹیکسی تک لے آیا

ایمر صبی لے جا کر اُس نے اُسے ڈاکٹر کو دکھایا۔ زخم واقعی گہرا تھا۔
 لوکل انیسٹھیزیا دے کر اُس کے ٹانگے لگے۔

اس دوران اُس نے ہوسپٹل سے ہی زی کے بتائے ہوئے اُن کے
 پاس والی کوٹھی کے فون نمبر پر اُس کی اتنی کو ساری بات بتا کر یہ
 کہہ کر تسلی دی کہ ابھی چند منٹ میں ہی وہ اس کو لے کر پہنچنے والا تھا۔

ٹیکسی زرین کی انیکسی پر رُکی۔

اتنی گیٹ پر ہی پریشان حال منتظر کھڑی تھیں۔ انیسٹھیزیا کی مدد
 سے دہ زرین کو اندر اُس کے بیڈ روم میں بستر تک لایا۔ اُسے آرام
 سے لٹایا۔ اوپر لحاف ڈالا۔

”آئی۔ زی کا واسطے گرم دودھ اور اوڈیشن چاہئے۔“

شان بالکل یوں یوں رہا تھا جیسے اس کا ہی فرد ہو۔ حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے۔

”ابھی لاتی ہوں۔ بیٹا تم بیٹھو

انچی کچن چل دیں۔

شان نے ادھر ادھر کسی مناسب جگہ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ اور پھر وہ وہیں زری کی مہری کے پی پر بیٹھ گیا۔ یہی اُسے موزوں جگہ معلوم ہوئی۔

زری کی آنکھیں نقاہت سے بند تھیں۔

”کیسا طبیعت ہے اب جان۔“ اُس کا بڑا ہلکا سا ہلکا سا ہونے اُس نے اپنا بیٹ سے کہا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

شان کو اپنے سر پر ہاتھ بیٹھے۔ اپنی طرف غور سے دیکھتے پا کر اُس کی پلکیں تپتا کر گر گئیں۔

اور شان کو اُس سے گلا۔

چھوٹا سا یہ خوبصورت شہر اُس کا اپنا تھا۔

”I LOVE YOU DEAR“ وہ اُس کے چہرے پر جھک آیا۔

باری باری اُس کی دواؤں آنکھوں کو ہونٹوں سے چھوتے ہوئے آہستہ آہستہ بولا۔

اور سیدھا ہوا۔ تو

جھٹ زنی نے اپنی آنکھیں بازو سے دھک لیں۔

"No" شان نے اُس کا بازو ہٹا کر پکڑ لیا۔ "I SEE"

SHAAN IN THEM"

کیسی باتیں کر رہا تھا وہ۔ شرمناک اُس نے دوسرا بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ چہرہ مضمحل ہوتے ہوئے بھی کانوں کی لودوں تک سرخ ہو گیا۔

"یہ کبھی نہیں" اُس نے دوسرا بازو بھی گرفت میں لے لیا۔

چھوڑیں تا "بند آنکھیں کئے وہ بے بسی سے بولی۔

"نہیں" اُس نے کہا۔

"انہی آرہی ہیں" زنی نے دھمکی دی۔

"آتے دو" اُس نے ایک نظر دروازے پر ڈالی۔

"آپ بہت ڈھیٹ ہیں"

وہ پشاشت سے ہنسا

"ہم ڈھیٹ نہیں ہے" ایک بار پھر اُس نے اُس کی بند آنکھوں پر پیار کر لیا۔

"آپ ہیں" وہ اپنے بازو چھڑانے لگی۔

بجھی کوریڈور میں انہی کے قدموں کی آہٹ ہوئی۔

اُس کے خوب صورت ماتھے کو اپنے لبوں سے چھوتے

ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

انہی ٹرے لئے اندر آئیں۔

کھڑکی کے پاس سے ہلکی سی مینر اٹھا کر زی کے بید کے پاس رکھتے ہوئے ٹرے اس پر رکھ دی۔
 ”تم ابھی تک کھڑے ہو بیٹا۔ بیٹھو نا۔ اُسے زی کے سر ہانے کھڑے دیکھ کر بولیں۔

شان نے ایک نظر زی پر ڈالی۔
 گھبرا کر زی اتنی کو دیکھنے لگی۔
 اتنی وہیں کھڑکی کے پاس رکھی کر سی بھی اٹھا لائیں۔
 ”بیٹھو بیٹا۔“ کرسی مینر کے قریب رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔
 ”تم چائے پیو۔ میں زرین کو ددھ پلاتی ہوں۔“
 ”THANK YOU“ شان نے کہا۔

آگے بڑھ کر زی کے تکیے مسہری کی پشت سے ٹکائے اور اتنی کی موجودگی کا احساس کئے بغیر اُسے با آسانی اوپر کھینچتے ہوئے اُس کی پشت تکیوں سے ٹکا دی۔
 زی کا رنگ سرخ ہو گیا۔

اور اتنی نے سوچا۔ کتنا نیک اور مخلص لڑکا تھا۔ اتنے بڑے گھرانے کا تھا۔ مگر غرور اور تکبر نام کو نہ تھا۔
 انہوں نے زی کی مسہری کی پیٹی پر بیٹھتے ہوئے اُسے ددھ کا کلاس تھا دیا۔ اور شان۔ اُس کے مقابل کر سی پر بیٹھ کر اپنے لئے چائے بنانے لگا۔

گاہے گاہے وہ نظریں اٹھا کر زی کو دیکھ لیتا۔

اودزی کا رنگ عنابی ہو جاتا۔
کئی دنوں کی کچھ کہتی شان خوب صورت آنکھیں آج کھل کر
بول رہی تھیں۔

چائے کا آخری گھونٹ لے کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”آنٹی۔ اگر زی کو ٹیپر پھر ہوتا ہے تو.....“ اُسے یاد آیا ڈاکٹر نے
کہا تھا۔ ”ٹیپر پھر ہو تو کوئی بخار اُتارنے والی دوا دے جائے“ گھر
میں ہے کوئی نارسل کرنے کا میڈیسن۔؟“
”ہاں بیٹا ہے۔“

”اگر ضرورت پڑتا ہے تو دے دیں۔“

”اچھا بیٹا۔ خدا عمر داز کرے۔“

”او۔ کے آنٹی۔ اب ہم جاتے ہیں۔ کل شام کو آئے گا پھر۔“

خدا حافظ۔“

”خدا حافظ بیٹا۔ اتنی بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔“

”بائے میم۔“ اُس نے خوشگوار لہجہ میں زی سے کہا۔

اور۔ باہر نکل آیا۔

زری۔ جو بھی تھی۔ جہاں کی بھی تھی۔

اُسے اچھی لگتی تھی۔ اُس نے اچھی طرح سوچ لیا تھا۔ وہ اُس کے علاوہ کسی اور کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

جہاں تک یہ سوال تھا۔ کہ گھرانہ کیسا ہے۔؟

تو زرین اور اُس کی اتنی اچھے شریف لوگ معلوم ہوتے تھے۔ رہن سہن بلکہ انسان کے اٹھنے بیٹھنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کیسا ہے۔ پھر زرین آج کل لڑکیوں کی طرح ایڈوانس اور موڈرن نہیں تھی۔

اُس کے برعکس اُس میں حیا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

اور۔ یہی شاید وہ بات تھی۔

جس کی اُسے تلاش تھی اتنے عرصہ۔

مگر۔ بابا جان۔ اُن کو کیسے سمجھائے گا؟

وہ تو بال کی کھال اُرتاتے ہیں۔ اور پھر اس معاملے میں۔؟
 اُس کے لئے لڑکی پسند کرنی تو اُنہوں نے بچھلے کافی عرصے سے
 شروع کی تھی۔ اتنی ہی آسانی سے پسند آتی ہوتی تو وہ کبھی کی
 پسند نہ کر چکی ہوتے۔

کون ہیں؟ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ ذات کیا ہے۔؟
 نسب نسب؟ باپ کون ہے؟ ماں کس خاندان کی ہے؟ لڑکی
 کیسی ہے؟ سیرت کیسی ہے؟ آج کل لڑکیوں کی طرح
 موڈرن تو نہیں؟ صورت کیسی ہے؟ یہ پوائنٹ بھی بہت اہم
 ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

گھبرا کر اُس نے کروٹ بدلی۔

اور اگر ان میں سے ایک بھی چیز اُن کے معیار سے کم نکلی تو صاف
 انکار کر دیں گے۔

مگر۔ وہ جھپلا سا اٹھا۔

آخر وہ بھی بچہ تو نہیں تھا۔ رستائیس اٹھائیس کا سن تھا۔ کچھ
 تو وہ بھی بُرا بھلا سمجھتا تھا اپنا۔ اور پھر۔

اُسے زی پسند تھی۔ وہ مجبور تھا۔ اُس نے ہر پہلو سے اس بات پر
 غور کیا تھا۔ اور پھر۔ اُس نے جیسے جتنی فیصلہ کر لیا۔

وہ اب کے گھاؤں جائے گا تو بابا جان سے اپنی خواہش کا
 اظہار کرے گا۔

رات بیت گئی۔ صبح ہوئی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر تیار ہوا۔
 کچھ دیر فون پر بابا جان سے باتیں کیں۔ اور پھر مقررہ وقت پر
 میننگ اٹینڈ کرنے ہال میں چلا گیا۔

گھنٹہ بھر کی بات چیت میں ہی تھوڑا سا خوارہ نتارچ برآمد ہوئے۔ باقی
 تحریروں کی کارروائی رہ گئی تھی۔ اور گواہوں کے دستخط۔ وہ کوئی ایسا مسئلہ
 نہ تھا۔ ہفتہ بھر میں سب ہو جاتا۔ البتہ کل کا دن باقی اشخاص کے ساتھ
 اسے بھی علاقے کے ہٹواری کا انتظار کرنا تھا۔

عام حالات میں اسے ایک دن مزید رکنے پر سخت جھنجھلاہٹ
 ہوتی۔ وقت ضائع ہونے کا شدید احساس ہوتا۔
 مگر اب کے۔ پورا ایک دن ضائع ہو جانے کا احساس تو ضرور ہوا۔
 لیکن یہاں رکنے پر جھنجھلاہٹ نہ ہوئی۔

وہ زرین کو مل لیتا۔ اُس نے سوچا۔
 اُس کے پاؤں کی ڈریننگ بھی تو کروانی تھی۔
 اُس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ کوئی اور ایسا پروگرام
 نہیں تھا کہ مصروف ہو جاتا۔ کھانے کا وقت بھی نہیں ہوا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر گاڑھی میں بیٹھے بیٹھے ہی وہ سوچ رہا تھا۔
 مگر یہاں جانے کو بھی اُس نے شام کو کہا تھا۔ مگر۔ اس وقت
 ہی چلا جاتا تو کیا مہرج تھا۔؟

اور مینٹوں ہی میں وہ اُن کے گیٹ پر تھا۔

چوکیدار نے مستعدی سے گیٹ کھولا۔ برآمدے کے آگے جیب روک کر وہ اُترا۔ بیل کی۔ کوئی جواب نہ پا کر ساتھ والا بٹن دبایا۔ بجلی نہیں تھی۔ گیلری کے دروازے پر ہلکی سی دستک کے ساتھ وہ اندر داخل ہو گیا۔ زربین کی اتنی کچن میں تھیں۔ یا پھر کچھلی سائیڈ کی طرف۔ اُس نے بائیں طرف زکی کے بیڈروم کے دروازے پر دستک دی۔

”آجاؤ۔“ زکی کی کمزور سی آواز آئی۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔

”آپ۔؟“ اُس نے حیرت سے دیکھا۔

”YES MAAM“۔ سر قدرے خم کرتے ہوئے وہ شرمیلے میں ہولا۔ وہ کچھ اُن اینری سی لگنے لگی۔

”میرا آنا تم کو اچھا نہیں لگا۔؟“ وہ پاس جا کھڑا ہوا۔

”نہیں تو۔ آپ بیٹھے۔“ وہ تکیے مہری کی پشت سے لگانے لگی۔

”آئی کہاں ہے۔؟“

”بازار گئی ہوئی ہیں۔ ایک دور آئی تھیں۔ کسی ضروری کام سے لے گئیں۔“

”SEE I۔ اس لئے تم گھبرا گئے۔“ وہ آرام سے اُس کے قریب مہری

کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ ”ویسے گھبراؤ نہیں۔“ اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے

وہ اپنا ٹیٹ سے ہولا۔ ”میں تم کو کچھ نہیں بولوں گا۔“

اور زکی بمشکل اپنا بوجھ اوپر کھینچتے ہوئے تیکوں سے پشت ٹکا کر

اپنے ہاتھ کے ناخنوں کو تکتے لگی۔

یہ تو ابھی کچھ نہیں بولا تھا۔ بولتا تو پتہ نہیں کیا بولتا۔

وہ بے بہت بولڈ تھا۔ اور پھر پیار تو اُسے یوں آرام سے کر لیتا۔
جیسے عین اُس کا جائز حق ہو۔ لیکن۔

وہ۔ بھی تو کچھ نہ بول پاتی۔ دم بخود سی رہ جاتی۔

”HOW DO YOU FEEL NOW“ اُس کے خجل سے چہرے کو بغور
دیکھتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا۔

”ٹھیک ہوں۔“ ناخن کو ہی تکتے ہوئے وہ بمشکل بول پائی۔

شان نے اُٹھ کر اُس کے پاؤں سے لحاف سرکایا۔ پاؤں قدرے
اوپر اٹھا کر دیکھا۔

”کل نیا ڈریسنگ ہو گا۔“ شان دوبارہ اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ ”بخار
تو نہیں ہوا تھا۔؟“

”ہوا تھا۔“ سر جھکائے وہ ہلے سے بولی۔

”ادہ لو۔ تم کتنا FRAGILE ہے۔“ اُس کے چہرے پر جھپکے ہوئے
اُس نے کئی پیار کر ڈالے۔ ”گوئی لیا تھا پھر؟“

اور کوئی جواب دئے بنا۔ زخمی نے چہرہ بازو سے دھک لیا۔

چند ثانیے وہ یوں ہی دل ہی دل میں اُس کے انداز سے مخطوط ہوتا رہا۔
اُسے دیکھتا رہا۔

مختصر سے غرصہ میں وہ کس قدر بے تحاشہ چاہنے لگا تھا اُسے۔

"زی۔" اُس نے اُس کے چہرے پر سے اُس کا بازو ہٹالیا۔

وہ چپ رہی۔ دراز پلکیں خوبصورت چہرے پر سایہ کئے تھیں۔
"ایک بات بتاؤں۔"

زی کی پلکیں اوپر اٹھیں۔

"میں تم کو بہت محبت کرتا ہوں۔ تم اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس چھوٹے
سے وقت میں۔ ہم تم کو بہت"

اور زرین کو اُس کا معصوم لب و لہجہ بہت اچھا لگا۔ دلفریب
مسکراہٹ لئے وہ اُسے تکتی رہی۔

"ہم سچ محبت تم سے لو کرتا ہے زرین۔ کیا تم۔ بھی ہم کو اتنا ہی لو کرتا ہے
جتنا ہم۔ تم کو کرتا ہے۔؟" اُس کے بالوں کی لٹ سے کھیلنے کھیلنے اُس
نے اچانک سوال کر دیا۔

ایک بل کو تو زرین گرہ بڑا گئی۔ مگر۔ پھر۔ سنبھل گئی۔

"آنکھوں میں شرارت اُتر آئی۔" نہیں۔

"کیا۔؟" شان نے جیسے چونک کر اُسے دیکھا۔ "تم۔ ہم کو محبت نہیں کرتا ہے؟"
زرین نے بمشکل اپنی مسکراہٹ پر قابو پایا۔

"آنکھوں میں سنجیدگی بھرتے ہوئے نظریں جھٹکائیں۔

"نہیں۔" اُس نے سرفنی میں ہلایا

"ادہ۔" اُس کا چہرے سا نارنگ کسی نے پھوٹ لیا۔ اُس کے بالوں میں

پھنسی اُس کی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ "SORRY THEN"

زی نے چونک کر اُسے دیکھا۔

کتنا اُداس لگ رہا تھا وہ۔ وہ مذاق بھول بھال گئی۔

”اچھا۔ میں جاتا ہوں اب۔“ وہ اٹھنے لگا۔

اوہ۔ اُس کا یہ تو مطلب نہیں تھا۔ کتنی جلدی تھا ہو جاتا تھا۔ وہ تو

یونہی بولی تھی اُسے تنگ کرنے کو۔ یہ تو مقصد نہیں تھا کہ وہ چلا جائے۔

”آئی آئی تو بتا دو کہ ہم آیا تھا۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھتے

ہوئے مزید بولا۔

زی اب بھی چپ چاپ اُسے دیکھ رہی تھی۔ روکنا چاہتی تھی اُسے۔

مگر ایسا نہیں کر پارہی تھی۔ اور وہ۔ وہ تو جا رہا تھا۔

پتہ نہیں۔ پھر آتا بھی یا نہیں؟ کیسی شکل میں پھنس گئی تھی وہ۔

اُس کے بغیر رہ بھی نہیں سکتی تھی۔ مگر اُسے روک بھی تو نہیں

سکتی تھی۔

کیسے کہتی۔ خود داری جو اُڑے آرہی تھی۔

اور۔ مارے بے بسی کے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

شان نے دروازے کے پاس پہنچ کر اُسے مڑ کر دیکھا۔

جھٹ زی نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

وہ اپنی کمزوری بھی تو دکھانا نہیں چاہتی تھی۔

شان واپس پلٹ آیا۔

گھٹنے کے بل اُس کے سر ہانے۔ اُس کے قریب بیٹھا۔

”زی۔ جھکتے ہوئے اُس نے اُس کا ہاتھ ہٹایا۔“ زی۔ YOU

LOVE ME- YOU HAVE TO ADMIT IT-AND ONCE
YOU ADMIT YOU WOULD FEEL RELEXED, IT'S A FACT,
YOU CANT DENY IT AND.... AND I CANT HELP IT
TOO.....“

شان دھیرے دھیرے بولتا گیا۔
وہ اُس کے بے حد قریب تھا۔ اتنا کہ اس کی گرم گرم سانسیں اُس
کی اپنی بے ترتیب سانسوں میں گھل رہی تھیں۔
اور۔ پھر۔ اچانک ہی وہ۔

اُسے اپنی شہ رگ سے قریب تر محسوس ہوا۔
وہ اُس کا اپنا تھا۔ بالکل اپنا۔

غیر محسوس طریق پر اُس کے دونوں بازو بڑھے۔ اور شان کی گردن
کے گرد حائل ہو گئے۔ ”شان۔“ اس کی مدھم سرگوشی ابھری۔
”MY DARLING MY LOVE“۔ مدہوش ہوتے ہوئے۔ اُن گنت

پیار کرنے کے دوران شان آہستہ آہستہ کہتا گیا۔
”LOVE YOU I WOULDNT SURVIVE WITHOUT YOU“

فہم جاتے ہی اپنے با با جان سے بات کرے گا۔ تم میرا انتظار کرو.....
بہت جلدی تم کو یہاں سے لے جائے گا۔
زرین اب واقعی پُر سکون لگ رہی تھی۔
نظر میں جھکائے لیٹی تھی۔

کل کے سادے کے بعد سے بہت سا خون ضایع ہو جانے کی وجہ سے
چہرہ سفید اور کمزور پڑ گیا تھا۔

شان اب بھی پاس بیٹھا تھا۔ مطمئن سرور سا۔

”شان۔ پانی۔ پلیر۔“ زی نے اُس کی طرف نظریں اٹھائے آہستہ
سے کہا۔ اور شان نے پاس کے بیڈ سائڈ ٹیبل سے جگ میں سے پانی
گلاس میں ڈال دیا۔

”لو۔“ بازو سے سہارا دیتے ہوئے اُس نے گلاس اُس کے ہونٹوں
سے لگا دیا۔

پانی پلا کر اُس کا سر دوبارہ آہستہ سے تکیوں سے ٹکاتے ہوئے
اُس نے گلاس واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔

”WHEN WILL YOUR MOTHER COME“

شان نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں۔ بول رہے ہیں۔؟“

”دل تو چاہتا ہے۔ اسی طرح بیٹھا رہے۔ مگر کیا کرے۔ تمہارا اتنی

کیا سوچے گی۔“

”کچھ نہیں۔ یہی کہ آپ مجھے دیکھنے آئے تھے۔“

”اتنی لوگ بہت ہوشیار ہوتا ہے۔ تم جیسا بیوقوف نہیں۔“ کہنی کے

بل اُس پر ٹھکتے ہوئے وہ خوب صورتی سے ہنستے ہوئے بولا۔

”میں۔ آپ کو بیوقوف نظر آتی ہوں۔“

"یکدم : انگلی سے اُس کی ناک پیارے سے چھوتے ہوئے اُس نے کہا۔
"کیوں۔؟ اُس نے شان کی طرف دیکھا۔

"اب ایک آدمی کو تم LOVE کرتی ہو۔ اُس کو بھی معلوم ہے پھر بھی
تم انکار کرتی ہو۔" وہ اُس کے چہرے پر انگلی سے لیکر بناتا ہوا ہنسا گیا۔
"اور پھر روتا بھی ہے.... پاگل...." وہ جاندار ہنسی ہنسنے لگا۔
"آپ پاگل ہیں۔"

"کیسا۔؟" وہ ہنسا۔

"ایسا۔" زرین نے دونوں ہاتھوں سے اُس کے گھنے بال
جھنجھوڑ دئے۔

"میرا شکل کیا بنا دیا ہے۔" اُس کی آنکھوں میں اپنا عکس ڈھونڈتے
ہوئے اُس نے کہا۔ "تمہاری امی کو بتاؤں گا۔"
"کیا۔؟ وہ چونکی۔

"کہ تم کو ہم سے پیار ہو گیا ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"وہ کالوں کی لوڈوں تک سرخ ہو گئی۔

"اور کے ڈیر چلتا ہوں اب۔" وہ دروازے کی طرف
بڑھا۔ "کل ملاقات ہو گا۔" ہاتھ ہلاتے ہوئے وہ دروازے
سے باہر نکل گیا۔

فجر کی نماز کے بعد دونوں ہاتھ اٹھا کر اتنی نے بارگاہِ ایزدی میں
 سی اور ناصر کی ڈھیر ساری عمر اور خوشیوں کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ
 اپنے لئے بھی اللہ تعالیٰ سے ان دونوں کی خوشیاں دیکھنے کی ہمت مانگی۔
 پھر منہ ہی منہ میں آیتیں پڑھیں۔ رُخ پھیر کر ہنوز سوتی زرین پر
 م کیا اور جائے نماز کا کونہ تہہ کرتے ہوئے تخت پر سے اتر آئیں۔
 آہستہ قدم چلتیں دروازے سے باہر نکلیں۔ کچن میں آئیں۔ اور اپنے
 لئے ایک پیالی چائے بنانے لگیں۔

نماز کے فوراً بعد وہ صبح ہی صبح ایک کپ چائے ضرور پیتیں۔
 شام پھر بعد میں رُخ کے ساتھ کرتیں۔

کچن میں ہی ایک طرف انہوں نے دو کرسیاں اور ایک چھوٹی
 سی میز رکھوائی تھی۔ وہیں وہ اور زرین مل کر کھانا کھایا کرتی تھیں۔
 چائے کی تلی سے پیالی میں انڈیل کر وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئیں۔

گھونٹ گھونٹ کر کے گرم گرم چائے حلق سے اتارنے لگیں۔

تو شان تصور میں ابھر آیا۔ نیک۔ محبت کرنے والا۔

مخلص لڑکا۔ کتنی خدمت کر رہا تھا۔ ان لوگوں کی۔

ابھی اُس کو یہ معلوم نہ تھا۔ کہ ان لوگوں کا اُس کے ساتھ رشتہ

بھی ہے۔ معلوم ہوا تو پہ نہیں کیا ردِ عمل ہو گا۔؟

اونچے لوگوں کی اونچی شان۔ پھر شاید ادھر کا رخ بھی نہ کرے۔

یکایک۔ اُن کا دل دھڑک سا اٹھا

زی اُس کا ذکر کتنے چاؤ سے کرنے لگی تھی۔ کہیں... کہیں...

خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے انہوں نے یہ سوچ ہی ذہن

سے جھٹک دی۔

واپس کمرے میں آئیں۔

زین کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ کتنی کمزور ہو گئی تھی۔ دو ہی

دن ہیں۔ مگر کل شام سے بخار دوبارہ نہیں چڑھا تھا۔ آج اُس کی

ڈرلنگ ہوئی تھی۔ پانچویں دن ٹانگے کھلنے تھے۔ بیٹھے بٹھائے

بے چاری کو مصیبت نے آلیا تھا۔

اپنے بستر کے اوپر سے کبل سٹپتے ہوئے وہ دوبارہ تخت پر آئیں۔

اور کبل اپنے ارد گرد لپیٹ کر جب معمول تسبیح کے دانے پھیرنے لگیں۔

سارے سات بجے زی کی آنکھ کھل گئی

”صبح بخیر اتنی۔“ زی بولی

”صبح بخیر بیٹے۔“ تبیج کے آخری دانے پھیرتے ہوئے اُسے ایک طرف رکھ کر انہوں نے شفقت سے جواب دیا۔

”امی ہاتھ روم جاؤں گی۔“ اور اتنی اُٹھ کر پاس آگئیں
زی نے بستر میں بیٹھ کر پاؤں نیچے لٹکائے۔ مگر ابھی وہ اس قابل نہ تھی کہ بغیر سہارے کے چل پھر سکتی۔

امی نے بازو اُس کی کمر میں حائل کیا اور سہارا دیتے ہوئے ہاتھ روم لے جانے لگیں۔

منہ ہاتھ دھو کر وہ فارغ ہوئی تو اتنی دوبارہ اُسے لے آئیں۔ تکیوں کے سہارے اُس کی پشت لٹکائے ہوئے کھیل اور صفا دیئے۔

”میں ناشتہ بنا کر لاتی ہوں۔“ اتنی کچن چل دیں۔

اور۔ زی سوچوں میں گم ہو گئی۔

کبھی کسی خوش آئند خیال کے تحت اُس کی آنکھیں جگمگا اٹھتیں۔

اور کبھی وہی جگمگا ہٹ مسدوم ہو جاتی۔ اُس کی جگہ تاریک سائے ہرانے لگتے۔ تھک کر اُس نے آنکھیں موند لیں۔

سرسہری کی پشت سے ٹکا دیا۔

”زی بیٹے۔ ناشتہ کے بعد تیار ہو جاؤ۔“ ذیشان ڈریسنگ

کرنے لے جانے لگا۔ ”امی نے ناشتہ کی ٹرے اُس کے بستر کے پاس میز پر رکھ دی۔“

”اچھا امی۔ ابھی تو وقت ہے۔“ اُس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

نوبتے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔

”دس بجے آنے کو کہا تھا اُس نے۔ آج اُس کی واپسی بھی تو ہے۔“

”ایک گھنٹہ پورا ہے ابھی۔“ زرین نے تو س پر مکھن لگاتے ہوئے کہا۔

”سوچتی ہوں۔ آج دوپہر کو اُس کو کھانے پر یہیں روک لوں۔

بُرا ملکتا ہے عین کھانے کے وقت چلا جاتا ہے۔“ اتنی نے کچھ

سوچتے ہوئے کہا۔

”جیسا آپ بہتر سمجھیں اتنی۔“ جیم لگا کر ٹھہری اُس نے واپس

پلیٹ میں رکھ دی۔

”کرتی ہوں آج کچھ۔ قیمہ رکھا ہوا ہے کچھ گوشت بھی ہے۔ اُس کا

روسٹ بنا لوں گی۔ قیمہ کے کوفتے بنا لوں گی۔ تھوڑے سے چاول بنا

لوں گی۔ فاروق مرغی لے آئے گا۔ اللہ الذی خیر صلا۔“

”آپ کو زحمت ہوگی اتنی۔ اکیلے کیے اتنا کام کریں گی۔

”کوئی اتنا کام نہیں ہے بیٹے۔ ہماری قسمت میں یہاں کہاں۔

اور کام کہاں تھے؟“

”آپ خوش ہوتی ہیں اتنی تو ضرور کریں۔“ ردھہ کے گلاس میں

اوڈو لیٹن ڈال کر چمچ چلاتے ہوئے وہ بولی۔

”سوچتی ہوں اُس کو پتہ چلے گا۔ کہ ہم کون ہیں۔ تو کیا ردعمل ہوگا۔ اُس کا۔

چلے گا گھونٹ بھرتے ہوئے اتنی جیسے خود سے بولیں۔

”زیادہ سوچیں ہی نہیں اتنی۔“

ماں کو متفکر وہ کبھی نہ دیکھ سکی تھی۔ آگے ہی کیا کم دکھ اٹھائے
تھے کہ اب بھی سوچتی ہی رہتیں۔

”ویسے ہی خیال آجاتا ہے کبھی کبھی۔ پھر شاید ہم اتنے اچھے نہ
لگیں اُسے۔؟“

”خود ہی آتا ہے۔ ہم نے نہیں بُلا یا۔ اچھے نہیں لگیں تو نہ سہی۔
آن پھر آڑے آگئی۔“

”نہیں بیٹے ایسا نہیں کہتے۔“ اتنی مسکرا کر بولیں۔ لااب اندھا کھالو۔
انہوں نے اندڑے کی پلیٹ اُس کی طرف بڑھا دی۔

”امی۔ جیم ٹوسٹ کھا لیا ہے۔ اب پیٹ میں جگہ نہیں رہی۔
نہیں۔ اس کا بھی سینڈویچ بنا دیتی ہوں۔ کھانا ہوگا۔ آگے
مکرور ہو رہی ہو۔“

”اچھا۔ سینڈویچ نہیں بنائیں۔ صرف ایک ٹوسٹ کے اوپر رکھیں
ادراچی نے چھری سے اندھا۔ مکھن لگے ٹوسٹ پر رکھ دیا۔
”لو۔ پلیٹ میں رکھ کر اُس کی طرف بڑھایا۔“ پھر دودھ پی لو۔
میں کپڑے لاتی ہوں۔ یہیں بدل لو۔ کھڑے ہو کر بدلنا مشکل ہوگا۔
نہیں۔ امی۔ ڈرینگ روم تک لے جائیں۔ وہیں کر لوں گی۔
سب۔ اُس نے کہا۔

”کھٹیک ہے۔ میں نے تو تمہاری آسانی کے لئے کہا تھا۔“ اتنی باقی
کے برتن ٹرے میں رکھ کر کچن چل دیں۔

ڈارک بلورنگ پر سفید چھوٹے چھوٹے پھولوں والی پرنسٹڈ قمیض
 شلوار پہن کر اُس نے سفید سوائیٹر پہنا۔ لمبے خوبصورت بالوں کی ڈھیلی سی
 چوٹی بنائی۔ شفون کا ڈارک بلود وپٹہ کندھوں پر ڈالا اور اپنے پسندیدہ
 کلون کی اسپرے کپڑوں پر کرتے ہوئے دیوار کا سہارا لیتی بمشکل کمرے
 تک آ کر کھڑکی کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

شان مقررہ وقت پر پہنچا۔

کمرے میں داخل ہوا تو زری کو دیکھا۔

تو ایک لمحے کو اُسے احساس ہوا۔ اُس کا انتخاب کتنا حسین
 تھا۔ کتنا مکمل تھا۔

ڈریسنگ کروانے کے بعد وہ اُسے اپنے بازو کا سہارا دیتا۔
 جیب تک لایا۔ بٹھایا اور خود گھوم کر اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔

”تم بہت اچھا لگ رہی ہو۔“ اُس نے پھر پور نظر اُس کے خوب
 صورت سراپے پر ڈال کر کہا۔

”شکریہ۔“ وہ اُس کے لب و لہجہ پر بمشکل منہی روک سکی۔

”شام کو میں واپس جاتا ہوں۔“ قدرے توقف کے بعد
 اُس نے کہا۔

زری کو معلوم تھا کہ اُس نے جانا تھا۔ اس کے باوجود وہ
 اُداس نظر آنے لگی۔ ”پھر کب آئیں گے۔“

"اب تو ہلدی آئے گا۔ جان جو ادھر ہے۔ خالی BODY کو لے جا کر سناٹا
کیا کرے گا۔" وہ اٹک اٹک کر معصومیت سے بولا۔

اور زی نہ چاہتے ہوئے بھی دھیرے سے ہنس دی۔

"REALLY MAAM۔ تمہارا زبان بہت مشکل ہے۔ گزرا

کیسا ہو گا۔؟" وہ خود بھی خوش گواری سے ہنس دیا۔
"آپ مجھے پشتو سکھا دیں۔"

"THATS IT" وہ خوش ہو کر بولا۔ "بولو۔ ذہ تا سرہ مینہ کوم۔"

"ذہ تا سرہ مینہ کوم۔" زی نے دہرایا۔ "اس کا کیا مطلب ہے۔؟"
"I LOVE YOU" شان نے کہا۔

"اوہ۔" زی جڑ بڑھتے ہوئے بلس ہو کر رہ گئی۔

رُخ پھیر کر کھڑکی کی طرف کرنے لگی تو اُسے محسوس ہوا۔ اُس کی
چوٹی کے بال پیچھے گردن کے اوپر لگے قمیض کی زپ کے ٹک میں
پھنس گئے تھے۔

وہ دوبارہ سیدھی ہو کر بال نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔

"کیا ہوا۔؟" اُسے پریشان دیکھ کر اُس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ یہ بال..... وہ اب بھی انہیں چھڑانے کی کوشش میں لگی تھی۔

"لاؤ۔ میں نکال دوں۔" اور پھر تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ اُس

کے بال ننھے سے ٹک میں سے چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔

"شکریہ۔" اُس نے کہا۔

"WEL COME" وہ خوبصورتی سے مسکرایا۔ "تم کو معلوم ہے۔"

بہت کام چور ہے۔ گاڑی دوبارہ چلاتے ہوئے اُس نے کہا۔

"شکل سے لگ رہا ہے۔" وہ شرارت سے بولی۔

"BELIEVE ME" ہم کو یا با جان نے نوکروں کے حوالے کر کے باہر

بے کار کر دیا ہے۔ دلنشیں مسکراہٹ لبوں پر لئے وہ بتانے لگا۔ "یہ تو میری

ہمہارا خاطر اتنا کام کرتا ہوں۔ ورنہ....."

"بہت اونچی شان ہے۔"

"شان ہے نا۔" وہ خوش ہو کر بولا۔

"کوئی شان نہیں ہیں سیدھا سیدھا ذیشان کہیں۔"

"وہ تو تم کہے گی اپنے کو۔" شدید نظر اُس سے اُسے گھورتے ہوئے

شان خوبصورتی سے بولا۔

اور بات کی ہتھ تک پہنچ کر زی کی پلکیں گرنے لگیں۔

شان نے ایک نظر اُس کو دیکھا۔ اور پھر اپنا ہیٹ سے اُس کا سر

اپنے پہلو سے لگا لیا۔ شان کا سارا شان ختم ہو گیا ہے LOVE۔ "اُس کے

ماں تھے بہت پیار کرتے ہوئے وہ گھبرایہ میں بولا۔ تم کو پا کر اب وہ سطر

کچھ بھول گیا ہے۔"

واقعی آسمان ٹھک آیا تھا۔ زی نے سوچا۔

زی کو سہارا دیتے ہوئے بیڈ روم تک بے جا کر اُس نے کسی پر بھٹا

امی فاروق کی مدد سے کچن میں اُس کے لئے کھانا تیار کر رہی تھیں

شان نے بھی زیادہ روکا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی۔

وہ نادانستہ طور پر پہلے سے بہت بدل گیا تھا۔

کہاں کہ اُس کے لئے اُس کی مخصوص ڈشیں تیار ہوں۔ مخصوص

وقت و مخصوص جگہ اور مخصوص انداز میں سرو ہوں۔ اور کہاں کہ کچھ بھی۔

کسی بھی وقت۔ کہیں بھی۔ اور کسی طور بھی پیش کی جائیں۔

اُسے زلی کے یہاں آکر انجانی خوشی محسوس ہوتی تھی۔ چند گھڑیوں کو

جیسے وہ ہر قید و بند سے آزاد ہو جاتا تھا۔

"ڈرائیڈ کو بہر حال ساتھ رکھا کرو۔ ناظم اور کریم کو اپنی ڈیوٹی پوری

کرنے دو۔ اُن کو شکایت ہے کہ کچھ عرصہ سے تم ان کی پوری مدد نہیں لے

رہے۔" پچھلے دنوں بابا جان سے ملاقات ہوئی تھی۔ تو وہ بار غیب مگر

پر شفت پہنچے میں بولے تھے۔ "KEEP UP YOUR OWN WAYS

SON" وہ دھیرے سے مکرادیا۔

پھر زلی کے پاس بیٹھ کر ڈھیر ساری باتیں کیں۔

ڈھیر سارا پیار کیا۔ اور پھر۔

اُس کی مخصوص ڈشیں نہ سہی۔ مخصوص وقت نہ سہی۔ مخصوص جگہ نہ

سہی اور مخصوص انداز نہ سہی۔ اُس نے معمول سے کہیں زیادہ پیٹ بھر کر کھایا۔

اُس کے کھانے میں زیادہ چکنائی نہ ہو۔ سٹارچ والی چیز نہ ہو۔

زیادہ تر اُبلے کھانے ہوں۔ یہ سب اب بھی بابا جان موقع ملنے پر خود کچن

جا کر چیک کرتے۔

”ثقیل چیزیں مدت کھایا کرو۔ ضرورت سے زیادہ بالکل نہیں کھانا
.....“ وہ مزید مسکرا دیا

آج اُس نے یہ پابندی بھی توڑ دی تھی۔

”اوہ کے آنٹی۔ تھینک یو ویری لمچ۔ بہت مزیدار کھانا تھا۔“
وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”جاری ہو بیٹا۔“

”ہاں آنٹی۔ میرا ضروری کام رکتا ہے اگر میں نہیں جاتا ہے ورنہ
میں زرین کا ٹانگا کٹوا کر جاتا ڈاکٹر سے۔“

”نہیں بیٹا۔ تم نے بہت کیا ہے خدا تمہیں زندگی دے۔“

”ہم سیلی فون کرے گا NEIGHBOURS میں۔ زرین کا حالت
معلوم کرنے کے واسطے۔“

”شکریہ بیٹے۔ خدا خوش رکھے۔“

”اچھا آنٹی۔ بہت شکریہ اتنا اچھا لمچ کا۔“ ٹاپک بار اور شکریہ۔
ادا کرتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

”اوہ کے زرین TAKE CARE“ وہ زرین سے مخاطب ہوا۔
”بائے۔“

”بائے۔“ زین نے بھی کہا۔

اور بڑے بڑے قدم اٹھاتا شان کو ریڈور سے باہر نکل گیا۔

پہاڑ پر آئے آج اُسے تیسرا دن تھا۔
 کنٹرکشن کا کام زور شور سے جاری تھا۔
 تین سو بستروں کا سہ منزلہ ہسپتال۔ آپریشن تھیٹر۔ آفیسرز۔
 اسٹاف کے لئے بیگلے۔ لوڈ اسٹاف کے لئے کوارٹرز۔ سرونٹ کوارٹرز۔
 لمبا چوڑا کام زوروں پر تھا۔ اُسے سر پیر کا ہوش نہیں تھا۔
 صبح سے شام ہو جاتی تھی۔ پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔
 ہوش تھا تو بس اتنا۔

کہ زی کی بات بابا جان سے کیسے ہو؟
 کونسا طریقہ زیادہ بہتر تھا۔ بالواسطہ؟ بلاواسطہ؟.....؟
 براہ راست؟ اُس کا دل کہتا تھا۔ بابا جان نہیں مانیں گے۔ پھر؟
 کیا وہ ٹکڑے سکتا تھا۔ بابا جان سے؟ جو صرف اصول جانتے تھے۔
 دل کے تقاضے؟ ہو نہ۔ اُس نے تلخی سے سوچا۔ بابا جان کیا جانتیں۔

اس سے قبل۔ وہ بھی تو اس "تقاضے" کو بیوقوفی کہتا تھا۔
پاگل پن تصور کرتا تھا۔

اب۔ اپنے اوپر آئی۔ تو یکساں بے بس ہو گیا تھا۔
سوچ سوچ کر وہ ہار گیا تھا۔

اُس نے پن اور پیڈ اٹھایا۔ اور ناصر کے آگے دل کھول کر رکھ دیا

"I LOVE HER, I CANT EVEN THINK OF LEAVING HER,
YOU HAVE TO CONVINCE GABA JAN....."

چھ روز مزید گزارے انتظار میں کہ ناصر کیا جواب دیتا ہے۔

مگر پھر نہ رہا گیا۔ یہ اُس کی زندگی کا سوال تھا۔

موت نہ جاتا اُس کے بغیر۔ مگر۔ زندہ لاش ضرور بن جاتا۔

اور۔ ایسی زندگی؟ زندگی تو نہ ہوئی نا۔

وہ کام چھوڑ چھاڑ۔ گاؤں چلا آیا۔ بابا جان وہیں تھے۔ اُس کی

بے وقت اور بغیر اطلاع آمد پر چونکے بھی۔

شام کی چائے پر اُن سے ملاقات ہوئی۔ مگر جانے کیوں؟

اتنی جلدی اچانک وہ حرفِ مدعا زبان پر نہ لاسکا۔

چند سرسری باتیں ہوئیں۔ وہی کچھ اس کی صحت سے متعلق۔ کچھ

کام سے متعلق۔ اور پھر۔ اُس نے ماما پر دھاوا بول دیا۔

"ماما۔ ہم نے لڑکی پسند کر لیا ہے۔" وہ بلا ہمتید بولا۔

"مدفقے جاؤں۔ کیسی ہے۔؟" ماما خوش ہو کر بولیں۔

"کیسا کو چھوڑیں۔ بابا جان کو راضی کریں" وہ مطلب آتے ہوئے بولا۔
 "کون ہیں۔ کہاں کے ہیں رہنے والے۔" ماما کو بابا جان کے نکستوں کا
 تہہ تھا۔ انہی کے انداز میں بات کو تولتے ہوئے بولیں۔
 یہی سب کچھ تو جا کر بڑے صاحب سے کہنا تھا۔

”آپ بھی بابا جان جیسا بات کرتا ہے۔ کون ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے؟ کیا صرف لڑکی کافی نہیں ہے۔ اُس کا خود کوئی شناخت نہیں ہے۔“ وہ تیز ہوتے ہوئے بولا۔

”بیٹا میرے لئے تو صرف لڑکی بھی کافی ہے۔ جہاں تم خوش۔ وہاں میں خوش۔ مگر بڑے صاحب کا ہمتیں پتہ ہے.....“

”کیا بابا جان ایسا نہیں کہہ سکتا۔ جہاں ہم خوش۔ وہاں وہ خوش.....“

س کے لہجے میں تلخی تھی۔

”وہ بھی جو کرتے ہیں۔ ہمارے بھلے کے لئے کرتے ہیں بیٹا۔ تم کچھ تو بتاؤ۔
 س کے متعلق۔ میں پوری کوشش کروں گی۔ بڑے صاحب کو راضی کرنے کی۔“
 ”بس وہ اچھا شریف لوگ ہے۔ ایک ماں ہے۔ ایک بیٹی ہے بس۔ اور
 کوئی نہیں ہے۔ باپ مر چکا ہے۔ اور۔ اور امیر نہیں ہے۔۔۔۔۔“
 اور۔ ماما کو۔ زرین کے گھرانے کی یہ تصویر کم از کم بڑے صاحب
 کے لئے بہت نا کافی معلوم ہوئی۔

اور تبھی۔ وہ سمجھ گئی شانِ آتنا فکر مند کیوں تھا۔
ماما کو اُس پر ترس آگیا۔ ایک آہ بھری۔ ”بیٹا ابھی سے دل چھوٹا

نہ کرو۔ انہوں نے شفقت سے شان کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلی دی۔ گو
انہیں پورا یقین تھا۔ وہ یا شان اس معاملے میں کچھ نہ کر سکیں گے۔ میں
بڑے صاحب سے بات کروں گی۔

اور شان مایوس سا وہاں سے اٹھ آیا۔

”بابا جان۔ آپ سونے جا رہا ہے۔“ رات کے کھانے کی میز سے بابا
جان اٹھنے لگے۔ تو اُس نے مودب لہجے میں کہا۔

”NO, NOT STRAIGHT AWAY۔ کیوں۔؟“ وہ رُک گئے۔

”ایک بات کرنا تھا۔ آپ سے۔“

”SURE۔ کھانے کے بعد آ جاؤ۔ ہم نے بھی ایک بات کرنی ہے تم سے۔“

بات کرتے کرتے اُن کے لب دھیمے سے متسم ہو گئے۔ ایک نظر غور سے اُسے
دیکھا۔ اور جانے کے لئے قدم بڑھا دیئے۔

اُس نے پڈنگ کا آخری چمچ لیا اور نیپکن سے ہاتھ لو پچھ لئے۔

ناظم نے آگے بڑھ کر بھاری سی کرسی پیچھے کھسکائی۔ اور شان
اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ سوچتے ہوئے۔

امید و بیم کی حالت میں۔

اُس نے بابا جان کے بیڈ روم کے دروازے پر ہولے سے

دستک دی۔

”COME IN۔“ اُن کی بھاری۔ بارعب آواز آئی۔

اور شان کو۔ اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔

اُس نے آہستہ سے بھاری دروازہ داکیا۔

اندر داخل ہوا۔ اور پھر دروازہ برابر کر دیا دوبارہ سے۔

بابا جان اپنے شاندار بیڈ پر تکیوں کے سہارے لیٹے کسی کتاب

کی اسٹیڈی میں مصروف تھے۔ وہ آہستہ قدم آگے بڑھا۔

بابا جان نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ چشمہ اتار کر بیڈ سائیڈ

ٹبل پر رکھا۔

"آؤ۔ بیٹھو۔ انہوں نے قریبی صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

شان مودب طریق سے بیٹھ گیا۔

"تم کچھ پریشان لگتے ہو۔ ہو گا کوئی کاروباری پروبلم۔ قبل اس کے کہ

تم اپنی بات بتا کر ہمیں بھی پریشان کرو۔ ہم تمہیں ایک اچھی خبر سناتے

ہیں۔" بابا جان اس دقت بڑے بڑے میں لگ رہے تھے۔ ایسی طمانیت

اس نے کم ہی اُن کے چہرے پر دکھی تھی۔ دھیرے دھیرے مسکرا بھی رہے

تھے۔ "ہم نے تمہارے لئے ایک بہت خوبصورت، بہت اچھی

لڑکی پسند کر لی ہے۔" اور شان کا۔

تھوڑی دیر قبل بیٹھتا محسوس ہوتا دل جیسے بیٹھ ہی گیا۔

"تمہیں معلوم ہے۔ ہم ایک عرصہ سے اسی کوشش میں لگے ہوئے

تھے۔ کبھی لڑکی اچھی ہوتی تو گھرانہ اچھا نہ ہوتا۔ کبھی گھرانہ اچھا ہوتا تو

لڑکی ہمارے معیار پر پوری نہ اُترتی۔ اب تو پسندانے جیسے بیٹھے بٹھائے

آرزو پوری کر دی۔ جیسے ہم چاہتے تھے ویسی ہی ہے۔
 وہ دم لینے کو رُکے۔ ایک نظر شان پر ڈالی۔ سکرائے۔
 ”تم دیکھو گے تو داد دو گے۔ اپنے بابا جان کی پسند کی۔ وہ واقعی
 اسے داد طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

شان نے نظریں اٹھا کر اُکھیں دیکھا۔
 ”اب تم بتاؤ۔ کیا بات کہنی تھی۔ تم نے؟“
 ”کیا خوب۔ دل نے پھڑپھڑا کر کہا۔
 ”کچھ نہیں“ وہ جلدی سے بولا۔
 ”تم کچھ کہنا چاہتے تھے نا ہم سے۔؟“
 ”بھول گیا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔
 ”تم تھکے ہوئے لگتے ہو۔ جاؤ آرام کرو۔ انہوں نے دوبارہ
 تاب اُٹھالی۔

آرام۔؟ اُس کے لبوں پر تلخ تبسم ابھر آیا۔
 ”گڈ ٹائٹ۔ بابا جان۔!“
 ”گڈ ٹائٹ۔“ ایک نظر اُسے جاتا دیکھنے کے بعد اُکھوں نے کہا۔

رات۔ کریم بابا دودھ کا گلاس لئے اندر داخل ہوئے۔ تو
شان کو بے قراری سے ہٹلتے پایا۔

بے چین آنکھیں۔ پریشان چہرہ۔ ہاتھ پیچھے کی طرف باندھے۔
یہاں سے وہاں ہٹلتے۔ اُسے جیسے کریم بابا کے اندر آنے کا پتہ
ہی نہیں چلا۔

کریم بابا کی بوڑھی تجربہ کار آنکھیں۔ شان میں بہت دنوں
سے تغیر محسوس کر رہی تھیں۔

اور پھر۔ اس وقت یہ حالت۔ کریم بابا کا ماتھا ٹھنکا۔
کوئی تو ایسی بات تھی۔

جو اُسے یوں بے قرار کئے ہوئے تھی۔

”چھوٹے صاحب! یہ دودھ پی لیجئے۔ ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

چونک کر وہ رُک گیا۔ بابا کو دیکھا۔

”ماما کو بھیج دیں۔ بابا۔!“

”اچھا صاحب!“ انہوں نے کہا۔

اور وہ اُنٹے قدموں واپس چلے گئے۔

اس وقت اُس سے مزید بات کرنے کی وہ اپنے میں ہمت

نہیں پا رہے تھے۔

شان صوفے پر جیسے گر پڑا۔

چند لمحے بے قراری سے سر صوفے کی پشت پر ادھر سے

ادھر ڈالتا رہا۔

پھر کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے ہوئے سر دونوں ہاتھوں

میں تھام لیا۔

”شان بیٹے! کیا بات ہے۔؟“ ماما پریشان سی اندر

داخل ہو گئیں۔

وہیں ہاتھوں میں سر تھامے اُس نے بے چین نظریں اٹھا کر

ماما کو دیکھا۔

”ماما صدفے جائے کیا ہوا۔؟“ ماما نے پاس آتے ہوئے اُس کا سر

اپنے پہلو سے لگا لیا۔ ”بڑے صاحب نے انکار کر دیا۔“

وہ چپ چاپ اب بھی ماما کو گھورے جا رہا تھا۔

”مجھے معلوم تھا۔ بیٹے۔ بڑے صاحب اس لڑکی کو کبھی قبول

نہیں کریں گے۔ بچہ شاندار حویلی۔ نہ کھاؤں۔ نہ کھاڑیاں۔ نہ نوکر چاکر اور

پھر آج کل کی لڑکیاں اکھیں کب پسند آتی ہیں۔

”ماما۔“ اُس نے کرب سے سر ہلایا۔ ”ایسا بات نہیں ہے۔ میں نے تو ابھی اُن کو بتایا بھی نہیں۔“

”پھر کیا بات ہے۔؟“ ماما کا دل دھک سے رہ گیا۔

کیا بات ہو سکتی تھی؟ وہ اُس قدر پریشان کیوں تھا۔؟ اُسے کیوں بُلا یا تھا۔؟

”بابا جان نے ہمارے لئے لڑکی ڈھونڈ لیا ہے۔“

”لڑکی ڈھونڈ لی ہے۔؟“ وہ حیرانگی سے کہنے لگیں۔ پھر رُک سی گئیں۔

”تو تم اپنی پسند کا بھی اظہار کر دیتے۔؟“

”میں نہیں کر سکا۔ نہیں کر سکوں گا۔“ اُس نے بے قراری سے سر صوفے کی پشت پر ڈال دیا۔

”بات پکی کر لی ہے کیا۔؟“

”کیا مطلب۔؟“ وہ عورتوں کی باتیں زیادہ نہ جانتا تھا۔

”میرا مطلب ہے۔ لڑکی داؤں سے لڑکی کو مانگ لیا ہے؟ انھوں نے منظور کر لیا ہے۔؟“

”مجھ کو کچھ نہیں معلوم۔ مگر آپ کو بابا جان کا عادت معلوم ہے۔

وہ جوارادہ کرتا ہے۔ پورا کرتا ہے۔“

”تم ذکر تو کر د اُس لڑکی کا جو تمہیں پسند ہے۔“ ماما نے تنکے کا

سہارا لیتے ہوئے کہا۔

"فائدہ۔؟" اُس نے پوچھا۔

"آخر تم اُن کی اولاد ہو۔ اچھی عقل والی عمر ہے۔ شاید وہ سوچ لیں کچھ۔"

"مجھ کو کوئی امید نہیں ہے۔" مایوسی کہتے ہوئے اُس نے سر دوبارہ ہاتھوں میں تھام لیا۔

"نہیں بیٹا۔ مایوسی گناہ ہے۔ میں بات کروں گی۔ بڑے صاحب سے۔" اُنھوں نے اُس کا سر سہلاتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"اُن کا بات پتھر کی لکیر ہو تل ہے۔"

"میں بھی بات کروں گی۔ ناصر بیٹے کو بھی خط ڈلواتی ہوں۔ وہ بھی آکر صاحب کو سمجھائیں گے۔ مگر تم خود بھی بات کرنا۔ شان کچھ سوچ میں پڑ گیا۔"

ناصر کو تو وہ پہلے ہی لکھ چکا تھا۔ مگر ابھی تک ظاہر ہے۔ اُس نے بابا جان سے کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ اس معاملے میں۔

اور اب۔ اب تو ناصر کچھ کہتا بھی تو بے کار تھا۔ جانے کیوں اُسے پکا یقین تھا۔

"اس طرح اپنی جان ہلکان مت کرو پہلے بات کر کے تو دیکھو۔" ماما کی نظر میز پر رکھے دودھ کے گلاس پر پڑی۔ دودھ پڑے پڑے ٹھنڈا ہو گیا ہو گا۔ آگے بڑھ کر اُنھوں نے گلاس کو ہاتھ لگایا۔ ابھی بھی پینے کے قابل تھا۔ مگر شان بہت گرم دودھ پیتا تھا۔

گرم کر لاؤں۔؟“ ماما نے کہا۔

”نہیں پیوں کا ماما۔ طبیعت نہیں چاہتا۔“ اُس نے سرانکار میں ہلا دیا۔

”پی لو بیٹا۔“ وہ گلاس قریب لے آئیں۔ ”کہو تو گرم کر دوں۔؟“
 ”اچھا ٹھیک ہے۔ ایسا ہی دے دیں۔“ اُس نے گلاس تھام لیا۔
 اور پھر۔ آنکھیں بند کر کے غٹا غٹ پی گیا۔ جیسے وہ کوئی
 بد ذائقہ دوا ہو۔

”اب سو جاؤ بیٹا۔ میں کل بڑے صاحب سے بات کروں گی۔“
 اور شان نے۔ ایک گہری سانس لی۔
 پھر اٹھ کر باتھ روم چلا گیا۔ ماما وہیں رہیں۔
 باتھ روم سے واپس آنے کے بعد وہ تھکا۔ مضمحل سا بستر میں
 لیٹ گیا۔

”لائٹ آف کر دیں ماما۔“

اور۔ ماما نے بتی بجھا دی۔

”شب بخیر۔ ماما۔“ اُس نے تھکے سے لہجے میں کہا۔

”شب بخیر بیٹا۔“ ماما نے جواب میں کہا۔ اور

ماما اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے کچھ سوچتی ہوئیں۔
 کوری ڈور میں نکل آئیں۔

ساری رات اُسے نیند ہی نہ آئی۔

کبھی اس کو بٹا۔ کبھی اُس کو روٹا۔

سوچ سوچ کر ذہن جواب دینے لگا تھا۔

”ٹن... ٹن... ٹن... ٹن... ٹن...“ اُس کی آنکھ کھل گئی۔

بڑے سے کو ریڈور کے آخری سرے پر لگے کلاک نے پانچ

بجائے تھے۔

صبح کے قریب کہیں شاید اُس کی آنکھ لگی تھی۔

اور۔ آنکھ کھلتے ہی پہلا خیال اُسے پھر وہی آیا۔

کیبل پرے ہٹا کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

باتھ روم گیا۔ نیم گرم پانی سے نہایا۔

تیار ہوا۔ ناشتہ کیا۔

اور سوچوں کی ادھیڑ بن میں۔ چل پڑا۔

وہ ابھی ابھی کوٹھی پر پہنچا تھا۔ تمکا تھا۔ مفتحل سا۔
 جسمانی طور سے کہیں زیادہ ذہنی طور پر۔
 پہلے وہ سیدھا سائٹ پر چلا گیا تھا۔ کام دیکھا تھا۔ گھنٹہ بھر
 وہاں رہا تھا۔ اور اب یہاں آ گیا تھا۔
 ڈرائنگ روم میں بیٹھا ابھی کافی کا دوسرا گھونٹ ہی لیا
 تھا۔ کہ ناظم ڈاک رے کرا گیا۔
 ”آپ کی ڈاک ہے صاحب۔“ اُس نے ڈاک کی ٹرے اُس کے
 سامنے میز پر رکھ دی۔
 ”ٹھیک ہے جاؤ۔“ اُس نے کہا۔
 کئی خطوط تھے۔ کاروباری و غیر کاروباری۔
 ناصر کا بھی تھا۔ اُس نے فوراً اٹھالیا۔
 ”..... چند ایک کام ہیں۔ ختم ہوں گے تو ماموں جان سے بات

کریں گے۔ ہمارے بارے میں“

ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد خط کے آخر میں ناصر نے اُس کی بات کالیوں ذکر کیا تھا۔ جیسے اُس کی بات کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ اُسے غصہ آگیا۔

اُس نے کتاب بے قرار ہو کر، بے چین ہو کر بے بس ہو کر اُس کا سہارا لیا تھا۔ اور یہ جواب دیا تھا اُس نے۔

”ہو نہ۔“ وہ بڑبڑایا۔ خط ایک طرف پرے ڈال دیا۔ ”کسی میں بھی ہمت نہیں ہے۔ میں خود کروں گا بات۔“

کوئی پی کر اُس نے باقی کے خطوط بھی دیکھ ڈالے۔

بیڈ روم گیا۔ چند ضروری ٹیلی فون کالز کئے۔

پھر اپنے آفس گیا۔ اور دیر تک اپنی اے سے مختلف نوعیت کے خطوط ٹائپ کرتا رہا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد اُس نے تھوڑا آرام کیا۔ اور دوبارہ سا^ٹ پر چلا گیا۔

شام گہری ہو چلی تو کوٹھی پر واپس آگیا۔

بالکونی میں آرام چیر پر بیٹھا۔ نواحی بستی کی جلتی بتیاں دیکھتا رہا۔

کچے پکے، اونچے نیچے۔ پہاڑی مکانوں کی بتیاں۔

جیسے۔ ڈھیر سارے ستارے بھٹک کر آسمان سے زمین پر

اُتر آئے ہوں۔

اُس کا تھکا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔
ناصر کا رد کھاسا جواب۔

بابا جان کا اُس کے مستقبل اور اُس کی زندگی متعلق حتمی فیصلہ
پچھلی رات۔ اُس کی ماما سے بات چیت۔

اور آخر میں۔ زی۔ کتنا چاہتا تھا۔ وہ اُس کو۔

اُسے تو اب معلوم ہوا تھا۔ پیار ہوتا کیا چیز ہے۔؟ ناصر بھی تو
اتنا مارا مارا پھرتا تھا۔

مگر، ہونہ۔ اس کا کیا پیار ہو گا۔

آج ایک سے۔ کل دوسری سے۔ اُس کی چاہت میں کیا شدت
اور جھبی تو۔

وہ صرف مارا ہی مارا پھرتا تھا۔

پاگل نظر نہیں آتا تھا۔

خود وہ تو پاگل تھا۔ زی کے پیار میں۔

کسی اور لڑکی کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونکا۔

مینٹل پیس پر رکھے ٹائم پیس کی طرف دیکھا۔ پورے نو بجے تھے۔

اُس کے کھانے کا ٹائم ہو چکا تھا۔

”یس بابا۔“ یا بابا اندر آئے۔ پھر بالکنی میں۔

اور کھانا میز پر لگنے کی اطلاع دے کر واپس چلے گئے۔

اُسے بھوک ہی نہیں تھی۔ نڈھال سا محسوس کر رہا تھا۔

تھکے تھکے سے قدم اٹھاتا وہ ڈائننگ روم تک گیا۔ وہیں ناظم میز کے پاس کھڑا اُس کا منتظر تھا۔

مؤدب طریق سے اُس نے شان کی مخصوص کرسی پر بٹھکائی۔

”تھینک یو۔“ وہ بلیٹھ گیا۔

ناظم نے بڑا سافید نیپکن اس کے آگے پھیلا دیا۔ اور پھر اُسے SERVE کرنے لگا۔

مگر سوپ پی کر ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کی بھوک ہی چند دنوں سے برائے نام رہ گئی تھی۔

واپس بیڈ روم میں آیا۔ کریم بابا وہیں تھے۔

رات کے کپڑے بدل کر وہ بستر پر چلا گیا۔

کریم بابا نے حسبِ عادت اُس کے اوپر کیبل درست کئے۔ نیلی جی جلاتے ہوئے دوسری لائٹ آف کر دی۔

”شب بخیر بابا۔“ شان نے کیبل کندھوں تک پہنچائے۔

”شب بخیر بیٹا۔“ بابا اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے کمرے سے چل دیئے۔

اُس نے سونے کی کوشش کی۔ مگر۔ نیند کہاں؟

اُسے تو ایک ہی فکر لگی ہوئی تھی۔ زی کی۔

اُس کو اپنانے کی۔

ہاتھ بڑھا کر اُس نے لیمپ آن کیا۔
 بیڈ سائیڈ ٹیبل کے دراز میں سے پین اور پیڈ نکالا۔ تکیوں کے
 سپہارے بیٹھ گیا۔

اور بابا جان کو مخاطب کرنے لگا۔

..... ساری زندگی اکٹھی گزارنے کا سوال ہے۔ بابا جان۔ پلیر۔

یہ ایک درخواست ہے۔ آپ اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کریں۔ میں نے
 اُس لڑکی سے شادی کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ میرے ساتھ ساتھ کسی
 اور کی زندگی خراب کرنے سے کیا فائدہ.....

لب لباب کچھ اسی قسم کا تھا۔

بہر حال۔ خط لکھ کر اُسے ایک گونہ سکون ملا۔

لغافہ میں بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ لیمپ آف کیا۔

اور صبح سویرے ہی ناظم کے ہاتھ اسے بابا جان کے پاس گاؤں بھیجنے

کا ارادہ کر کے لیٹے ہوئے پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

صبح آنکھ کھلتے ہی اُس نے گھنٹی بجائی۔

کریم بابا آئے تو اُن سے ناظم کو بھجوانے کو کہا۔

اور خود حسبِ عادت اپنی صبح کا آغاز نماز سے کرنے کی غرض سے

بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

ناظم کو خط دے کر روانہ کرنے کے بعد ہی اُس نے اپنی بیڈ ٹی لی۔

اور پھر۔ روزمرہ کے معمول میں مصروف ہو گیا۔

آج تیسرا دن تھا۔ ناظم کو یہاں سے روانہ ہوئے۔ اُسے شدت سے
اُس کی واپسی کا انتظار تھا۔ وہاں رُکے بغیر جیسا کہ شان نے اُسے کہا
تھا۔ چل پڑتا تو آج رات تک پہنچ جاتا۔

اب تک بابا جان کو اس کا خط تو دے چکا ہو گا۔ سائٹ پر
کام کراتے کراتے اُس نے کئی بار سوچا۔

اور پھر رات وہ سونے کی تیاریوں میں مصروف ہی تھا کہ ناظم
واپس پہنچ گیا۔

بابا جان تو وہیں تھا نا؟ یہ سچ کمرے میں کھڑے شان نے
ناظم سے پوچھا۔

”جی۔ یہ خط دیا ہے بڑے صاحب نے۔“ اُس نے جیب سے
خط نکال کر شان کی طرف بڑھایا۔

ادہ۔ تو اتنی جلدی جواب بھی دے دیا انہوں نے۔

وہ تو دنوں بعد کسی جواب کی توقع رکھے ہوئے تھا۔

”کھٹیک ہے۔ تم جاؤ۔“ اُس نے کہا۔

اور ناظم واپس چلا گیا۔

خط کھول کر وہ سامنے رکھے سو فے پر جا بیٹھا۔

”تم نے غلط جگہ درخواست دی ہے۔ شاہان احمد اپنے ایک بار
کہے ہوئے فیصلے پر کبھی دوبارہ غور نہیں کرتا۔ کسی لڑکی سے شادی کا وعدہ

سنے سے پہلے تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ تمہارے لئے لڑکی پسند کرنا۔
 ہمارا کام ہے۔ تمہارا نہیں.....“

اور۔ اور۔ مزید پاگل ہوتے ہوئے وہ کوٹھی سے باہر نکل آیا۔
 ہراساں ذہن لئے۔ کتنی دیر اندھیروں میں کھٹکتا رہا۔ سوچ
 سوچ کر ہار گیا۔

خط سے صاف ظاہر تھا کہ بابا جان کے کئے گئے فیصلے میں کسی
 بچک کی گنجائش نہ تھی۔

اور مزید اُن سے کچھ کہنا۔

اُن سے ٹکر لینے کے مترادف تھا۔

اور۔ بابا جان سے ٹکر لینا۔

کیا ایسا ممکن تھا۔؟

نڈھال سا وہ واپس کوٹھی میں آیا۔

اور بستر پر پڑ کر بے قراری سے کروٹیں بدلنے لگا۔

اگلے دن کا طلوع اُس کے لئے پریشانیاں ہی لایا۔
 آنکھ کھلتے ہی اُسے اُن ہی سوچوں اور فکروں نے آن گھیرا۔
 سائٹ پر کام کرواتے ہوئے بھی وہ بات بے بات غصہ ہو
 جاتا تھا۔ حواس جیسے کام ہی نہیں کر رہے تھے۔
 اور پھر چار بجتے ہی وہ زی کی طرف روانہ ہو گیا۔
 بے چین بے قرار سا۔ پہاڑی کی گول دار چکر دار سڑک پر اپنی
 نئی مرسیڈیز بھگائے چلا جا رہا تھا۔
 ایسی وحشت سمانی تھی من میں کہ باوجود کریم بابا کے اصرار کے
 انہیں بھی ساتھ لے کر آنے سے انکار کر دیا تھا۔
 وہ۔ ہوٹل پہنچا۔
 نیم گرم پانی کا شاور لیا۔ طبیعت کچھ بحال ہوئی۔
 بیرا چائے لے آیا۔ پی کر سکون سا ہوا۔

پھر وہ جلدی جلدی تیار ہوا۔

زی سے ملنے کے لئے۔

گو کہ دل مایوسیوں اور اُداسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا
چلا جا رہا تھا۔

زی کے پاس جانا۔ اُس سے ملنا۔ مزید دکھوں اور پریشانیوں
کا پیش خیمہ تھا۔ وہ اُس کی بن تو نہ سکتی تھی۔

مگر۔ وہ اُس سے ملے بغیر بھی تو نہیں رہ سکتا تھا۔

موسم کافی بدل چکا تھا۔ سفید براق قمیض اور قمیٹی گریے پیٹیٹ
میں وہ خاصا اچھا محسوس کر رہا تھا۔

گاڑی میں بیٹھ کر وہ تیزی سے ہوٹل کے گیٹ سے نکلا۔

شام کے ملگجے سائے پھیلنے لگے تھے۔ موسم بے حد خوشگوار ہو رہا
تھا۔ سڑک کے کنارے لگے پھولدار درختوں میں کلیاں پھوٹ آئی تھیں۔
فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ پودوں میں کھلے شگوفے مدہوش کن ہلکے
بکھیر رہے تھے۔

وہ موڑ کاٹتے ہوئے گولف کلب کے ساتھ ساتھ چلتی سڑک پر ہولیا۔
کلب کی گھنٹی باڑھ بنائے اُن گزت جنگلی گلاب شام کے پھیلنے
سایوں کی منہجی روشنی میں ستاروں کا روپ چرائے لگا رہے تھے۔ مدہم
خرام ہوا۔ سامنے کی سڑکوں کی کھیتی بہت جھولے تھول رہی تھی۔
یہ وہی کھیتی تو تھی۔

اُسے اب بھی اُس کا اُس کے ساتھ ساتھ چلتے اچانک ہی پاؤں
میں زخم لگنا یاد آیا۔

اُداس سی مسکراہٹ اُس کے لبوں کو چھو گئی۔

وہ اب بھی کھیتی کی اُسی پگڈنڈی کو دیکھ رہا تھا۔
کھیتی اب اُس کے دائیں ہاتھ پر تھی۔ اور پگڈنڈی اُس کے متوازی
معاً وہ چونکا۔ گولف کلب کے گیٹ سے زنی نکل رہی تھی۔
اُس نے سر باہر نکال کر مڑ کر دیکھا۔

زنی ہی تھی۔ !

اُس کے پیچھے۔ اُس کے دائیں۔

کھیتی کے پیچھے سرے پر کھلنے والے کلب کے گیٹ سے۔
وہ ہی تو نکلی تھی۔

شام کے وقت۔ زنی گولف کلب میں۔ ؟

اکیلی۔ ؟ ایک پل کو اُسے شکوک نے آن گھیرا۔

اُس نے REVERSE گیزر لگا دیا۔

گاڑی بیک کرنے ہی لگا تھا۔ کہ

اُسی گیٹ سے ناصر برآمد ہوا۔

”ادہ۔ پروردگار۔“ اُس کا مرجیے چکر اکرا سپر فک سے جالگا۔

توزی اکیلی نہیں تھی۔

ناصر تھا۔ اُس کے ساتھ۔

اور پھر۔ جیسے اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ چند لمحے تو اُسے کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔

پھر۔ حواس مجتمع کر کے اُس نے اسٹیرنگ سے سر اٹھایا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی۔ اُس نے دوبارہ دیکھا۔
 ”اوہ گوڈ۔“ زرین پیچھے تھی۔ ناہرا ایک قدم آگے۔ کوئی رکاوٹ تھی شاید راستے میں۔ زرین وہیں رُک گئی تھی۔

ناہر پیچھے مڑا۔ ہاتھ بڑھایا۔
 اور زرین نے بلا جھجک اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ رکاوٹ غور کر لی۔
 اور پھر۔ ناہرا پتا ہاتھ زرین کے کندھے پر رکھے۔ دونوں کندھے سے کندھا جوڑے۔ اُسی پگڈنڈی پر۔
 جس پر جہینہ بھر قبل زرین اُس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔
 ہنستے مسکراتے آگے بڑھ رہے تھے۔

شام کے سائے اگرچہ پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔
 مگر۔ اتنے بھی نہیں کہ۔ زرین اور ناہر کو چھپا سکیں۔
 اُسے اچانک ہوش آیا۔
 مبادا۔ اپنی مدہوشی سے چونک کر اُن کی نظر اُس پر پڑ جائے۔

اور یہ تذلیل۔!
 اُسے کسی قیمت گوارا نہ تھی۔
 آہستہ سے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اور سیدھا آگے نکل گیا۔

اچھا تھا۔ وہ جیب نہیں لایا تھا۔ ادھر یہ گاڑی۔ یہ تو ابھی
ناصر نے بھی نہیں دیکھی تھی۔ ابھی چند دن قبل پہنچی تھی۔ اُس کو
ایک گونا اطمینان ہوا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے دیو مر رہیں سے دیکھا۔

دونوں مست تھے۔ اپنے حال میں۔

اُن کو اتنی فرصت ہی کہاں تھی۔ کہ اُس کی یا اُس کی گاڑی
کی طرف توجہ دیتے۔

وہ سیدھا ہوٹل پہنچا۔

الٹا سیدھا سوٹ کیس میں سامان ٹھونسا۔

روم سروس کے نمبر ڈائل کئے۔

اپنے واپس جانے کی اطلاع کرنے ہی لگا تھا۔ کہ دروازے
پر دستک نے چونکا دیا۔

”یس“ وہ منتظر ساد بکھنے لگا۔

ادھر۔ لمحوں میں ہی بھاری بھر کم جانِ عالم صاحب اندر
تشریف لائے۔

”تھوڑی دیر پہلے ہوٹل کے میجر سے معلوم ہوا کہ تم آئے ہو۔
مگر باہر نکلے ہو۔ لہذا میں نے انہیں کہہ دیا کہ جوں ہی تم آؤ
مجھے مطلع کر دیں۔ بیٹا۔ آتے ہو تو کم از کم اطلاع تو کر دیا کرو۔
بابا جان کیسے ہیں۔ تمہارے؟“

ادھیڑ عمر جانِ عالم صاحب نے لمبی چوڑی ہمتید کے ساتھ اس کے
 بابا جان کی خیریت پوچھی تو وہ نام سا نظر آنے لگا۔
 ریسورڈ واپس کر یڈل پر رکھ دیا۔
 ”تشریف رکھیں انکل“ وہ جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے بولا۔
 اور۔ جانِ عالم صاحب کھڑکی کے قریب رکھے گزار صوفے
 پر بیٹھ گئے۔

”بابا جان ٹھیک ہے۔ آپ کیسا ہے؟“ پچھلے حادثے کی تلخی
 ایک طرف جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ مخلص سے جانِ عالم
 کی طرف متوجہ ہوا۔

”ٹھیک ہوں بیٹا۔ بس گزر رہی ہے اب تو زیادہ کام فخرِ عالم
 کے سپرد کر دیا ہے۔ وہ ہمت نہیں رہی اب۔“
 اُن سے باتوں کے دوران ہی اُس نے چلے کا آرڈر دیا۔
 اور پھر تھوڑی دیر میں وہ پُر تکلف چائے میں نہ چاہتے ہوئے
 بھی جانِ عالم صاحب کا ساتھ دے رہا تھا۔
 باتوں ہی باتوں میں رات کے دس بج گئے۔
 چونکہ کر جانِ عالم صاحب نے گھڑی دیکھی۔ تو جانے کے لئے
 اُٹھ کھڑے ہوئے۔

”بیٹا۔ کل دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ کھالو۔“
 ”ممنور رکھاتا انکل۔ مگر صبح سویرے واپس جانا ہے ضروری کام ہے۔“

میں نہیں کر سکتا۔ البتہ آپ دُور ہمارے ساتھ کھالیں۔

”اوہ نہیں۔ نہیں شکریہ۔ اب تو گھر جا کر بھی نہیں کھاؤں گا۔ اتنا کھا لیا ہے یہاں۔“ انھوں نے میز پر سہوڑ لگے لوازمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جانِ عالم صاحب چل دیئے تو۔ شان سوچ میں پڑ گیا۔ رات خامی گھر آئی تھی۔

اور۔ کچھ حادثے کی جان یوں تلخی میں بھی جانِ عالم صاحب کی۔ اچانک آمد پر عارضی طور پر سہی، مگر بیک گراؤنڈ میں چلی ضرور گئی تھی۔ اور۔۔۔ پھر رات وہ ادھر ہی رہ گیا۔

ساری رات دہکتے انگاروں اور لپکتے شعلوں میں لوٹ پوٹ ہوتے گزری۔

صبح کے پانچ بجے تھے۔ دھند لگا ابھی چھٹا نہیں تھا۔ کار میں بیٹھا راستے کی پڑتی گولائیاں گھومتا۔ وہ۔ چھوٹے سے اس خوبصورت شہر کو۔

کوسوں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

بائیں طرف گہری کھائی تھی۔ دائیں طرف پہاڑ پر سر بفلک پائینٹر کے نیچوں پر ادھر ادھر بکھرے کچے پکے۔ چھوٹے بڑے مکانات۔ اب بھی دھند میں لیے نظر آرہے تھے۔

ناصر۔ تم کتنے ظالم ہو۔ تمہیں تو کوئی اور بھی مل سکتی تھی۔ کیا ضروری تھا کہ میری ہی چیز پر ہاتھ ڈالتے۔؟ اُس نے دُکھ سے سوچا۔ تمہیں معلوم تھا اچھی طرح۔ میں زندگی میں جس لڑکی سے متاثر ہوا تھا۔ وہ یہی تھی۔ میری خوشی کا تمہیں اتنا بھی خیال نہیں آیا؟

اور۔ پھر۔

پہلی پہلی بار حیب شان اور ناصر موٹر بائیک والے حادثے کے بعد زی کو گھر چھوڑنے جا رہے تھے۔ تو ناصر اُس سے ایک لفظ بھی بولے بغیر اُتر کر اُس کے ساتھ ہولیا تھا۔ زی کو گھر تک چھوڑنے گیا تھا۔ اُس کی اتنی سے بھی ملا تھا۔

پھر اگلے دن ہوٹل میں زی کا فون۔؟

”ناصر صاحب ہوں گے۔؟“ اُس کی آواز اس وقت بھی بہت واضح طور پر اُس کے کانوں میں گونجی۔ اُسے اپنی تپ کی مایوسی بھی صاف یاد آگئی۔

پھر ناصر کا زی کے گھر جانا اور تقریباً سارا دن وہاں رہنا۔

”اچھا بتاؤ۔ اتنا دیر کیا کرتا رہا وہاں۔؟“ اُس نے پہاڑ پر جاتے ہوئے راستے میں ناصر سے کچھ کچھ لہجے میں پوچھا تھا۔

”وہ..... وہ..... بس ڈاکٹر لایا۔ اتنی کو۔ میرا مطلب ہے۔۔

زرین کی اتنی کو دکھایا.....“

”پھر۔؟“ اُس کے اس چھوٹے سے لفظ میں بلا کی بے چینی تھی۔

”پھر کیا۔ بس گپ شپ کرتے رہے۔“

”کیسا لڑکی ہے۔؟“ وہ بے بس سی مسکراہٹ سے یولا تھا۔

اس سوال پر ناہر نے چونک کر شان کو دیکھا تھا۔

یولا کچھ نہیں تھا۔

”چپ کیوں ہو گیا۔؟“ اب کے اُس کے لہجے سے سمجھنا صاف عیاں تھی۔

”سوچ رہا تھا۔“

”کیا۔؟“

”کہ.....“

”کہ کیا جواب دو۔“

”ہاں۔“ ناہر نے کہا تھا۔

”جواب دے بھی کیا سکتے ہو۔؟“ وہ دُکھی تھا۔

”تم یوں جرح کر رہے ہو۔ جیسے میں نے تمہاری کوئی چیز لے لی ہو۔“

”تم یوں جرح کر رہے ہو۔ جیسے میں نے تمہاری کوئی چیز لے لی ہو۔“

تمہاری کوئی چیز لے لی ہو۔ تمہاری.....

صدائے بازگشت بن کر بار بار یہی جملہ بگھلے سسے کی طرح اُس

کے کانوں میں پڑنے لگا۔

”کسی اور کا لیا ہو تو لیا ہو۔ میرا چیز کوئی نہیں لے سکتا۔“ اُسے

اچانک اپنا جواب یاد آ گیا۔

مگر۔ اُسے یاد آیا۔ ناہر نے جواباً یہ نہیں کہا تھا۔ کہ وہ اُس

کہ چیز نہیں لے گا۔

تو گویا اُس کا اُس کی چیز لینے کا ارادہ پکا تھا۔

”..... چند ایک کام ہیں۔ ختم ہوں گے تو ماموں جان سے بات کر لوں گا۔ تمہارے بارے میں.....“ اُسے ابھی چند دن قبل کا نامر کا۔ روکھا سا۔ کارڈ باری ساختہ یا د آیا۔

اور پھر وہ چونکا۔

”نامر مجھ سے بہت اچھا واقف ہے۔ ایک بار کالج اسٹاپ سے زرین کو گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔ تو اُس نے باتوں کے دوران کہا تھا۔
”نامر۔ ک۔۔۔۔۔۔“ وہ فوراً ہی چپ ہو گئی تھی۔

”نامر۔ میرا کزن۔۔۔۔۔۔ وہ جو۔۔۔۔۔۔“ کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ رُخ پھیر کر اُس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

اور۔ زی کا رنگ بدل گیا تھا۔

وہ گہرائی سی نظر آنے لگی تھی۔

”ادہ خدا۔“ یکے بعد دیگرے کسی فلم کی طرح ہر سین اُس کے ذہن کے پردے پر آتا اور جاتا گیا۔

تھک کر اُس نے سر بیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔

وہ اُسے کتنا معصوم سمجھ رہا تھا۔

اور وہ۔ کتنی شاطر نکلی۔

ایک ہی وقت میں نامر سے اور خود اُس سے.....

اور اُس نے سر جھٹکا۔

کسی لڑکی کے لئے اتنی گندی بات خواہ وہ کیسی بھی ہو۔ سوچتے ہوئے اُسے اپنا آپ ذلیل لگنے لگا۔

دائیں طرف۔ پہاڑ کے عقب سے۔ سدا بہار پائینز کے بیچوں بیچ سورج نے جھانکنا شروع کر دیا تھا۔

ہر سو اچالا ہونے لگا تھا۔

درختوں پر اچانک سینکڑوں پرندے ایک ساتھ چہچہانے لگے تھے۔

بائیں ہاتھ ڈھلان پر بنے۔ چھوٹے سے کچے مکان کے آئینے میں ایک

عورت گھاس پھوس کی بنی چھپر میں بندھی بھیڑ کا دودھ دوہ رہی تھی۔

تھوڑی دیر کی خوابیدہ وادی میں زندگی کے آثار جاگ اُٹھے تھے۔

وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔

پھر اُس نے دیکھا۔

قدے فاصلے پر۔ اُس کے بالکل سامنے۔

سڑک سے نیچے گہرائی میں۔

ایک ہی کمرے پر مشتمل ایک چھوٹا سا کچا گھر تھا۔ چھوٹا سا برآمدہ

تھا۔ برآمدے کے ایک سرے پر بنے ایک چوٹھے سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔

ایک جوان لڑکی چوٹھے کے پاس بیٹھی مصروف تھی۔ پاس ہی بان کی

چارپائی پر ایک مرد بیٹھا تھا۔

اُن پر نظریں جمائے وہ آہستہ آہستہ اسی سمت آ رہا تھا۔

لڑکی نے جو لھے پر سے کتلی اٹھائی۔

مرد کے ہاتھ میں پیالی تھی

وہ پیالی میں چائے ڈالتی گئی

مرد اُسے اپنائیت سے دیکھ دیکھ کر مسکراتا گیا۔ اور لڑکی مارے

حیا کے سر پر اور بھی چادر مزید سنوارنے لگی۔

اُس نے ایک گہری اُداس سانس لی۔

کتنی پاکیزگی تھی لڑکی کی ادا میں۔

اُسی کے اُسے انوکھی سی خواہش ہوئی۔

حویلی، کوٹھیاں، ملیں، دھن دولت۔ سب چھوڑ چھاڑ وہ اپنی

کچے، مٹی کے بنے گھر وندوں میں بسر کرے۔

اپنی لوگوں میں گھل مل کر رہنے لگے۔

غریب۔ سیدھے سادے لوگ۔

جھوٹا دریا سے دور۔

قدرت کے قریب۔

اور۔ خدا کے قریب تر شاید۔

کوئی پیدا ہوا تو بھی خدا کی مرضی تھی۔

کوئی چل بسا۔ تو بھی قدرت کو منظور تھا۔

نہ پیدائش کے پس پردہ کوئی سائینٹفک اصول کارفرما تھا۔

نہ موت کا سبب کوئی اور شے تھی۔

ہر بات، ہر کام خدا کی مرضی اور قدرت کی منظوری تھی۔
 ہر کام کو خدا نے لاشریک کا "کُنْ فَاَیْکُونُ" سمجھ کر کتنے بے غم
 تھے یہ لوگ۔ کتنا مضبوط عقیدہ تھا ان کا۔
 اور مزید آگے بڑھتے ہوئے۔

پہلی بار اپنی مرضی سے۔ اُس نے چھوٹی سی کچی سی چائے کی دکان
 کے آگے گاڑی رک لی۔

چھوٹی سی، میلی سی پیالی اُسے بہت اچھی لگی۔
 "ڈبل روٹی ہے۔؟" آج جانے اُسے کیا ہو گیا تھا۔؟ اُس نے
 دکان کے چھوٹے سے رٹکے سے پوچھا۔

"ہنیں صاحب روٹی ہے۔" اُس نے کہا۔
 "اے آؤ۔" اور گرم نرم تندور کی روٹی دودھ پتی چائے کے
 ساتھ کھاتے ہوئے اُس نے سوچا۔

وہ آج تک اس نعمت سے کیوں محروم رہا۔؟
 ناشتہ سے فارغ ہو کر وہ آگے۔ اور آگے بڑھنے لگا۔
 دکھی۔ اُداس۔ بکھرا ہوا۔ لٹا ہوا۔
 چور چور۔ ریزہ ریزہ۔

وہ مرد ہے۔ اپنا دکھ چپ چاپ سمیٹ لے گا۔
 زرین اُس کی تھی ہی نہیں۔ اُس کے لئے کڑھنا کیسا۔؟ وہ کسی
 قسم کی کوئی کمزوری کبھی نہیں دکھائے گا۔
 ”ذیشان کنٹرکشنز“ کے بڑے سے بڑے پاس کار پارک کرتے
 ہوئے اُس نے عزم سے سوچا۔
 اُس کے پی اے نے آگے بڑھ کر اُس کا دروازہ کھولا۔
 نپے تلے قدم اٹھا تا وہ ابھی ابھی کام شروع کرنے والے مزدوروں
 کی طرف بڑھنے لگا۔
 دوپہر تک اُسے سر کھجانے کی بھی فرصت نہ ملی۔
 کتنی ساری فائلیں چیک کیں۔ کئی ٹیلی فون کئے۔ درجن بھر
 خطوط ٹائپ کروائے۔ اور پھر
 پنج کے لئے کوٹھی پر آنے لگا تو اُس نے سوچا۔

پچھلے چند ماہ سے وہ پاگل تو نہیں ہو گیا تھا۔ ؟
 کھانے سے فارغ ہو کر وہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے لیٹا تو
 اُسے اپنا آپ خاصا ہلکا محسوس ہوا۔
 تھکا ہوا تو تھا ہی۔ خود بخود آنکھ لگ گئی۔ اور پھر جاگا تو سرے
 میں ملگیا سا اندھیرا ہو رہا تھا۔

اُس نے چونک کر گھڑی دیکھی۔ چھ بج چکے تھے۔
 ”اوہ۔“ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

چار بجے تو اُسے سائٹ پر جانا تھا۔ منیجر کیا سوچتا ہوگا۔
 اس سے قبل ایسا شاذ ہی ہوا تھا۔ وہ وقت کا بہت پابند تھا۔
 کوئی اور ایسا کرتا تھا تو اُسے غصہ آ جاتا تھا۔ کہلا کہ وہ خود ایسی
 عفت برتتا۔

کوئی ملازم ہی اُسے جگا دیتا۔

مگر۔ کس کی جرأت تھی۔ اُس کے آرام میں مداخلت ہو۔

وہ بستر سے نکلا۔ کال بیل بجائی اور باتھ روم چل دیا۔

منہ ہاتھ دھویا۔ تولیہ سے پونچھا۔ ڈرینگ روم میں آیا۔

قد آدم آئینے میں اپنے سراپے پر نظر پڑی۔

خوبصورت آنکھیں اب بھی۔ پچھلی پریشانیوں کا پتہ دے رہی
 تھیں۔ اُس نے سر جھٹکا۔

کمرے میں آیا۔ نرم دبیر قالین پر الٹا لیٹے ہوئے کئی
 لئے۔

اٹھ کر سیدھا کھڑا ہوا۔

تو طبیعت ہلکی محسوس ہونے لگی۔

آگے بڑھ کر وہ خوبصورت بالکنی میں جا نکلا۔

مطلع صاف تھا۔ نیلگوں آسمان پہاڑ کی محقر سی آبادی کو۔

پتھری کی طرح گہرے میں لئے تھا۔ دور پہاڑ کی سرمئی چوٹی کے پیچھے

ب بھی نارنجی رنگ بکھر نظر آ رہا تھا۔ سرمئی چوٹی کے عین اوپر سرمئی

دل کا چھوٹا سا ٹکڑا۔ اپنے دامن میں تارنجی کنکر ابلے جلنے کہلا

سے کھٹک کر آنکلا تھا۔

دادی کے دامن میں۔ پانی کے تالے کے کنارے کنارے چھوٹا سا

لاریا۔ دن بھر کا تھکا تھکا یا۔ اپنی بھیڑوں کے ریوڑ کو چھوٹا سا کنکر

رک کر منظم کرتا۔ اُن کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ سامنے ہی ڈھلان پر

نے چھوٹے سے کچے گھر میں ایک عورت تندور میں گھاس پھوس چلا کر

بلکتے شعلوں کو دیکھ رہی تھی۔

اُس نے اوپر نگاہ کی۔

پہاڑ کی چوٹی پر بنے کھلونا نما گھر سے اٹھتا دھواں۔ شام کی پکوان

پتہ دے رہا تھا۔ اور۔ نظریں مزید اڑا کر کھینچیں۔

پرندوں کا پہلا غول۔ اپنے آشیانوں کی طرف رواں دواں تھا۔

اُس نے ایک گہری سانس لی۔

سوزدہ ماحول اُس کی آنکھوں کے راستے دل میں اترنے لگا۔ تو۔

وہاں ایک ٹھیس سی ابھری۔

نڈھال ہو کر اس نے ریلنگ کے قریب رکھی آرام چیر کو کھام لیا۔
 کیم بابا چائے دیں لے آئے تھے۔

شان نے اکھن روک لیا۔

تہنائی سے اُسے خوف آنے لگا تھا۔

بابا نے چائے دیں چھوٹی میز پر رکھ دی۔

آرام چیر پر وہ نیم دراز۔ چائے پینے کے دوران بابا سے اکا
 دکا سوال کرنے لگا۔

تو۔ دور فلاؤں میں گھورتے ہوئے اس نے بابا کا ایک بھی
 جواب نہیں سنا۔

اور۔ اپنی چائے کا ہر اگلا گھونٹ بھول بھول گیا۔

”بابا۔ ذرا میرا گن لائیں۔ بارہ بور۔ صاف کروں گا۔“
 ”اس وقت۔؟“ بابا نے حیرت سے کہا۔

”ہاں۔“ اس نے کہا۔

”بہتر صاحب۔“ اور بابا ٹرے میں چائے کے برتن سمیٹنے لگے۔

”صاحب۔ ٹرنر پر کوئی اسپیشل چیز۔؟“ چلتے چلتے بابا پوچھنے

لگے تھے۔

”نو۔ بابا۔“ باوجود ضبط کی کوشش کے اُسے پھر افسردگی نے آ لیا تھا

”کوئی ہلکی سی چیز کھالیں بیٹا۔ میں دیکھ رہا ہوں کئی دن سے

آپ کی طبیعت کچھ سُست لگتی ہے۔" بابا سے بولے بنانے رہا گیا۔ آخر
ان کا بھی کچھ فرض تھا۔ یوں اُسے پریشان اور مضحک وہ بھی تو نہ
دیکھ سکتے تھے۔

"اچھا بابا۔ پکالیں جو آپ کی مرضی ہو۔" وہ بابا کی خاطر بیشاش
بننے لگا۔ "لیکن گن لادیں۔"
"ابھی لایا سرکار۔" آگے بڑھ کر کمرے کی بتیاں جلاتے ہوئے
وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔

ایک اپنا اسلم ہی تو تھا۔ جس کی صفائی وہ خود کیا کرتا تھا۔ تیل
میں نرم فلتیں بھگو کر وہ بندوق صاف کرنے لگا۔ پھر اندر کی نالیاں
ریش سے صاف کر لیں۔
کارٹوس بھر لئے۔

بندوق کا رخ کمرے کی طرف کرتے ہوئے ایک آنکھ میچ کر،
وہ نالی میں سے دیکھنے لگا۔
اور پھر۔ ایک لمحے کو۔

اُسے عجیب سی خواہش ہوئی۔
نشانے کی زد میں بجلی سے روشن دیوار نہ ہو۔
ناہر ہو۔ وہ ٹریگر دبا دے۔ زور کا دھماکہ ہو۔
اور بارود اُس کا سینہ چھلنی کر دے۔ اور پھر۔

اُس چھوٹے دائرے میں اُسے ناصر اپنے نشانے کی زد میں نظر آنے لگا۔

”ہو نہہ“ اُس نے بندوق آنکھ سے ہٹالی۔ تلخی سے بڑبڑاتے ہوئے اُسے اندر مہری کی طرف اُچھال دیا۔ ”اس پر کیا اپنا کار تو اس مصالح کرنا۔ شوٹ تو اُس بے حیا کو کرنا چاہئے“ مزید کہتے ہوئے وہ چیر پیر سے اُٹھ آیا۔

”ہیلو شان“ اُس کے بیڈ روم کے بچوں بیچ کھڑا ناصر تھا۔ لہجے میں کچھ خفت سی تھی۔

”تو واقعی تم تھا“ شان کمرے میں قدم رکھتے ہوئے بولا۔ لہجے کی تلخی صاف واضح تھی۔

”میں تو سمجھا تھا۔ مجھے ہی نشانہ بنانے لگے ہو“ بشارت سے کہے گئے اس جملے میں بھی ندامت کی جھلک تھی۔

”ارادہ تو ہی تھا۔“ ہاتھ دھونے وہ ہاتھ روم کی طرف بڑھا۔ اور شان کی بے رخی محسوس کر کے۔ زندگی میں پہلی بار۔ ناصر کے چہرے پر تاریک سایہ سا لہرا گیا۔

ماتنا کہ شان کو اُس سے گلہ تھا۔

اُس نے، اُس کے بہت بے چین۔ بے حد بے قرار حفظ کا جواب سرسری سادیا تھا۔ بلکہ جو کام شان نے اُس کے پیر کیا تھا۔ اُس کا ذکر مائوں جا مے کرنے کا اُس کتاب تک سرچا بھی نہیں تھا۔

مگر۔ وہ شان کے پاس اُس کے گھر چل کر آیا تھا۔
 کیا گھر آئے شخص کو اس طرح ریسو کیا جاتا ہے۔؟
 اور۔ پھر ناھر کو۔؟ ناھر کو تو شان پر بہت مان تھا۔
 وہ تو خود بھی شرمندہ تھا شان سے۔ مگر۔ کس طرح کرتا وہ
 بات ماماںوں جان سے۔؟

اول تو اپنی بہن کی بات ہوتے ہوئے اُس کا منہ ہی نہیں بنتا
 تھا کہ خود ماماںوں سے اپنی بہن کی بات کرے۔
 دوئم۔ اگر بات رشتہ کی تھی۔ تب بھی بھائی ہونے کے ناطے خود
 بات کرتے ہوئے شرم آڑے آتی تھی۔

تیسرے یہ کہ بعد میں راز کھلتا کہ زین اُس کی بہن تھی اور سب
 اُسے پہلے سے معلوم تھا۔ اُس کے باوجود ماماںوں سے راز پوشیدہ رکھتے
 ہوئے رشتہ کی بات کر دیا تھا۔ تو اکیس یہ سوچی سمجھی ہوئی اسکیم
 معلوم ہوتی۔

اور پھر راز کو اُن سے پوشیدہ رکھنے پر اکیس دکھ الگ ہوتا۔
 یہ سب سوچ کر ہی وہ خاموش تھا۔

اور اسی لئے خط میں بھی شان کو ٹالا تھا۔
 مگر۔ وہ یہ سب شان کو بھی تو نہیں بتا سکتا تھا۔
 کم از کم یہ وقت نہیں تھا۔

ابھی کچھ عرصہ اور رازداری رکھنی تھی۔ بہر حال۔!

”کہاں سے آرہے۔؟“ وہ واپس کمرے میں آکر صوفے پر نیم دراز
 ہوتے ہوئے وہ معنی خیز انداز میں پوچھنے لگا۔
 ”وہ.... اپنے ہیڈ کوارٹر سے.... کیوں؟“ ناصر کو راز بہر حال
 رکھنا تھا۔

”ہیڈ کوارٹر نیچے شہر میں شفٹ ہو گیا ہے۔؟“ دونوں
 ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر اُن پر سر لکاتے ہوئے وہ اُس کی آنکھوں
 میں جھانک کر بولا۔

”کیا مطلب۔؟“ ناصر کا رنگ بدل سا گیا۔
 ”صبح تک میں بھی اُدھر تھا۔“ اُس کا جھوٹا بھانپ کر سامنے
 دیکھتے ہوئے شان تلخی سے بولا۔

اور ناصر نے اُن سُنی کرتے ہوئے کال بیل اُٹھ کر دبا دی۔
 ”اتنی دیر سے آیا ہوں۔ تم چائے کو بھی نہیں پوچھ رہے۔“ ناصر
 وہیں ٹک کر بالکنی کے اُس پار۔ اندھیرے میں چلتے جگنوؤں جیسی
 جگمگ کرتی بستی کو دیکھنے لگا۔

”سوری۔ خیالاً نہیں آیا“ شان نے کہا۔ اُس کے تلخ و تند لہجے
 میں اُداسی اور دکھ خود کرائے۔

”شان“ ناصر ایک قدم چل کر اُس کے قریب آ بیٹھا۔
 ”ہوں۔“ اُس نے صرف اتنا کہا۔

”خفا ہو مجھ سے۔“ ناصر بولا۔

”ہو نہ نہ“ ہاتھ سر کے پیچھے سے نکالتے ہوئے وہ بیدھا ہو بیٹھا۔
 ”اچھا۔ اب کے میں ضرور مانوں جان سے بات کروں گا“ ناصر
 سے اتنا دکھی بھی تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔
 اور پھر۔ یہی دُکھ تو اُس کے غصے میں ڈھلا تھا۔

”I DON'T WANT TO HEAR A WORD ABOUT IT“
 سختی سے کہتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔
 ”شان ہمیں کیا ہو گیا ہے۔؟“ ناصر کو حیرانگی ہوئی۔ شان تو
 بیٹی کیٹس ہی بھول گیا تھا۔

”FOR GOD SAKE NASIR STOP IT“۔ پریشانی سے
 لاکھا دباتے ہوئے وہ ملتچی لہجہ میں بولا۔

اور ناصر کو اُس کی حالت دیکھ کر تشویش کی ہونے لگی۔
 ”شان۔ تم چند دن کے لئے یہاں سے کہیں اور چلے جاؤ.....“
 ”کہاں چلا جاؤں۔؟“

”کہیں بھی۔ نیچے شہر ہی سہی۔“
 ”وہ کس واسطے۔؟“ رخ اُس کی طرف پھرتے ہوئے شان
 جیسے اُسے کاٹ کھانے کو دوڑا۔

اُس کی سُرخ آنکھوں میں وحشت اُتر آئی تھی۔

”میرا مطلب ہے۔ وہاں.....“ وہ زرین کا نام براہِ راست
 زبان پر نہ لاسکا۔

”اوہ گاڈ۔“

تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔

”آجاؤ۔“ ناصر نے کہا۔ اور کریم بابا چلنے کے ساتھ نہڑ بیٹا اور
چکی سینڈویچ لئے اندر آ گئے۔

میز صوفے کے قریب کر کے انھوں نے اُس پر برتن رکھ دیئے۔

اور خالی بڑے واپس لے جانے لگے۔

”بیٹھیں بابا۔ کہاں جا رہے ہیں۔“ ناصر نے بابا کو روک لیا۔ اُن

کی موجودگی میں شاید شان بہتر محسوس کرتا۔

اور واقعی شان بھی آہستہ سے واپس صوفے پر بیٹھ گیا۔

ناصر چائے بنانے لگا۔

”لو شان۔ اُس نے پیالی اُس کی طرف بڑھائی۔

”نہ کھینکس۔ ابھی پیسا ہے تمہارے آنے سے پہلے۔“ اُس کا لہجہ

قدرے نرم پڑ گیا تھا۔

”اچھا یہ لو۔“ اُس نے چائے واپس رکھ کر اُسے نہڑ بیٹا پیش کیا

بالکل یوں جیسے ناصر نہیں، شان باہر سے آیا ہو۔

اور شان نے کانٹے سے ایک پیس اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔

کچھ وہ ابھی چند لمحے پہلے کی اپنی وحشت پریشیمان سا تھا۔

کچھ بابا کی بھی موجودگی کا پاس تھا۔

”چھوٹے صاحب کئی دن سے ایسا کر رہے ہیں۔ کھانا پیتا برائے

لام رہ گیا ہے۔ ناصر بیٹا۔“ بابا نے ناصر سے شان کی شکایت کر دی۔
 ”کھٹیک ہو جھلے گا بابا۔“ ناصر نے سینڈ وچ کی پلیٹ بابا کی
 طرف بڑھائی۔ ”لیں بابا آپ بھی۔“
 ”ارے نہیں بیٹا۔ یہ پھسکی پھسکی چیزیں آپ ہی لوگوں کا دل گردہ
 ہے کھانے کا۔“ مسکراتے ہوئے اکھنول نے انکار کر دیا۔
 اور یہ ”اب کے اُس نے ہنڑ بیف کی پلیٹ آگے کی۔
 ”بیٹا کیوں مذاق اڑاتے ہو۔ یہ اُبلّا اُبلّا گوشت.....
 پھسکی دوا ہو جیسے۔“

اور اُن کی بات پر ایک پل کو شان کے لب بھی متہم ہو گئے۔
 ”شان پلیر۔ ہنسو بولو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔؟“ ناصر سے مسکراتے
 دیکھ کر اپنا نیت سے بولا۔

اور شان اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے ایک گہری
 سانس لے کر رہ گیا۔

”اچھا بابا آپ شان کو اپنی جوانی کا کوئی رومانس سنادیں۔“
 کریم بابا جوانی تو کیا بڑھاپے میں خاصے رومان پر و رواق
 ہوئے تھے۔

گاؤں میں حویلی کی ملازماؤں کے علاوہ حویلی سے باہر بھی
 اُن کے کئی معاشقے چلے تھے۔

اور بابا کو ہنسنے ہنسنے کھانسی نے آیا۔

”آپ بہت شیریں ہیں ناصر بیٹا !

شان دونوں کی لڑکھو ننگ سن سن کر نہ چاہتے ہوئے بھگ
زیر لب مسکراتا رہا۔

پھر شان اور ناصر کھانے کی میز پر آئے۔ تو شان کے ہلکے سے
ڈنر کے علاوہ میز کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک
الواغ و اقسام کے کھانوں سے سجا ہوا تھا۔

شان سمجھ گیا۔ یہ اہتمام ناصر کے لئے ہی تھا۔
”مزہ آگیا۔“ شان کے دائیں بیٹھتے ہوئے وہ کھانے پر پل پڑا۔
شان نے سوپ پیا۔ اور دو چمچ پڈنگ باؤں میں نکال
کھانے لگا۔ مگر ناصر نے خوب سیر ہو کر کھایا۔
”بابا صبح تین بجے جگائیں۔“ ڈیوٹی پر پہنچتا ہے۔“ کہتے ہوئے نا
اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔

شان بھی اپنے کمرے میں آگیا۔
سامنے ہی اُس کے بیڈ کے قریب نیچے قالین پر ناصر کا بیگ تھتا
سار کھا تھا۔ نظریں پھلیں تو صوفے پر پڑے اُس کے والٹا پر جا پڑیں
غیر ارادی طور پر اُسے جنبش ہوئی۔ دو قدم آگے بڑھا۔
جانے کس جذبے کے تحت اُسے کھولا۔
ایک پل کو اُسے چکر سا آگیا۔
زرین کی تصویر سامنے تھی۔

معا دروازے پر دستک ہوئی۔ بابا تھے۔ وہ چونکا۔

”آجائیں“ اور ساتھ ہی اُس نے والٹا حقارت سے ناصر کے
کھلے بیگ میں اُچھال دی۔

ناصر صاحب کپڑے بدلنے لگے ہیں۔ بیگ مانگ رہے ہیں۔ اپنا۔
”لے جائیں“ شان نے بیڈ کے قریب رکھے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

اور پھر صبح کریم بابا اُسے بیڈٹی دینے آئے۔ ناصر کے جانے کا
بتایا۔ تو اُسے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

رات ڈنر پر جو اُسے ناصر کے ساتھ اپنے رویے پر تھوڑی بہت
پشیمانی ہوئی تھی۔ اُس کی والٹا دیکھنے کے بعد جاتی رہی تھی۔ اُس کی
جگہ پھر وحشت نے لے لی تھی۔

رات کروٹیں بدل بدل کے گزری تھی۔

صبح کے قریب ہی شاید آنکھ بند ہوئی تھی۔ مگر۔

کھلتے ہی۔ وہی وحشت۔ رقابت۔ غصہ۔ بے قراری واپس
لوٹنے لگی تھی۔

ابھی ابھی ہیڈ کوارٹر پہنچے ہی فلائنگ آفسر فریڈ نے اُسے
ایک ماہ ٹریننگ کورس کے سلسلے میں اُس کے امریکہ روانگی کی
خبر سنائی۔

"YOU ARE GOING NEXT WEEK" کل دننگ کمانڈر
نصیر احمد سے صبح انفارمیشن مل جائے گی۔ "فلائنگ آفسر فریڈ نے
مزید بتایا۔

یس سے واپس آتے ہوئے برآمدے میں سے گزرنے لگا۔ تو
نظر میں بائیں طرف لگے۔ بچن ہول پر گئیں۔
'N' کے خانے میں کئی خطوط اٹکے ہوئے تھے
رُک کر وہ دیکھنے لگا۔

اُس کے بھی چند خطوط آئے تھے۔ سیمینہ کا خط تھا۔ ایک بینک
سے آیا تھا۔

ایک اور تھا۔ اوپر اس کا پتہ لکھا تھا۔ کونے میں لکھا تھا۔
 "از طرف ماما بقلم خود" اُس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
 ماما کا بہت کبھی کبھی خط آتا تھا۔ یا تو جب ماما اُس کی یاد
 میں بہت بے قرار ہو جاتی تھیں۔ یا پھر جب ماما جانتے سے کوئی
 زوردار قسم کی جھاڑ پڑھاتی تھی۔
 اور ہر لفافے پر اور ہر خط کے آخر میں "بقلم خود" ضرور لکھا ہوتا
 تھا۔ جب کہ ہر خط میں یہ کبھی ضرور لکھا ہوتا تھا۔ کہ یہ خط فلاں فلاں
 سے لکھوا رہی ہوں۔

کتنا پیار تھا۔ ماما کو اُس سے اور شان سے۔
 یونیفارم تبدیل کیا۔ آرام کی غرض سے بستر پر لیٹا تو بیڈ سائڈ
 ٹیبل پر رکھے خطوط اٹھائے۔

پہلے سمینہ کا پڑھا۔ پھر ماما کا پڑھنے لگا۔

"..... ناہر بیٹا۔ شان بہت پریشان ہیں۔ بڑے صاحب کسی
 طور اُن کے پسند کی لڑکی سے، اُن کی شادی کرانے کو تیار نہیں ہیں
 میں نے بھی بڑے صاحب سے بات کر کے دیکھی۔ کریم بھیا نے بھی بہت
 مغز ماری کی۔ شان بیٹے نے خود بھی خط بھیجا تھا۔ اُن کے خط پر
 تو چراغ پا ہو گئے۔ کہ اکھوں نے لڑکی خود پسند کرنے کی گستاخی
 کی کیسے۔؟ مجھے بھی ڈانٹا۔ سچ پوچھو بیٹا۔ میں تم دونوں کی خاطر
 پڑی ہوں یہاں۔ آج کو بیگم صاب زندہ ہوتیں تو کاہے کو اپنی

بے عزتی کیوں ہوتی۔" ناصر کو اچانک ہنسی آگئی۔

خط لکھواتے لکھواتے یہاں آکر ضرور ماما نے نظر کا پشمہ اتار کر
آنسو صاف ضرور کئے ہوں گے۔
وہ آگے پرٹھنے لگا۔

"شان کے دشمنوں کا منہ اتنا سا نکل آیا ہے۔ جب سے پھر آیا
ہی نہیں۔ اور ہاں یہ تو لکھنا بھول ہی گئی۔" جیسے ماما واقعی خود کھڑ
رہی ہوں۔ وہ مزید ہنسا۔

"بڑے صاحب نے شان کے لئے دلہن پسند کر لی ہے۔ انھوں نے
شان کو بھی مطلع کر دیا ہے۔ اب تم ہی کچھ کرو بیٹا۔ تمہاری ہی
آس ہے۔ خط لکھنے میں دیر ہو گئی۔ کیوں کہ ناظم شان بیٹے کے ساتھ
پہاڑ پر تھا۔ آج تھوڑی دیر کو آیا۔ تو بھٹا دیا خط لکھنے کو۔ تم جانا
بیٹا۔ میں جاہل خط لکھنا کیا جانوں ہوں۔"

دعا گو تمہاری

ماما۔ بقلم خود

نوٹ:- اپنی صحت کا خیال رکھنا۔ خیریت کا خط جلدی ڈالنا۔
اور بڑے صاحب سے شان بیٹے کی سفارش فرما کرنا۔
کوئی اور موقعہ ہوتا تو وہ حسب معمول ماما کا پیارا سا خط
پڑھ کر زوردار تہقہہ لگاتا۔

ماما بیگم دوستوں میں اُس کی چڑبن گئیں تھیں۔ مگر۔

پتہ نہیں کیوں؟

”بڑے صاحب نے شان کے لئے لڑکی پسند کر لی ہے۔“ پڑھ کر اُسے دکھ سا ہوا۔

”بڑے صاحب کسی طور اُن کی پسند کی لڑکی سے اُن کی شادی کرانے کو تیار نہیں ہیں۔“ اُس نے دوبارہ خط پر نظر ڈالی۔

اور پھر نہ جانے کہاں سے۔

ایک طنزیہ مسکراہٹ اُس کے لبوں پر آ گئی۔

ماموں جان نے شان کے لئے کسی بہت ہی اونچے گھرانے کی لڑکی پسند کی ہوگی۔

اونچا گھرانہ۔ ہر لحاظ سے اونچا۔

اسی لئے تو اتنا عرصہ کوئی گھرانہ اور کوئی لڑکی اُن کے معیار پر پورا نہ اُترتے تھے۔

شان کی پسند۔ زردین۔۔۔

ایک معمولی سی انیکسی میں ایک غریب ماں کے ساتھ گذر بسر کرنے والی۔ اُن کی نظروں میں کہاں چج سکتی تھی۔

اور پھر اُسے اچانک۔ زندگی میں پہلی بار۔

ماموں جان کی آن سے نفرت سی ہو گئی۔

وہ کسی لڑکی کو اُس وقت ہی قابلِ توجہ سمجھتے تھے کہ۔ پہلے

گھرانے کی تسلی کر لیں۔

”گھرانہ کیسا ہے۔؟ میرا مطلب ہے اچھے لوگ ہونے کے علاوہ اُن کا گھرانہ۔ طور طریقے ہمارے اسٹینڈر کے بھی ہونا چاہئیں۔“ اُسے سمیٹنے کے سلسلے میں کہے گئے ماموں جان کے الفاظ یاد آ گئے۔

پھر گھرانہ اچھا تو تھا۔ مگر بقول اُن کے۔ اُن کے معیار پر صحیح نہیں بیٹھتا تھا۔

اس پر خاصی کش مکش ہوئی تھی۔ اور پھر۔ ماما کی ہی سفارش پر وہ مان گئے تھے۔

پھر وہ اچانک چونکا۔

شاید اس لئے کہ وہ شان نہیں تھا۔ اُن کی اپنی اولاد نہیں تھا۔ اسی لئے شاید۔ انہوں نے۔ زیادہ پروا نہیں کی۔

خط ایک طرف ڈالتے ہوئے وہ دونوں بازوؤں میں سر چھپا کر ٹکیوں پر اونڈھا ہو گیا۔

زرین۔ تم غریب ماں کے بطن سے کیوں پیدا ہوئیں؟
ابو۔ اپنی خوشیوں کی تسکین کے ساتھ ساتھ آپ نے کبھی یہ بھی سوچا تھا۔ کہ زرین کا کیا ہوگا۔؟

دنیا تو پیسہ دیکھتی ہے۔ ماموں جان تو پیسہ بھی خالص دیکھتے ہیں۔ جو پشتوں سے چلا آ رہا ہو۔

باپ کے علاوہ لڑکی کی ماں کی رگوں میں بھی بولتا نظر آتا ہو۔
زرین۔ میری بہن۔ تو ہاری بھی تو کہاں؟

"SHE LOVES ME TOO" شان نے اپنے کچھے فط میں
وضاحت کر دی تھی۔

مانا کہ۔ غریب تم بھی نہیں ہو۔ ابو کا سب کچھ تمہارا بھی تو
ہے۔ مگر۔ اپنی اتنی کو۔ اُن کی غربت کو۔ اُن کے آبائی کچے گھر کو
کہاں چھپاؤ گی؟

اُن کو پشتوں سے کیسے مالا مال کر دو گی۔؟
"اپنی اتنی۔" اپنی سوچی بات پر اُسے مذمت سی ہوئی۔ اُس نے یہ
کیوں نہیں سوچا کہ وہ اُس کی بھی مال ہے۔

ابو کی بیوی۔ اُس کی ماں۔ جیسی بھی ہے۔ جہاں کی بھی ہے۔ اُس
کے باپ نے اُس کے ساتھ نکاح کر کے اُسے اپنے ساتھ ایک براہِ رُک لیا
ہے۔ وہ انہی میں سے ایک حصہ ہے۔ وہ انہی کی ہے۔

وہ سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔ دونوں ہاتھ سر کے نیچے باندھ کر وہ
چھت کو گھورنے لگا۔

اور پھر۔ اُس نے زرین کو جنم دیا ہے۔ اُس کے ابو کی بیٹی کو۔
اُس کی خیر خواہ کو۔ اوہ۔

"اتنی۔" وہ اٹھ کر بستر میں بیٹھ گیا۔ "آپ نے مجھے اس دنیا میں اکیلے
ہونے سے بچا یا ہے۔ آپ بہت عظیم ہیں۔ آپ کی کوئی بے عزتی کرے
گا۔ تو ناصر جان سے گزر جائے گا۔" اُس نے عزم سے سوچا۔

اور اٹھ کر۔ باہر روم چل دیا۔

صبح اندھیرے میں وہاں سے نکلا تھا۔ آکر سیدھا حاضری دی تھی۔
 دو بجے فارغ ہو کر میس میں کھانا کھانے گیا۔ واپسی میں خط لیتے ہوئے
 کمرے میں آیا تھا۔ آرام کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔
 ٹھنڈے پانی کا شاور لیتے لیتے۔

اُسے دو دن قبل انکل و آنٹی ماجد کی آمد کا خیال آیا۔
 ”ہم آپ سے زرین کی بھیک مانگنے آئے ہیں۔ بھابی ہمیں مایوس نہ
 کیجئے گا۔“ انکل ماجد نے کتنے ملتہجی انداز میں کہا تھا۔
 ”ناصر بیٹے۔ ہمیں خالی ہاتھ نہ لوٹانا۔ آنٹی ماجد کتنی اُس
 سے بولی تھیں۔“

اُس نے سوچ کر جواب دینے کا کہہ کر ٹال دیا تھا۔
 شان کی پسند بہر حال اُسے زیادہ عزیز تھی۔ مگر۔
 ”بڑے صاحب نے شان کے لئے دلہن پسند کر لی ہے۔۔۔۔۔ بڑے صاحب
 اسی طور اُن کے پسند کی لڑکی سے اُن کی شادی کرانے کو تیار نہیں ہیں۔“
 ناصر نے ایک تلخ اُداس سانس لی۔

جیسے مائوں جان کے بیٹے کے علاوہ اس دنیا میں لڑکے ختم
 ہو گئے ہیں۔ اُس نے تلخی سے سوچا۔

اور پھر۔ اُس نے سوچا۔ اچھا ہوا۔ اُس نے انکل و آنٹی ماجد کو
 مایوس نہیں لوٹایا تھا۔

ساجد اچھا اور قابل لڑکا تھا۔ سب سے بڑھ کر جانا بے پہچانے لوگ تھے۔

ابو کے وقت کی دوستی تھی آپس میں۔

ہنادھو کمراس نے کپڑے پہنے۔ بالوں میں برش کیا۔ اور کمرے میں آگیا۔ چائے منگوائی۔ اور خود اتنی کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔

”..... اتنی! اگلے ہفتہ امریکہ جا رہا ہوں۔ ایک ماہ کے لئے۔ خرچے کے لئے رقم کل منی آرڈر کر دوں گا۔ باقی اگر ضرورت پڑے تو وہیں بینک سے زرین اپنے اکاؤنٹ سے نکلوالے۔ جانے سے پہلے ملنے نہیں آسکوں گا۔ فون ضرور کروں گا۔ کوئی چیز منگوانی ہو تو۔ پھر بتادیں۔ انکل و آنٹی ساجد اگر پھر بات کریں زرین سے متعلق۔ تو اکیس کہہ دیں میرا انتظار کریں۔ امریکہ سے واپسی پر جواب دوں گا۔ ویسے بڑا کچھ پسند ہے اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔ چوکیدار امید ہے۔ صبح ڈیوٹی دیتا ہو گا۔ اپنے لئے نوکر کا بندورت ضرور کریں۔ کچھ تو آرام ملے آپ کو۔ پتہ نہیں کیوں۔ آج آپ بہت یاد آرہی ہیں۔ زرین سے کہیں زیادہ۔

زرین کو پیار۔ آپ کی دعاؤں کا طالب۔

آپ کا اپنا۔ ناصر

خط ختم کرتے کرتے اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔ پھر پلکیں جھپک لیں۔

بیڈ سائیڈ ٹیبل کے دراز سے لفافہ نکال کر اس میں خط بند کرتے ہوئے ادھر پتہ لکھ دیا۔ اور کمرے سے باہر نکل سامنے والے

لیٹر بکس میں ڈال دیا۔

مختلف سوچیں ذہن میں لئے وہ چائے پیتا رہا۔

اور پھر۔

صبح ڈیوٹی پر جلتے ہی پہلے اپنے ونگ کمانڈر سے ملا۔ ضروری

معلومات اور ہدایات حاصل کیں۔

ماموں جان کو فون پر مطلع کیا۔

باقی کے دن ضروری تیاریوں میں لگا رہا۔

رات زرین سے فون پر بات کی۔

اور صبح دس بجے امریکہ کے لئے چل پڑا۔

لیٹر بکس میں ڈال دیا۔

مختلف سوچیں ذہن میں لئے وہ چائے پیتا رہا۔

اور پھر۔

صبح ڈیوٹی پر جلتے ہی پہلے اپنے ونگ کمانڈر سے ملا۔ ضروری

معلومات اور ہدایات حاصل کیں۔

ماموں جان کو فون پر مطلع کیا۔

باقی کے دن ضروری تیاریوں میں لگا رہا۔

رات زرین سے فون پر بات کی۔

اور صبح دس بجے امریکہ کے لئے چل پڑا۔

فرار کی سوچتا تھا۔

اُس نے گھڑی دیکھی۔ شام کے تین بج رہے تھے۔

”کل میری برتھ ڈے ہے۔ آپ ضرور آئیے گا، اُسے اچانک یاد آیا۔

کل ٹینا اور سینڈھامد علی گاؤں آئے تھے۔ بلکہ بقول سینڈھامد صاحب کے

ٹینا کے گاؤں دیکھنے کا شوق ہی انھیں اس بار یہاں کھینچ لایا تھا۔

اُن کے کہنے پر شان ٹینا کو اُس کی دلچسپی کے مقامات مختلف دکھانے

بھی لے گیا تھا۔ پھر آخر میں اپنے فارمز۔ پولٹری سے ہوتا وہ اُسے اپنے

اصطبل لے آیا تھا۔ ٹینا بہت متاثر نظر آرہی تھی۔

پھر واپس جانے لگے تو ٹینا نے اُسے اپنی راسالگرہ پر انوائٹ کیا۔

اُس وقت اگرچہ اُس نے بلبا جان کی مترشح آمد کا کہہ کر ٹال دیا

تھا اُسے۔ مگر اس وقت نہ جانے کیوں اُسے خیال آیا کہ چلا جائے۔

بچوں سے فرار کا اُسے ہی ایک رابستہ نظر آیا۔

“HAPPY BIRTH DAY TO YOU”

ٹینی کی نظریں انھیں۔ تو پھر چند ثانیے بے یقینی کے عام میں اٹھی

یہاں رہ گئیں۔ لمبا قدر چوڑے شانے۔ پُرکشش نقوش۔ بہترین۔ قیمتی

سوٹ میں میونس۔

ایک بار پھر وہی گریک گورڈ اُس کے سامنے تھا۔ مگر۔

اُس نے پلکیں جھپکیں۔ آج اُس کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔

شیں کا ساتھ اُس کی بے حد خوبصورت آنکھیں بھی دے رہی تھیں۔

"THIS IS FOR YOU MAAM" تحفے کا مٹھلیں پیکٹ اُسے

پکڑاتے ہوئے اُس کی مسکراہٹ قدرے گہری بھی ہو گئی تھی۔

"اوہ۔ ذی شان تھینک یو۔ سونا لیس آف یو۔ مجھے یقین نہیں آرہا کہ یہ واقعی آپ ہیں۔" گفٹ کھاتے ہوئے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کہے۔

"بالکل ہم ہے۔ ذیشان۔ شاہان احمد۔" سرفردے ختم کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

تو بیٹنا کو لگا۔ آسمان جھک آیا ہے۔ اور پھر۔ وہ تو جیسے اپنے آپ کو بھی بھول گئی۔

اور کیوں نہ ہوتا ایسا۔ شان بھی تو تمام وقت اُس کے ساتھ ساتھ رہا۔ باتوں میں، مسکراہٹوں میں۔ اُس کا ساتھ دیتا رہا۔

یہاں تک کہ اُسے الوداع کہنے وہ ہال سے یاہر اُس کے ساتھ گاڑی تک آئی۔

اُسے اگلی شام اکٹھی گزارنے مقامی ہوٹل میں موعود کیا۔ تو وہ بھی اُس کے خوشی خوشی قبول کر لیا۔

گاؤں پہنچا تو رات غاصی ہو گئی تھی۔ حقہ کا سہرا تو کھتا ہی پکڑے بدلتے ہی بستر پر پڑ رہا۔

ایک بل کوزی کا خیال آیا۔ حقارت سے جھٹک دیا۔

آج شام اُس کی اچھی گزری تھی۔ عرصہ بعد ذہن پر کا گراں
 بوجھ کچھ ہلکا ہوا تھا۔

مدتوں بعد لگا۔ ابھی دنیا آیا رہے۔ اور بھی رونقیں ہیں اس
 میں۔ زمانہ بعد احساس ہوا تھا۔ وہ بھی زندہ ہے۔ زندہ رہ سکتا ہے۔
 خواہ مخواہ ہی اُس نے سمجھ لیا تھا۔ اُس کے بغیر وہ نامکمل ہے۔
 زندہ نہ رہ سکے گا۔

”اوہ“ اُس نے کرب سے کروٹ ٹلی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ پھر
 وہی سب کچھ سوچنے لگا تھا۔

ٹینا سے باتوں میں وہ پچھلی باتیں بھول گیا تھا۔ جیسے۔

”ٹینا اچھی تو تھی۔ کتنی خوش رنگ لگ رہی تھی۔ اُس کی قربت
 سے۔ وہ مزید سوچنے لگا۔ اور پھر۔ آہستہ آہستہ نیند کی دادیوں
 میں جا اتر۔

صبح ہوئی آنکھ کھلی۔ جب معمول پھر۔ زی۔ جیسے پلکوں پر
 ہی تو رہتی تھی۔ سامنے آگئی۔

مزید سوچے بنا ہی اُس نے خیال جھٹک دیا۔

کوشش کی ٹینا کو سامنے لایا۔ مگر دل جیسے بیٹھ ہی تو گیا۔

کتنی کھو کھلی تھی کل کی شام۔ ٹینا۔ سب۔ کیسے اُس نے ساتھ

دیا تھا اپنی دیر۔ کیا تھا۔ وہ رب۔ بے حد اجنبی لگا۔

زی۔ پھر دھیرے سے درآئی۔ کتنی اپنی تھی زی کی یادوں کی دنیا۔

اُس کی سوچوں میں کتنی یگانگت تھی۔ اپنائیت تھی۔ گو کہ درد
 تھابے پایاں۔ ترپ تھی بے پناہ۔ مگر اس درد میں بھی اس ترپ
 میں بھی ایک الٹا کھاسا سکون تھا۔ عجیب سا قرار تھا۔
 یہ درد، یہ ترپ اُس کے اپنے تھے۔ کل شام کی دُنیا اس
 کی اپنی نہیں تھی۔

سوچیں خرید آگے بڑھیں۔ بارہا سوچی ہو سوچیں بالترتیب
 سامنے آنے لگیں۔ تو اطمینان سے سوچتے اُس نے سرد و نول بازوؤں
 میں لے کر اُلٹی کروٹ لے لی۔

تبھی سر ہانے پڑی بوٹی والٹ سے ہاتھ ہٹا کر آگیا۔
 نامہ کی والٹ میں زری کی تصویر۔ زری کے متعلق ایسی کون سی
 بات تھی جو سمیکنڈز سے پہلے ہی اُسے یاد نہیں آجاتی تھی۔
 والٹ اٹھا کر اُس نے قالین پر دے ماری۔ وحشت پھر سے
 طاری ہونے لگی تھی۔

کبل پرے ہٹایا۔ ہاتھ روم گیا۔
 فارغ ہو کر تو لیے سے سر رگڑ رہا تھا۔ آئینے پر نظر پڑی۔
 اپنی آنکھوں میں جھانکا۔

نامہ اپنا ہاتھ زرین کے کندھے پر رکھے۔ دونوں کندھے سے کندھا
 جوڑے۔ پگڈنڈی پر ہنستے مسکراتے چلتے نظر آئے۔ اور نڈھال
 ہو کر اُس نے آنکھیں میچ لیں۔

بے قراری سے سرا دھڑ سے اُدھر مارا۔ اور تولیہ ڈرائنگ روم
میں پٹختے ہوئے کمرے میں آ گیا۔

وہ تو اپنے آپ کو بہت خود دار سمجھتا تھا۔ کہاں گئی اس کی خود
داری؟ اُس کے اندر کا شان بولا۔ اور پھر اُسے جیسے ہوش آ گیا۔
وہ اُسے آئندہ کبھی یاد نہیں کرے گا۔ بیچ کمرے میں کھڑے کھڑے
اُس نے فیصلہ کر لیا۔

معا فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ بابا باجوان تھے، شاید۔ لپک کر اُس
نے ریسور اُٹھا لیا۔

”یس ذیشان اپسینگ۔ ادہ۔“ اُس کی آواز پھسکی پڑ گئی۔
”ہاؤ آر یو۔ آئے سی۔ ILL TRY TO COME۔ ادہ۔“ اُس کی
ہنسی کھوکھلی تھی۔ ”ادہ کے I WILL COME۔“ اور نہ تھا سا اُس نے
ریسور کریڈل پر ڈال دیا۔

کل شام تو ایک کوشش تھی۔ دالتہ یا نالدالتہ۔ فرار کی۔
زی کی یادوں سے۔ زی۔ اُسے غصہ آ گیا۔
کیا سمجھتی تھی اپنے آپ کو؟ ہو نہ۔ مٹا ڈالے گا اُس کے ہر نقش
کو وہ۔ اُس نے حقارت سے سوچا۔

یُنیلنے آج شام ہوٹل میں اکٹھے گزارنے کی یاد دہانی کرائی تھی۔
ضرور جائے گا۔ دُنیا صرف زی ہی کے دم سے تو آباد نہ تھی۔
اور پھر۔ شام ٹھیک ساڑھے سات بجے یُنیلنا کی منتظر نگاہیں چمک

ہوٹل کا مستعد بیرا شان کی بھرپور شخصیت سے مرعوب اُس کے لئے دروازہ کھاتے کھڑا تھا۔
 گریک گود آہستہ آہستہ اُس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ خدوخال میں وہی بے پناہ کشش تھی۔
 ڈارک براؤن گھنے بانوں کا وہی مخصوص انداز تھا۔ لباس حسبِ معمول سوبر اور قیمتی تھا۔ مگر چال نہ حال تھی۔
 ’ہیلو، کہا۔ تو مسکراہٹ نے ساتھ نہیں دیا۔ نظر میں تو چمک معدوم ہو گئی۔ ٹینا بچھڑی گئی۔ شان کل شام کی طرح ہشاش بشاش نہیں تھا۔

”YOU ARE NOT FEELING WELL“ جو کس پیٹے پیٹے ٹینا نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔
 ”I'M QUITE ALLRIGHT“
 ”پھر چپ کیوں ہیں۔؟“ ٹینا نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”ہتھیں ایسا نہیں ہے۔“ اُس کا ہاتھ ٹینا کے ہاتھ میں ان ایڑی محسوس کر رہا تھا۔

”COME ON SHAAN“ اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے ٹینا نے بغور اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔
 شان نے خاموشی سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

جوس کا خالی گلاس میز پر رکھا۔ ٹانگیں میز کے نیچے ہی پھیلائی۔
سرکری کی پشت سے ٹکایا۔ اور آنکھیں موند لیں۔

”کچھ بولیں نہ“ ٹینا نے کہا۔

”کیا بولے“ شان نے تھکی تھکی آنکھیں اٹھائیں۔

ہمیشہ کی طرح بخون زدہ لہجے۔ اور اسٹون گرے کرسٹل کا تھکا
تھکا انداز۔ آج پھر قاتلانہ تھا۔

”الذمیاں نے آپ کو بہت محنت سے بنایا ہے۔“

”سب پر محنت کیا ہے“ اُس کی مسکراہٹ بھی تھکی تھکی تھی۔

”آپ پر خاص عنایت ہے۔“ ادا شان نے اک گہری اُداس سانس لی۔

”شاید“ خوبصورت آنکھوں میں کربا جھلک آیا تھا۔

”جبھی تو آپ پر اُڑ رہی ہیں۔“

”لوگ کہتا ہے۔“

”میں بھی کہتی ہوں۔“

”آپ کے ساتھ ہم نے کیا کیا ہے۔“ بیدھا بیٹھتے ہوئے وہ لہجے میں

بشاشت پیدا کر کے بولا۔ جب معمول اُس کا لب لہجہ ٹینا کو مسحور کر گیا۔

”بُھھے لگتا ہے کہ I AM FALLING IN LOVE WITH YOU

اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بولی۔

شان نے ایک نظر اُس سے دیکھا۔ اور پھر اُسے اچانک خیال آیا۔

”کل شام آپ نے مجھ کو بتایا تھا۔ کہ کوئی مسٹر نعیم آپ کا بوائے

فرینڈ ہے۔

”ہاں۔ کیوں۔؟“

شان نے پھر ایک نظر اُسے دیکھا۔ ”کچھ نہیں۔“

”آپ سے ملواؤں گی کسی دن۔ HE IS A NICE GUY“

”SEE“۔ شان کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”اس وقت ہوتا تو بیئر چلتی۔ مگر جیسے اُسے یاد آیا۔“ گورمنٹ

نے بند بھی لا کر رکھی ہے۔ STUPID۔ وہ بڑبڑائی۔

”ہوں۔“ مینر پر رکھی اُس کی سگریٹ کی ڈبیہ کو گھورتے ہوئے

وہ دھیرے سے بولا۔

”آپ بھی یقیناً پیتے ہوں گے۔“

”نہیں۔“ اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”REALLY“۔ ٹینا کو یقین نہیں آیا۔

وہ خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔

”آپ بھی پی کر دیکھیے۔ IT IS ALWAYS WONDERFUL“

”کبھی چکھا ہے۔“ شان نے ازراہ مذاق کہا۔

”YES۔ میں پیتی ہوں۔“ ہاتھ بڑھا کر مینر پر سے سگریٹ کی ڈبیہ

اٹھاتے ہوئے وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

شان اب بھی اُسے دیکھ رہا تھا۔

اُسے یاد آیا۔ ایک بار لندن سے پیرس جاتے ہوئے ٹرین میں اُس نے

اپنی ساتھی الزبتھ کو بار بار میٹر پینے پر ٹوکا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی
کہ اس چیز کے بارے میں وہ پابند نہیں تھے۔

"سگریٹ۔" ٹینا نے ڈبیہ اُس کی طرف بڑھائی۔
اور۔ اُسے این یاد آگئی۔ جس سے اُس نے ایک دن باقاعدہ
بائیوگراف کر لیا تھا۔ اُسے سرے سے وہ لڑکی ہی ماننے کو تیار نہیں
تھا۔ وہ چین اسکو کرتھی۔ اور یہ خصوصیت اُس کی نظروں میں
ایک مرد کی ہی ہو سکتی تھی۔

"تو تھینک یو۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجہ میں بولا۔
"اوہ۔" سگریٹ نکال کر لپ اسٹک لگے ہونٹوں میں اٹکاتے
ہوئے اُس نے حیرت سے آنکھیں نیچائیں IT KEEPS MY MORALY UP۔
لائٹر کا شعلہ سگریٹ کو دکھاتے ہوئے اُس نے مزید کہا۔
اور۔ تھک کر شان نے دوبارہ سرکری کی پشت سے ٹکا لیا۔
تیم وا آنکھیں اب بھی ٹینا پر جمی ہوئی تھیں۔

مختصر سیولیس بلاؤز۔ بہت گہرا گلا۔ گود میں سے ہو کر نیچے
قالین پر ڈھیر ہوتا ساڑھی کا پلو۔ عریاں پیٹ۔ عریاں مکر۔
چہرے پر گہرے میک آپ کی تھیں۔ ہونٹوں میں سگریٹ۔ اور پاؤں
ہوٹل میں بھتی دھن پر رقصاں۔
اُس کی آنکھیں مند گئیں۔

سادہ قمیض۔ شلوار۔ بڑا سا دوپٹہ۔ نیلی چوٹی۔ میک اپ

سے مبرا گلابی گلابی چہرہ۔ خوبصورت آنکھوں پر بارہیا سے ٹھکی
 لمبی سیاہ پلکیں۔ سگریٹ یا کسی مشروب سے نا آشنا چمکتے موتی جیسے
 دانت۔ بات کرتے وقت گہرا گہرا کرمٹنا۔ اور سمٹ سمٹ کر گہرا نا۔
 زی۔ پھر اُس کے سامنے تھی۔

اُس نے فوراً سر جھٹکا۔ خوف آنے لگا تھا۔ اُسے تو جیسے
 اُس کی یادوں سے۔

آنکھیں کھولیں۔ ٹینا پیچھے سے آکر کرسی کی پشت پر سے اُس پر
 جھک آئی تھی۔

پر قیوم کا تیر جھونکا۔ اُس کے کوٹ کے کالر پھر گہرا آنے اُس
 کے بال۔ اُس کے چہرے کو چھوٹے اُس کے ننگے بازو۔

”میں ٹوئیلٹ سے بھی ہو آئی۔ آپ ابھی تک خرابوں میں کھوئے
 ہوئے ہیں۔“ اُس کا چہرہ شان کے چہرے کو چھو رہا تھا۔

”THIS IS NOT FAIR“ اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پیچھے
 سے سامنے لا کر قریب کرسی پر بٹھاتے ہوئے اُس نے کہا۔ اس کے
 لہجے میں ناگواری کی سی جھلک تھی۔

”OH COME ON DEAR“ ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر وہ بولی۔
 اور نشانے اُس کا پاؤں اپنے بوٹ پر رینگتا محسوس کیا۔

اُسے کراہت سی محسوس ہوئی۔

اُس کے غور سے دیکھنے پر۔

گھبرا کر سر گھٹنے پر ٹکیٹی یا شرمنا کر آنکھیں بازو سے ڈھکتی زی اُس کے تصور کے پردے پر ابھرا آئی۔

”پروردگار۔“ اُسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔

”یولیس گے نہیں۔“ پاؤں کے دباؤ میں جیسے صلیب تھا۔

”I SAY THIS IS NOT FAIR“ پاؤں پیچھے کھینچتے ہوئے

اُس نے اپنا غصہ ٹینا پر اتار دیا۔

”کیا ہو گیا ہے ڈارلنگ۔“ اُس کی بے باک نگاہیں شان

کے چہرے پر گر گئی تھیں۔ اور شان کا دل چاہا۔

سب چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائے یہاں سے۔ یہ اُس کی دنیا

نہیں تھی۔ یہ مامول اُس کے لئے اجنبی تھا۔ اتنا کہ اُسے اپنا دم

گھٹنا محسوس ہو رہا تھا۔

فرار کی راہ جو اُس نے اختیار کی تھی۔ اُس کے بس کا روگ

نہیں تھی۔ تاہی وہ فرار میں کامیاب ہو پارہا تھا۔

ہر پل۔ ہر لمحہ۔ زی اس پاس ہی کہیں موجود رہتی تھی۔

کیا اسے فرار کہتے ہیں۔

اگر یہ فرار ہے۔ تو باز آیا وہ۔

”ویٹر۔“ اُس نے اشارے سے ویٹر کو پاس بلایا۔

”WE MUST PUSH OFF NOW“ اُس نے بڑے ضبط سے کہا۔

”ابھی تو صرف نو بجے ہیں۔“ ٹینا کا ابھی جانے کا کوئی ارادہ

نہیں لگ رہا تھا۔

”سوری۔ مجھے گاؤں بھی پہنچتا ہے۔“ گھڑی دیکھتے ہوئے وہ

قدرے نرمی سے بولا۔

شان کے کندھے پر بازو ٹکائے وہ بادلِ نخواستہ ہٹل

سے باہر نکل آئی۔

پھر دونوں کی گاڑیاں آگے پیچھے چلتی ٹینا کی کوکھی کے

گیٹ تک آئیں۔

شان نے ”گڈ نائٹ“ کہا۔ گاڑی رُخ موڑا۔ گاؤں کی

راہ لی۔ تصور میں زی ابھری۔

تو۔ اُس نے سوچا۔

اس کا توڑ ہونا چاہئے۔ مردانہ وار۔

قرار نہیں۔ اوردہ پر عزم لگ رہا تھا۔

دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ جمعہ کا دن تھا۔ زربینے
 کمروں کی صفائی کرنے کے بعد کچلی طرف چھوٹے سے صحن
 میں سیب کے درخت کے نیچے نئی کونپلیں پھوٹی شاخوں کے
 تلے کرسی ڈالے باربرا کا رٹ لینڈ کا "OUT OF REACH"
 پڑھنے میں مہتمک تھی۔

اتنی ضروری کاموں سے فارغ ہو کر سامنے کے مختصر باغ میں
 نکل کر چوکیدار کو کیاری میں گوڈی کرتے دیکھتے ہوئے موسم کے لحاظ سے
 مزید پھولدار پودے لانے کی ہدایات دے رہی تھیں۔
 نیلگوں آسمان بالکل صاف تھا۔ کچھ عرصہ قبل کی لرزتی کانپتی
 دھوپ میں اب حرارت کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ آبادی کو گھیرے میں
 لئے اونچی سرئی پہاڑ جیسے برف جھاڑ کر ڈھل کر نکھر آئے تھے۔ درختوں
 میں نئی کونپلیں پھوٹ آئی تھیں۔

اور پاس ہی خوبانی کے درخت پر بیٹھی بلبلی ایک شاخ سے
 دوسری شاخ پر لپکتی۔ واویلا مچا مچا کر بہار کی بے ثباتی کا اعلان
 کر رہی تھی۔ اتنی نے ایک گہری سانس لی۔
 بلبلی سے نظریں پھیر کر وہ لان میں لگی گھاس کو دیکھنے لگیں۔
 جگہ جگہ سے ہری ہو رہی تھی۔

اور پھر گیٹ پر ہلکی سی ہارن پر چونکیں۔
 ”دیکھو۔ کون ہے؟“ اتنی نے چوکیدار سے کہا۔ اور خود رخ پھیر کر
 اندر ہرآمدے کی طرف آنے لگیں۔
 گیلری میں داخل ہوتے ہوئے انھوں نے دیکھا۔ لمبی سیاہ
 قیمتی گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہو رہی تھی۔
 وہ کھٹک کر رہ گئیں۔

گاڑی ہرآمدے کے آگے آکر رکی مستعد باوردی ڈرائیور
 اُترا۔ اور تیزی سے گھوم کر کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔
 اونچا قدر۔ چوڑے شانے۔ کھلتا گندھی رنگ۔ صحت مند جسم۔
 بڑی بڑی بارعب موچھیں۔ مدبر چہرہ۔ بچاس کے لگ بھگ سن۔
 موسم اور عمر کے لحاظ سے بہترین قیمت سوٹ میں ملبوس۔ وہ
 جاگیردارانہ انداز میں اُترے۔

”بیگم یا سر علی ہیں؟“ وہ بارعب۔ جاگیردارانہ شان سے گویا
 ہوئے۔ تو اندر سہینہ بیگم کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

”جی صاحب اندر ہیں۔ چوکیدار نے مرعوب لہجہ میں جواب دیا۔
 ”اطلاع کر دو۔ شان احمد آئے ہیں۔“ انھوں نے مزید کہا۔
 اور سکیٹہ بیگم پتے کی طرح کانپتے دل کو مضبوط کرنے کی کوشش
 کرتے لگیں۔

چوکیدار نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر انھیں بٹھایا۔
 ڈرائیور کے لئے باہر لان میں کرسی ڈال دی۔
 سکیٹہ بیگم نے اندر جا کر دھڑکتے دل سے زرین کو شان کے
 والد کے آنے کی اطلاع دی۔

”اتنی۔ جا کر مل آئیں۔ اگر وہ اچھی نیت سے آئے ہیں تو سر
 آنکھوں پر۔ در نہ گھبرائیے بالکل نہیں۔ آپ کسی کی محتاج نہیں ہیں
 ہمارا اقداس ہے۔ اور پھر اللہ نامہ بھائی کو رکھے۔ ماں کی حالت دیکھ
 کر اس نے ان کی ڈھارس بندھائی۔“

”ہاں بیٹا۔ ٹھیک کہتی ہو۔“ وہ سفید ململ کا بڑا سا سفید دوپٹہ
 سر پر اچھی طرح جھاتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھیں۔
 اندر داخل ہوتے ہوئے دل ایک بار پھر دھڑکا۔
 کیا کہنے آئے تھے۔ ۹ وہ۔

ادرا کھنیں۔ اندر داخل ہوتے دیکھ کر شاہان احمد تعظیماً
 کھڑے ہو گئے۔

”السلام علیکم بہن۔“ دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف باندھے۔ سر قمرے

جھکائے وہ دھیمے لہجہ میں بولے۔

”وعلیکم السلام“ پتہ نہیں کیے سکیںہ بیگم نے جواب دیا۔ اور ڈرائنگ روم کے پرلے سرے پر جا کر آہستہ سے کرسی پر بیٹھ گئیں۔
تجھی شاہان احمد دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

”ہن! ہم آپ سے گلہ کرتے آئے ہیں۔ یا سر علی کے نکاح میں ہوتے ہوئے آپ نے ہمیں بے خبر رکھا۔ اُس کی بیٹی کو جنم دیا۔ پھر بھی ہمیں غیر سمجھا۔ بیوگی کا دکھ اٹھایا۔ کمپرسی کی حالت میں زرین کی پرورش کی۔ ہمیں خبر نہ کی۔ آپ دونوں نے رکھی سوکھی کھائی۔ ہم عیش کرتے رہے۔۔۔۔۔“ اُن کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ ہنوز سر جھکائے وہ غرارادی طور پر دونوں ہاتھ مل رہے تھے۔ سکیںہ بیگم نے نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہی تھیں۔

”آپ نے جوانی میں بیوگی کا دکھ اٹھایا۔ کسی نے نہ دیکھا۔ نہائی کا زہر پیتی رہیں۔ کسی کو خبر نہ ہوئی۔ اوہ۔ پروردگار۔۔۔۔۔“ انھوں نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”ہم کتنے گنہ گار ہیں۔ آپ کے۔ چاہیں بھی تو پھیلا وقت نہیں لا سکتے۔۔۔۔۔“ وہ قدرے رُک گئے۔

اور پھر جیسے انھیں اچانک یاد آیا۔ ”اور پھر بہن۔ آپ نے ماحد کو بھی منع کر دیا تھا۔ بر وقت بتا کر وہ ہمیں اس ندامت سے تو بچا سکتے تھے۔ اور۔ اور۔۔۔۔۔ ناصر کو دیکھیں۔۔۔۔۔ اُن کے لہجہ میں تیزی آگئی۔
ہم سے ہمارا ہی راز چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔“ وہ تاسف سے سر

ہلاتے ہوئے یولے۔ پھر ایک گہری سانس لی۔

آہستہ۔ آہستہ وہ دوبارہ گویا ہوئے۔ "سلمیٰ بیگم جب تک زندہ تھی۔ ٹھیک ہے چھپائے رکھا۔" وہ دُکھ سے مسکرائے۔ "پھر تو دونوں چل دئے۔ کون بتاتا ہے؟" ایک پل کو خاموش ہو گئے۔ اُداس چہرہ دلی جذبات کا غماز تھا۔ "لیکن ماجد کو چاہئے تھا۔ کہ فوراً ہمیں مطلع کرتے۔ آخر آپ کا اضافہ ہمارے خاندان میں ہو چکا تھا۔ زرین ہمارا خون تھی۔ مگر آپ۔ آپ اُن کو رد کرتی رہیں۔ آپ کو ڈر تھا۔۔۔" وہ کچھ جھجکے۔ "معاف کریں آپ کو خدشہ تھا کہ آپ غریب ماں کی ہیں۔ وہ غریب ہی تھیں نا۔ پر تھیں تو غیرت مند۔ اور ہمارے دل میں غیرت مندوں کے لئے ایک خاص مقام ہے بہت اونچا۔۔۔"

"آپ کو یہ سب ماجد بھائی نے بتایا ہو گا۔" سکینہ بیگم کی قوت گویائی نے ساتھ دیا۔ وہ تو کچھ اور ہی سمجھ رہی تھیں۔

چند پل سکھ کے آخری تھے۔ شاید آج۔ انھوں نے سوچا۔ مگر یہ یہ تو دیوتا نکلے۔ سگی بہن کی سوتن کی کتنی حوصلہ افزائی۔ کتنی عزت افزائی کر رہے تھے۔

"ہاں۔ عجیب اتفاق ہوا۔ ہم اچانک ماجد کے یہاں جا نکلے۔ ناصر کچھ عرصہ سے پریشان گم صُم سا نظر آتا تھا۔ ہم سے بھی ملاقات برائے نام ہی ہوتی۔ ہمیں کچھ تشویش ہوئی۔ اس کے ہیڈ کوارٹر سے جب بھی پتہ کیا غائب۔ اُس کے سسرال پوچھتا۔ وہاں بھی نہ ملتا کچھ شلوک۔ کچھ

پریشانی۔ کچھ خوش بختی۔۔۔“ وہ اب بھی نظریں نیچی رکھے دھیرے سے مسکرائے۔ ”ہمیں ماجد کے یہاں لے گئی۔ ناصر کے متعلق ہی پوچھ گچھ کرنے۔ شاید وہ ہی کچھ تسلی کر دیتے ہماری۔

گاڑی رکتے ہی ہماری نظر سامنے لان میں کرسی پر بیٹھی ایک لڑکی پر پڑی۔ ہمیں دیکھتے ہی جھٹ سر پر دوپٹہ ڈال دہ کو کھلی کے پکھو اڑے چل دی۔ ناک نقشہ اتنا مناسب اور خوبصورت تھا لیے بالوں کی خوبصورت لمبی چوٹی تھی۔۔۔“

موصوع سے ہٹے دیکھ کر سیکنہ بیگم انھیں حیرت سے ٹک لے ہی تھیں۔ ابھی چند لمحے قبل تو وہ اتنے سنجیدہ اور بردبار لگ رہے تھے اور اب۔ کسی لڑکی کا حلیہ بیان کرتے ہوئے۔ دھیرے دھیرے زیر لب مسکراتے۔ خوش خوش بالکل معصوم سے لگ رہے تھے۔

”اس پر وہ سر پر دوپٹہ ڈال۔“ سر پر دوپٹہ ڈال۔“ پر زور دیتے ہوئے اُن کی نظریں اوپر اٹھیں۔ زرین بادانی رنگ کے پھول دار خوبصورت کپڑے پہنے۔ ہمرنگ شفون کا دوپٹہ سر پر جلے دونوں ہاتھوں میں بڑے لئے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ وہ بات کرتے کرتے رگ گئے۔ زرین نے نا اچھے آداب کیا۔ بڑے میز پر رکھی۔ شاہان احمد نے اٹھتے ہوئے شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

زرین نے برتن میز پر رکھے۔ خالی بڑے ایک طرف رکھی۔ اور شاہان احمد کے آگے۔ چھوٹی تپائی پر خالی پلیٹ رکھ کر گرم گرم کباب

پیش کرنے لگی۔ لیکنہ بیگم نے دیکھا۔

شاہان احمد اُسے دیکھ دیکھ کر یوں خوش ہو رہے۔ جیسے وہ کئی بہت بڑا خزانہ ہو۔ دونوں کو چائے کی پیالیاں دینے کے بعد وہ باہر نکلی تو۔ شاہان احمد دھیرے سے مسکراتے ہوئے کوٹ کی بائیں جیب میں ڈالے ہاتھ سے شان کے ابھی چند دن قبل وصول کئے گئے خط کو محسوس کرنے لگے۔ جس میں اس نے۔ انھیں مکمل اختیار دے دیا تھا۔ وہ جہاں چاہیں اُس کی بات پکی کر دیں۔ اُسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔۔۔۔۔ اس وقت کے شاہان احمد کچھ دیر قبل کے شاہان احمد سے بالکل مختلف لگ رہے تھے۔ ”ہاں تو۔ بہن ہم کہہ رہے تھے کہ۔۔۔۔۔“

”جی۔ آپ ماجد بھائی کے گھر جانے کی بات بتا رہے تھے۔“

”ہاں۔ تو۔ سر پر دوپٹہ ڈال جب وہ کوٹھی کے پچھاڑے چلی۔ تو ہمیں اپنا مدراج بنا گئی۔ اُس کی لمبی ہراتی چوٹی تو۔ وہ سکر لے۔ اب تک ہمارے ذہن میں محفوظ ہے۔ ہاں۔ تو آج کل کی کوئی اور لڑکی۔ ہوتی تو۔ پاس آتی۔ ہمارا تعارف پوچھتی۔ اپنا کرواتی۔ ہمیں اندر۔ بٹھاتی۔۔۔۔۔ خیر پھر چھوٹے ہی ہم نے ماجد سے پوچھا۔

”کون تھی یہ لڑکی۔ جو ابھی باہر لان میں بیٹھی تھی۔؟“

”کون۔؟“ وہ چونکے۔

”ابھی باہر لان میں تھی۔ اندر گئی ہے ابھی ابھی۔“

”ہو گی کوئی۔“ معلوم نہیں کیوں ہمیں لگا وہ تانا نہیں چاہتے۔

پیش کرنے لگی۔ لیکنہ بیگم نے دیکھا۔

شاہان احمد اُسے دیکھ دیکھ کر یوں خوش ہو رہے۔ جیسے وہ کئی بہت بڑا خزانہ ہو۔ دونوں کو چائے کی پیالیاں دینے کے بعد وہ باہر نکلی تو۔ شاہان احمد دھیرے سے مسکراتے ہوئے کوٹ کی بائیں جیب میں ڈالے ہاتھ سے شان کے ابھی چند دن قبل وصول کئے گئے خط کو محسوس کرنے لگے۔ جس میں اس نے۔ انھیں مکمل اختیار دے دیا تھا۔ وہ جہاں چاہیں اُس کی بات پکی کر دیں۔ اُسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔۔۔۔۔ اس وقت کے شاہان احمد کچھ دیر قبل کے شاہان احمد سے بالکل مختلف لگ رہے تھے۔ ”ہاں تو۔ بہن ہم کہہ رہے تھے کہ۔۔۔۔۔“

”جی۔ آپ ماجد بھائی کے گھر جانے کی بات بتا رہے تھے۔“

”ہاں۔ تو۔ سر پر دوپٹہ ڈال جب وہ کوٹھی کے پچھاڑے چلی۔ تو ہمیں اپنا مدراج بنا گئی۔ اُس کی لمبی ہراتی چوٹی تو۔ وہ سر لائے۔ اب تک ہمارے ذہن میں محفوظ ہے۔ ہاں۔ تو آج کل کی کوئی اور لڑکی۔ ہوتی تو۔ پاس آتی۔ ہمارا تعارف پوچھتی۔ اپنا کرواتی۔ ہمیں اندر۔ بٹھاتی۔۔۔۔۔ خیر پھر چھوٹتے ہی ہم نے ماجد سے پوچھا۔

”کون تھی یہ لڑکی۔ جو ابھی باہر لان میں بیٹھی تھی۔“

”کون۔؟“ وہ چونکے۔

”ابھی باہر لان میں تھی۔ اندر گئی ہے ابھی ابھی۔“

”ہو گی کوئی۔“ معلوم نہیں کیوں ہمیں لگا وہ تانا نہیں چاہتے۔

ماجد کا رنگ کچھ بدل سا گیا۔

”اوہ۔ چھوڑیں بھی ماجد صاحب۔ ہم خود پتہ لگالیں گے۔“ ہمارا لب و لہجہ شاید اکھنیں چونکا گیا۔ تھوڑی دیر کچھ سوچتے رہے۔ اور پھر۔ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگے۔

”میرا خیال ہے شاہان صاحب۔ آج وقت آ گیا ہے۔ اس راز کو مزید راز رکھنا اب ناممکن نظر آتا ہے۔ یہ لڑکی اپنے یا سر علی کی دوسری بیوی سے ہے۔ اپنے ناصر کی بہن ہے۔۔۔۔“

اور ہم۔ ناصر کی مصروفیات جان گئے۔
”مجھے آپ کا خوف ہے۔ بھائی جان کی فکر تھی۔ کہیں آپ لوگ اُسے ہی مجھ سے نہ لے لیتے۔۔۔۔۔“

”وہی تو لینے آئے ہیں ہم۔“ خالی پیالی میز پر رکھتے ہوئے وہ آرام سے بولے۔

”بخدا۔ بھائی جان! میرا زرین کے سوا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔“
”جس کا خدا ہوا اس کو ایسا نہیں کہنا چاہئے۔ زرین ایک نہ ایک دن آپ کو چھوڑ کر جائے گی ہی۔ سو ہمارے گھر کیوں نہ آ جائے۔ ہمارے شان کی دُہن بن کر۔“

سکینہ بیگم پر تو آج حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹنے کا دن تھا۔ ”ہم آپ سے ندین کو مانگتے آئے ہیں۔ بہن! انکار کر کے ہمیں مایوس نہ کریں۔“ وہ مہلکی نظروں سے سکینہ بیگم کو دیکھ رہے تھے۔

کچھ دیر قبل کاشاندار گاڑی سے اترنے والا شاندار آدمی۔
اس وقت کتنا عاجز۔ کتنا منکر لگ رہا تھا۔
وہ کچھ گونگو کی حالت میں تھیں۔

”ہم جلدی کر کے آپ کو برا سا نہیں کریں گے۔ آپ بے شک سوچ کر ہمیں مطلع کر دیں۔“ انھوں نے سکینہ بیگم کو تذبذب میں پڑتے دیکھ کر مزید کہا۔ اور جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔
”اور۔ بہن چند دنوں میں ہمارے آدمی آجائیں گے۔ آپ کو یہاں سے یا سر کے گاؤں میں لے جانے میں مدد دیں گے۔ سر دست زرین وہاں شہر ہوسٹل میں جائے گی۔ امتحانوں کے بعد پھر آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔ یہاں سینکڑوں میل دور آپ کا یوں لکھے رہنا مناسب نہیں ہے۔ جو ہو گیا۔ سو ہو گیا۔ آئندہ ہم چاہیں گے کہ آپ ہماری نظروں کے سامنے رہیں۔ اپنا گاؤں آباد کریں جا کر رشتادی وہیں سے ہوگی انشاء اللہ۔“ گیلری کی طرف بڑھتے ہوئے وہ یوں گویا ہوئے۔ جیسے ساری بات طے کر گئے ہوں۔ سکینہ بیگم چپ سی رہ گئیں۔

”ہاں۔ تو آپ ہمیں کب تک مطلع کریں گی۔؟“ وہ رک کر پھر لو جھپٹنے لگے۔

وہ سوچ میں پڑ گئیں۔
ساجد کی بھی بات چل رہی تھی۔ گو کہ انھیں یقین تھا کہ نامر،

شان کو ہی ترجیح دے گا۔ اور پھر ہونا بھی ایسے ہی چاہیے تھا۔
شان زیادہ نزدیک تھا۔ رشتے کے لحاظ سے بھی۔

مگر۔ وہ مختار کل تو نہ تھیں۔

”دہ۔ اپنے ناصر کو خط لکھوں گی۔ اُس کا جواب آنے پر ہی
کچھ کہہ سکوں....“

”خوب۔ بے شک بے شک۔ اچھا بہن۔ ہمیں ایک نظر اپنی
بہو کو تو دکھا دیں۔“ وہ بہر حال زرین کو اپنی بہو سمجھنے پر مہر تھے۔
اور بے چاری سکیٹہ بیگم کچن کے راستے اُسے باہر صحن سے
لے آئیں۔

”ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔“ سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتی ہوئی وہ
سامنے آئی۔ تو اُس کا سر سے لے کر پاؤں تک جھکتی مشتاق نگاہوں
سے جائزہ لیتے رہے۔ زیر لب مسکراتے۔ وہ بے اختیار بولے۔
”امتحان میں کتنے دن ہیں۔ بیٹا۔؟“ انھوں نے براہ راست
زرین کو مخاطب کیا۔

”جی تقریباً دو مہینے۔“ وہ اُن کے لب و لہجہ۔ انداز گفتگو
سے بوکھلائی سی بولی۔

”اوسو۔ ابھی تو بہت دن ہیں۔“ جیب میں ہاتھ سے محسوس
کرتے ہوئے۔ شان کے خط کی موجودگی کی ایک بار پھر تصدیق کر کے
وہ بچوں کی سی بے تابی سے بولے۔ ”اچھا بہن۔ خدا حافظ۔ وہ سکیٹہ

بیگم کی طرف مڑے۔

"خدا حافظ" انہوں نے بھی کہا۔

"خدا حافظ بیٹے۔" انہوں نے زرین کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"خدا حافظ۔ انکل۔"

"ناہر ہمیں ماموں جان کہتا ہے۔" انہوں نے تصویر کر دی۔

"خدا حافظ ماموں جان" وہ نام کی بولی۔

کتنے اچھے تھے ماموں جان۔

اتنی نرمی۔ اتنی اپنائیت کا تو وہ اُن سے خواب میں بھی

گمان نہیں کر سکتی تھی۔

"SEE YOU" دروازے سے نکلتے نکلتے وہ پھر سنجیدہ ہو گئے

تھے۔ باوردی ڈرائیور اُن کے سائیکل کا پچھلا دروازہ کھولے

مردب کھڑا تھا۔

اُن کے پیٹھتے ہی دروازہ بند کیا۔ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ

پر آیا۔ گاڑی اسٹارٹ کی۔

ادر کھلے گیٹ سے باہر لے گیا۔

نوکر چاکر۔ سب انھیں ایک خواب لگ رہا تھا۔

چھوٹا سا گاؤں۔ چھوٹا سا مکان۔ اُن کی والدہ۔ وہ خود۔ چھوٹا سا اسکول
 سلائی کرٹھائی کرتی اُن کی والدہ۔ چھوٹے سے اسکول میں پڑھائیں وہ خود۔
 یا سر علی کا اچانک آنا۔ بار بار آنا اُن کا اُن کے ساتھ نکاح۔ ڈیڑھ دو
 سال امید و بیم کی زندگی۔ انتظار کا عالم۔ زرین کی پیدائش۔ یا سر علی کا آخری
 بار آنا۔ ایکسٹنٹ کی خبر۔ اخبار میں۔ اُن کا بے سرو سامانی کی حالت
 میں بچی کو لے کر گاؤں چھوڑنا۔ دوسری جگہ اسکول سے ملحقہ کوارٹر میں رہنا۔
 اور پھر برسوں بعد ناصر کا آنا۔ سب اُن کی نظروں کے آگے کسی متحرک
 فلم کی طرح یکے بعد دیگرے آتا اور جاتا رہا۔

یہاں سے اُن کی زندگی نے ڈرتے ڈرتے نئی کروٹ لی تھی۔ یا سر علی
 کے رشتہ داروں نے انہیں قبول کر لیا تھا۔ کوارٹر سے وہ انیسویں گئیں۔
 اور پھر اب۔ اس وسیع و عریض حویلی میں شفٹ کرادی گئی تھیں۔

مانا کہ یہ سب اُن کا حق بھی بنتا تھا۔ مگر نہیں۔ یہ لوگ نہ چاہتے۔
 ناصر انہیں اپنی ماں کی سوکن اور زرین کو جائیداد کی شریک سمجھ کر کھڑکرا
 دیتا۔ تو وہ اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔ کسی قانون کا دروازہ غریب
 کا ہاتھ نہیں کھٹکھٹا سکتا۔

شاہان احمد۔ اپنی بہن کی سوکن اور زرین کو اپنے کلوٹے بھانجے
 کی جائیداد کی دشمن سمجھ کر نیست و نابود کروا دیتے۔ تو شاید کسی کو
 خبر بھی نہ ہو پائی۔ !

بے شک اُن کی ادر زرین کی بقدر خدائے برتر نے پٹی تھی ناصر
اور شاہان احمد کو فرشتوں کی صورت میں بھیج کر۔ وہ ان دونوں کی اسان مند
تھیں۔ باہر بارن پر وہ چونکیں۔

زرین پہنچ گئی تھی شاید۔ آج جمہرات تھی۔ اُس نے ہوسٹل سے آنا
کھا۔ ڈرائیور صبح کا گیا ہوا تھا اُسے لینے۔ وہ سیدھی ہو بیٹھیں۔
ایک ایک پل تو گنتی تھیں وہ زی کی آمد میں۔ پہلی پہلی بار جو اُن
سے الگ ہوئی تھی۔

ادر پھر۔ زی ڈیوڑھی سے لمبا راستہ طے کرتی اُن کے پاس تک
پہنچ ہی گئی۔ ملازمہ سے چائے کے ساتھ تلنے کو کہہ کر وہ زی کے ساتھ
صحن میں رکھی کر سیوں پر آکر بیٹھ گئیں۔ شام ہونے کو بھی۔ گرمی خاصی تھی۔
مگر کھلے صحن میں تکلیف دہ نہیں تھی۔

”اتنی ناصر بھائی کا خط آیا ہے۔؟“ ملازمہ چائے رکھ کر جانے لگی
تو زی نے پوچھا۔

”نہیں بیٹا۔ ابھی تک تو نہیں آیا۔ پتہ نہیں کیا دیر ہے۔؟“
”مصرف ہوں گے بہت۔“

”ہاں۔ لیکن میں نے بہت ضروری بات لکھی تھی اُسے۔ جواب تو
دینا چاہئے تھا۔“ پیالی میں چمچ چلاتے چلاتے وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔
”کیا پکا ہے اتنی۔“ وہ حسبِ عادت پوچھنے لگی۔

”مٹر چاول اور سادہ گوشت۔“ کھانا پکانا ادر کچن کا انتظام اب بھی

انہی نے ہی سنبھال رکھا تھا۔

”پہلے کیوں نہیں بتایا۔ تیار ہی ہے بس۔ روٹیاں پک جائیں کوکھا لینا۔“ انہی تند در کی طرف نظر ڈالتے ہوئے بولیں۔
”ماموں جان آئے تھے۔؟“

”چند دن قبل آئے تھے۔ اور کل سے تو برابر پوچھ رہے ہیں ناصرتے غلط کو۔“

”کیوں۔ برابر کیوں؟“ کیا بکھلتے کھاتے دھڑک گئی۔

”ماموں نہیں ہیں کیا۔ اور پھر ایسے ویسے ماموں۔“ آخری جملہ جیسے دہ خود سے بولیں۔ میں نے اتنے فحاصل اور محبت کنوائے لوگ کم دیکھے ہیں۔“

یہ تو آپ ٹھیک کہتی ہیں۔“ وہ پھر سے کیا بکھاتے میں مصروف ہو گئی اور سکیٹہ بیگم زی پر ایک نظر ڈال کر سوچ میں پڑ گئیں۔
ابہیں زی کی بھی تو رائے لینی تھی۔ اب وہ سمجھدار تھی۔ ساجد کو بھی جانتی تھی۔ اور ذیشان سے بھی مل چکی تھی۔ اس کی رہنا تو بہر حال شامل ہونی چاہیے تھی۔

”تمہیں کیسے لگتے ہیں شان بھائی۔؟“ وہ زی کے لئے پیالی میں چائے دانی سے چائے ڈنڈا پیتے ہوئے دھیرے سے بولیں۔

”بہت اچھے ہیں۔ کیوں؟“

اور زی کے چہرے پر گلابی رنگ بکھر گیا۔ انہی نے اُسے بغور دیکھا۔

”بیٹے۔ شاہان بھائی۔ ذیشان کے لئے ہمارا کہہ رہے ہیں۔ تم اب سمجھ دار ہو۔ اس لئے تم سے ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔۔۔“
امی بولتی گئیں۔ اور زی کا سر جھکتا گیا۔

کیا اب چھوڑ چھاڑ۔ وہ پلیٹ میں آچے سے دھیرے دھیرے لیکر کھینچتی گئی۔ چہرے پر سرخی دوڑ گئی تھی۔ اور نظریں اوپر اٹھنے کا نام نہ لیتی تھیں۔

امی کے کچھ غصے قبل کے دوسے کو تقویت مل گئی۔

”اور ساجد کے لئے ماجد بھائی اور ان کی بیگم کی بات بھی تمہارے سنی ہوگی۔ وہ تو تمہارے سامنے بھی کہہ رہی تھیں۔ ناصر نے انہیں اپنی واپسی کے انتظار کا کہہ رکھا ہے۔ اگر ہی جواب دے گا۔“

”کیا جواب۔؟“ وہ سب بھول بھال۔ سر جھکا کر ہر اسال کی پوچھنے لگی۔

”ہاں۔ یا۔ نہیں۔“

”نہیں۔ ساجد تو میرے بھائی ہیں۔“ اور امی اُس کے معصومیت سے کہنے لگے انکار پر زیر لب مسکرائیں۔

”اور ذیشان۔؟“

زی نے ایک نظر امی کی طرف دیکھا۔

چہرہ ایک بار پھر سُرخ ہو گیا۔

پلکیں ایک بار جھلکیں۔ اور۔

تو جی بھی ماموں جان اُسے ہر بار معنی خیز نظروں سے دیکھتے جلیختے
اور زیر لب مسکراتے رہتے۔

اور پھر اُسے اتنی کی ضروری بات نامہر کھائی کو لکھنے کا بھی اندازہ
ہو گیا۔ اور۔ کل سے برابر ماموں جان کا فون پر نامہر کھائی کے جواب
کے بارے میں پوچھنا بھی سمجھ میں آ گیا۔

اور پھر۔

کھانا کھاتے کھاتے اُسے بھی تشریش ہوئی۔
نامہر کھائی کا خط ابھی تک نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں کیا
وجہ تھی۔؟

دن کے گیارہ بج رہے تھے۔

زرین کمروں کی صفائی میں لگی تھی۔ ملازمہ چھارٹ پونچھ تو لیتی تھی روز
مگر زرین کو تسلی نہ ہوتی تھی۔ چھٹی کے روز ضرور کو نہ کو نہ چھارتی تھی۔
سکینہ بیگم ضروری کاموں سے نمٹ کر برآمدے میں تخت پر آ بیٹھی تھیں
وہیں میٹر پوزیشن میں لیٹی زرین کی یونیفارم کی شرٹ تھی۔ ایک کا لادھڑا
تھا۔ اور دوسری کے بٹن غائب تھے۔ نکال کر درست کرنے لگیں۔
"بیگم صاحب! بڑے صاحب کا ٹیلی فون ہے۔" ملازمہ نے کمرے میں
سے باہر آتے ہوئے بتایا۔

قمیض چھوڑ چھاڑ دہ اندر کی طرف لپکیں۔

"ابھی ابھی ناصر کا فون آیا ہے۔ کل پاکستان پہنچ رہا ہے۔"

شایان احمد اٹھیں خوشی خوشی بتانے لگے۔

"شکر ہے اللہ کا۔ خیریت تو ملی۔ نہ کوئی خط ڈالا تھا۔ نہ خیریت کی

اطلاع کی تھی۔ جب سے گیا تھا۔" سکینہ بیگم ہنسا ہوتے ہوئے بولیں۔

”کہتا تھا۔ آپ کو ٹیلی گرام دیا ہے۔“

”ہمیں تو کوئی نہیں ملا۔“

”شاید آج مل جائے۔ بہر حال میں کل ایئر پورٹ پر اُسے لیتے جا رہا

ہوں۔ آپ کے پاس آئیں گے تو باتیں ہوں گی۔ پھر اچھا خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“ اور پھر سلسلہ منقطع ہو گیا۔

”زی۔ زی کہاں ہو۔؟“ وہ اندر کمرہ میں اُسے ڈھونڈنے لگیں۔

”یہاں امی ساتھ روم میں ہمار ہی ہوں۔“ وہ پاس ہی اپنے کمرے

کے غسل خانے سے بولی۔ امی پلٹ کر وہاں آگئیں۔

”ناصر آرہا ہے کل۔ شاہان بھائی کا فون آیا ہے۔ ابھی ابھی۔“

”اوہ۔ اچھا۔ تو پھر شام کو میں نہیں جاؤں گی ہوٹل۔ کل کی میری

چھٹی۔۔۔۔۔“ وہ دس سے خوشی خوشی بولی۔

”میں بھی ہی کہنے والی تھی۔“

دیس آکر انہوں نے سلامی کا کام دوبارہ نکال لیا۔ ساتھ کام میں لگے

تھے۔ مگر ذہن مختلف سوچوں کی اماں جگہ بنا ہوا تھا۔ ابھی باہر گھنٹی بجی۔

تھوڑی ہی دیر میں بیگم ماجد و ماجد صاحب دونوں ڈیوڑی سے

اندر داخل ہوئے نظر آئے۔ کتنے پر خلوص دوست تھے انہوں نے سوچا۔

اور اب تو ایک اور اس بھی لگائے بیٹھے تھے وہ۔

قریب ہی کپڑوں پر استری کرتی ملازمہ کو چائے بنانے کا کہہ کر خود وہ

کام ایک طرف براہ راست کی سیڑھیاں اترتی وہ اُن کی پذیرائی کو بڑھائیں۔

وہی مطالبہ تھا۔ وہی ناصر کا انتظار۔ وہی امید و بیم کی کیفیت۔
 ”ہماری بیگم تو پل پل گن رہی ہیں۔ ناصر کے آنے کے۔“
 ”ارے ہاں۔ ابھی ابھی شان بھائی کا فون آیا تھا ناصر کل پہنچ رہا
 ہے۔ میں تو بتانا ہی بھول گئی۔“

”واقعی۔“ بیگم مزاج خوش ہوتے ہوئے بولیں۔

”ہاں۔ بھابی جان۔“

”کل کس وقت پہنچ رہا ہے۔؟“

”شام کو۔“ انہوں نے بتایا۔

”بس تو ہم بھی آجائیں گے“ وہ جلدی سے بولیں۔

”سر آنکھوں پر۔“ انی نے کہا۔

”دیے تو ضرور آؤ۔ لیکن ساجد والی بات کل نہیں پرسوں آکر کریں گے۔“

تسلی سے۔ کل تھکا ہوا ہو گا ناصر۔“ مزاج صاحبہ نے کہا۔

”میں ساجد کی بات کے لئے آرہی تھی کل شام کو۔“ تو پھر پرسوں

ہی آئیں گے۔ تسلی سے بات چیت ہو گی۔ کل شام تو وہ تھکا ہوا پہنچے گا۔

آرام کر لینے دوں سے۔ پرسوں آئیں گے انشا اللہ۔“

اور سکینہ بیگم کی عجیب سی حالت تھی۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا تھا کہ

زرین کی قسمت کہاں لکھی تھی۔ مگر یہ لوگ تو بہت اس لکائے بیٹھے تھے۔

کہیں انکار ہوا تو کتنا دکھ ہو گا انہیں۔؟

زرین چائے لے کر آگئی تھی۔ اپنائیت بھری گفتگو کے دوران سب نے

چائے پی۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا گیا۔ اور پھر کچھ دیر اور ٹھہر کر
 ماجد صاحب جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”بھابی جان! اب اجازت
 دیں پرسوں حاضر ہوں گے۔“

”بھری دوپہر میں اس قدر گرمی میں کہاں جائیں گے۔ بھائی جان۔!
 شام تو ہو لینے دیں۔ کچھ تو شدت کم ہو گرمی کی۔“ سکینہ بیگم بولیں۔
 ”پھر رات بہت ہو جاتی ہے پھپھتے پھپھتے۔ اب اجازت دے ہی دیں۔
 بھابی جان۔“ بس آپ ہماری مراد پوری کر دیں۔ آنا جانا تو لگتا ہے گا۔“
 بیگم ماجد بھی اٹھتے ہوئے بولیں۔

شام کے بعد چائے کے پھراہنوں نے زرین کی قمیض نکال لی۔
 کل ہی کچھ نہ کچھ فیصلہ ہو جانا تھا۔ کام کرتے ہوئے پھر ان کا ذہن
 اُس طرف چلا گیا۔ نامہ نے ذیشان کے متعلق ان کے خط کا جواب کیوں نہیں
 تھا۔ کیا اُس کے ساتھ زرین کا رشتہ نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو بہت
 اچھا تھا، اُس کا ماموں زاد بھی تھا۔ پھر؟ کہیں۔ کہیں ایسا تو نہ تھا۔
 کہ وہ زی کو اُس کے قابل نہ سمجھتا تھا۔

نہیں۔ نہیں۔ انھیں اس خیال پر کبھی ندامت ہوئی۔ ناصر ایسا نہیں
 تھا۔ وہ تو سگی اولاد سے بڑھ کر تھا۔ کہیں بڑھ کر۔ کوئی اور وجہ ہوگی۔
 مصروفیت بھی تو ہو سکتی ہے۔ باہر ایک بار پھر گھنٹی ہوئی۔
 ”جاؤ۔ دیکھو کون ہے؟ چائے کی ٹرے لاتی ملازمہ سے ٹرے
 ہاتھوں میں تھام کر انہوں نے اُسے بھگا دیا۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں

وہ تار کا لفافہ لئے آگئی۔

”ڈاک خانہ کے بابو تھے کہتے تھے جھٹی تھی پر کال لایا کہ بیگم صاحب کا ضروری پیغام ہو گا۔ باتوئی ملازمہ انہیں لفافہ نکھاتے ہوئے بولی۔
ناصر کا ہو گا۔ انہوں نے سوچا۔ جلدی سے کھول لیا۔ ناصر کا ہی تھا۔
کل پہنچ رہا تھا۔ ”ٹیلی گرام کس کا ہے۔“ ”زرین کی نظر شاید اندر کے
سے ہی پڑ گئی تھی۔ قریب آتے ہوئے پوچھنے لگی۔
”ناصر کا ہے۔ کل پہنچ رہا ہے۔“ انھوں نے لفافہ اُسے دیتے
ہوئے خوشی خوشی بتایا۔

”ادہ شکر ہے۔“ وہ جلدی جلدی تار کے مضمون پر نظریں دوڑاتے
لگی۔ ”اچھی طرح پوچھوں گی۔ جا کر غیریت کے دو لفظ تک نہ لکھے۔“
”مصرف رہا ہو گا بے چارہ۔“ انی نے ناصر کی تائید کی۔ باقی کا
وقت دونوں ماں بیٹیاں پر وگرا م ہی بناتی رہیں۔

کل رات کے کھانے پر ظاہر ہے شاہان احمد بھی وہیں ہوتے۔ شاید
ذیشان بھی ہوتا۔ اُن کے نوکر چاکر بھی ضرور ہوتے تھے۔ اور پھر ناصر
بھی تو آ رہا تھا ساتی دور سے۔ کتنا خوش ہو گا دیکھ کر۔ کہ اُس کے ماموں
نے خلاف توقع انھیں ہاتھوں لے لیا تھا۔

اگلے دن صبح سے ہی گھر میں کہا گئی تھی۔ انی اور زرین سارا وقت
مصرف رہیں۔ حویلی کی صفائی کر دانی۔ رات کے کھانے کے لئے ملازموں
کی مدد سے کسی طرح کے کھانے تیار کروائے۔ مشکل سے تین بجے کریدھی کی

اور پھر کام میں لگ گئیں۔ زرین برابر مدد دے رہی تھی۔ اتنی محسوس کیا۔ وہ بے انتہا خوش تھی۔ تبھی گیٹ پر ہارن ہوا۔ زرین کا دل بے ترتیبی سے دھڑک اٹھا۔ شاید شان بھی ساتھ ہو۔ کیسا بے مروت تھا۔ مگر خبر بھی نہیں لی تھی۔ کیسے بڑے بڑے دعوے کر رہا تھا جب آخری بار ملا تھا تو۔

مگر پھر ایک دلنشیں مسکراہٹ اُس کے خوبصورت لبوں پر چھا گئی۔ ماموں جان کو رام بھی تو اُسی نے کیا تھا۔ شان کو پیار نہ ہوتا اس سے تو شاید۔ ان لوگوں کو ماموں پوچھتے بھی نہیں۔ ڈیوڑھی میں شور ہوا تو وہ کمرے سے باہر نہیں آئی۔ ناہر سے پیٹ جانے کو دل چاہتا تھا۔ مگر۔ شان کا سامنا۔ جواتنے دن بعد اور اتنے سارے لوگوں کے سامنے نہیں کر پاری تھی۔

وہ کھڑکی کے پٹ میں سے دیکھتی رہی۔ اور۔ پھر وہ بچھ کر رہ گئی۔ صرف ناہر اور ماموں جان ہی اندر داخل ہوئے تھے۔ شان نہیں تھا۔ "تو ابھی سے چھپنے لگی ہے تو۔" اچانک ناہر نے پیچھے سے آکر اُسے پہلو سے لگاتے ہوئے شرارت سے کہا۔ زرین سُرخ ہو گئی۔ "بھیا۔" اُس کے بازو بھی اُس کے گرد لپٹ گئے۔ "میں آپ سے بات نہیں کرتی۔"

"کیوں؟ فوراً وہاں سے" ہاں "ہیں لکھدی اس لئے۔" "چھوڑیں بھیا۔ بیکار بات کرتے ہیں۔ آپ نے اپنی خیریت کی دو

سطر میں تک نہ لکھیں۔ ہم لوگ اتنے پریشان رہے۔

"بہت کام تھازی۔ واقعی وقت نہیں ملا۔ اور پھر اتنی کے خط کا جواب
 خدا....." جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑتے ہوئے وہ مسکراتے رہا۔

"بس کریں اب۔ میں خیریت کے خط کی بات کر رہی ہوں۔

"اچھا لڑو بعد میں۔ اب آؤ۔ سب ماماؤں جان کے ساتھ بیٹھتے ہیں۔

چل کر۔" اور پھر سبھی ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ "شان کہاں ہے
 ماماؤں جان۔؟" سکولیش پلٹے ہوئے ناہر نے پوچھا۔

"کل تک تو وہیں پہاڑ پر تھا۔ کنٹرکشن کے سلسلے میں۔ رات گاؤں آیا
 تھا۔ آج ہم نے کہا ایئر پورٹ پر ساتھ آنے کو۔ ٹال گیا۔ ہمیں اس کی مصروفیت
 اور اس کا عادت کا پتہ ہے۔ پہلے کام۔ پھر کچھ اور۔ آج واپس گیا ہو گا۔

زرین کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ مگر ناہر دھیرے سے مسکرا دیا۔ شان
 کی مصروفیت اور عادت کی بات تو درست تھی۔ پراصل وجہ کچھ اور تھی۔
 اس کا مطلب تھا شان کو ابھی تک کچھ معلوم نہیں تھا۔ نہ انی اور نہ زرین
 کے بارے میں۔ نہ ہی یہ کہ ماماؤں جان نے جوڑی اس کے لئے پسند کی ہے
 وہ زرین ہی ہے۔

ندین آہستہ سے اٹھ کر وہاں سے چل دی۔ "میں خدا کھا نا دیکھ
 آؤں۔" سکینہ بیگم بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"شان کو ابھی تک یہ علم نہیں ہے۔ کہ ہم نے جوڑی اس کے لئے پسند
 کی ہے۔ وہ یا سر غلی کی دوسری بیوی سے ہے۔ یا تمہاری بہن سے ہے۔ وہ بہت

ڈکٹیٹوریل طبیعت کا ہے۔۔۔۔۔ ہر بات میں REASON ڈھونڈتا ہے۔
عین وقت پر گڑ بڑ کر سکتا تھا۔ پھر ابھی کچھ عرصہ قبل۔۔۔۔۔ شاہان احمد صوفی
کی پشت سے سرٹیکے آہستہ آہستہ ناصر کو بتا رہے تھے۔

یہ بات وہ سکینہ بیگم کے سامنے نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ناصر کو ہی
بتا سکتے تھے۔ اُن کا۔ شان کا۔ ناصر کا۔ راز ایک ہی ہوا کرتا تھا۔

”بقول اُس کے اُسے ایک لڑکی پسند آگئی تھی۔ اور وہ اُسی سے
شادی بھی کرنا چاہتا تھا۔ ہمیں لکھ بھیجا۔ تب تک ہم زرین کو اُس کے لئے
پسند کر چکے تھے۔ ہم نے سختی سے انکار کر دیا۔“ وہ قدر کے۔ تھوڑی دیر
سوچتے رہے۔ پھر سیرھے ہو بیٹھے۔

”سمجھ دار ہے۔ ہر اونچ نیچ سمجھتا ہے۔ کافی انیشیٹیو ہے۔۔۔

IMOST SAY۔ پہلی بار ایک لڑکی کو پسند کیا ہے۔“ شادی کا فیصلہ کیا
تھا تو سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔ ہمیں کچھ فوس بھی ہوا اپنی سختی پر۔ مگر یہ
سوچ کر کہ زرین ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے
یا سر علی کی بیٹی ہے، اپنا خولتا ہے، یغروں میں نہ جانے پائے۔ ہم اپنے فیصلے
پر مطمئن ہیں۔ جوانی کی بات ہے۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا سب۔۔۔
سردست ہم نے اُسے کچھ نہیں بتایا۔ یہی کہا ہے کہ ہمیں ایک لڑکی اُس کے
لئے پسند آئی ہے اور بس۔ صرف ماما اور کریم ہی اس راز سے واقف ہیں۔
ہم نے انہیں بھی تاکید کر دی ہے۔ کہ شان کو غم نہ ہونے پائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ
یہ راز ہم خود اُس پر عیاں کریں۔ نئی الحال تم بھی ذکر نہ کرنا۔ دیکھتے ہیں۔ بات

ہو جائے گی تو..... پھر..... ہم خود اسے بتائیں گے۔ حقیقت تسلیم کر ہی لے گا..... آہستہ آہستہ۔“

ماموں جان کتنے عظیم تھے۔ کچھ عرصہ قبل اُس نے کتنا غلط سوچا تھا۔ اُن کے متعلق۔ جھکا سر اٹھا کر اُس نے اس خلوص و انسانیت کے پیکر کو دیکھا۔
”سوچنا کیا ہے ماموں جان آپ ناصر کا سر مانگ کر دیکھیں۔ اُس کا سب کچھ آپ کا ہے۔“

”ناصر بیٹے۔ انہیں سلی ایگم یاد آگئی۔ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُداس سے بولے۔“ تم نے یا سر علی کی بیوہ اور اُس کی بیٹی کو تحفظ دیکر ہمارا سرفخر سے ادبچا کر دیا ہے ہمیں تم پر فخر ہے۔“ اُن کا لب و لہجہ ان کی اندرونی کیفیت کا آئینہ دار تھا۔

”اور زرین کو شان کے لئے لینے پر مجھے ڈر ہے۔ میں اپنے ماموں پر مغرور نہ ہو جاؤں۔“ ناصر نے اُن کا ہاتھ عقیدت سے اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔
”جاؤ۔ اپنی والدہ کو بلاؤ۔ ہم انہیں یہ خوشخبری خود سنائیں گے۔“
ناصر اٹھ کر چل دیا۔ اور شاہان احمد نے دوبارہ سر صوفی کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں بند لیں۔ اس وقت اُن کے جذبات میلے جھلے تھے۔
انہیں اپنی مرحومہ بہن بھی یاد آرہی تھی۔ مگر ساتھ ہی جو ذمہ داری یا سر علی اپنی زندگی میں نہ نبھاسکے تھے۔ اُس کا امداد کرنے پر مطمئن بھی تھے۔
زرین بذاتِ خود ان کے دل کو بھاگتی تھی۔

اور آج وہ شان کے لئے اپنی مرضی کی لڑکی سے بات چلی کر گئے تھے وہ یقیناً خوش تھے۔

ہاتھ بڑھا کر انہوں نے میز پر سے گلاس اٹھایا۔ اور سکولش کا آخری گھونٹ بھی پی لیا۔

”بہن مبارک ہو۔ ندین ہماری ہو گئی“ سکینہ بیگم کے اندر آنے پر وہ تعظیماً اٹھتے ہوئے بولے۔ ”آپ بھی منہ میٹھا کریں“ گلاس میں سکولش انڈیل کر انہوں نے انہیں تھما دیا۔ سکینہ بیگم نے ایک لمحہ کو ناصر اور پھر شاہان احمد کو دیکھا۔

”آپ کو بھی مبارک ہو شاہان بھائی“ آخر انہوں نے کہا۔ اور۔ گلاس میں سے گھونٹ پی لیا۔

رات کو شاہان احمد۔ ناصر اور سکینہ بیگم نے مل کر پرتکلف کھانا کھایا۔ ندین نے ساتھ نہیں دیا۔

اندھیرے میں اوپر چھت پر کھڑی۔ سامنے کچے پکے مکاؤں میں جلتی بٹیوں پر نظریں جمائے جانے کیا کیا سوچتی رہی۔

جمعہ کا دن تھا۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ فحشری تیاری مکمل تھی۔

ناصر کے یہاں آنے کے بعد شاہان احمد اپنے ضروری کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ دوبارہ جا نہیں سکے تھے۔ فون پر ہی آج کا مبارک دن منگنی کی انگوٹھی پہنانے کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔

بڑے سے پورچ میں اُن کی سیاہ درسیڈیز اور پھر جیب یکے بعد
دیگر جانے کے لئے تیار کھڑی تھیں۔ وہیں گاڑی کے پاس اُن کا مستعد
باوردی ڈرائیور منتظر کھڑا تھا۔

شاہان احمد، ماما اور کریم بابا نے کار سے جانا تھا۔ جب کہ چند معتبر
ملازموں نے مٹھائی کے ٹوکڑے اور باقی لوازمات اپنی ہمراہی میں جیب میں
لے جانے تھے۔ شاہان احمد حسب معمول قیمتی لباس میں ملبوس تھے۔

کریم بابا شان کے ساتھ پہاڑ پر بخار ہو جانے کی وجہ سے نہ جاسکے
تھے۔ مگر اس وقت بادانی رنگ کی بھاری شلوار پر قمیض اور نئی سیاہ
داسکٹ پہنے۔ سر پر نئی چمکتی کالا ادائیگی سجائے تیار کھڑے تھے۔ اور ماما
سبز رنگ قیمتی جلمکاتا جوڑا پہنے۔ گولہ دار کا ہمرنگ دوپٹہ سر پر لئے سفید براق
برقعہ پہنے نقاب پٹیلے وہیں کھڑی تھیں۔ مٹھائی کے بڑے بڑے کئی
ٹوکڑے رنگدار کاغذوں سے ڈھکے گولوں سے بندھے پاس ہی رکھے تھے۔
”بسم اللہ“ کہہ کر شاہان احمد آگے بڑھے۔ ڈرائیور نے مستعدی سے
اُن کے لئے اگلا دروازہ کھول دیا۔

بچھلی سیٹ پر کریم بابا کے ساتھ چھپاتی ماما جھلملا دوپٹہ سنبھالتی
بیٹھنے لگیں تو۔ مدیر اور بارعب شاہان احمد زیر لب مسکرا دئے۔
بیٹھنے سے قبل۔ انھوں نے اپنی رائفل سے یکے بعد دیگرے فضا میں
کئی فائر کئے۔ ادویوں اپنے لوائی انداز میں اپنے بیٹے کی سنگنی کا اعلا
کرتے ہوئے گاڑی میں جا بیٹھے۔

گاڑی کو حرکت ہوئی۔ اور آہستہ آہستہ حویلی کی فصیل کے ساتھ ساتھ
چلتی بحری کی سڑک پر ہوئی۔ جیپ ڈرائیور نے بھی تقلید کی۔ اور یوں یہ
چھوٹا سا فاصلہ۔ اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا۔
”ماما۔ ہماری بہو دیکھو گی تو داد دو گی ہماری پسند کی۔“ چہرے پر
لازوال خوشی لئے شاہان احمد گویا ہوئے۔

”وہ تو مجھے اب بھی انداز ہے بڑے صاحب۔ لاکھوں میں پسند
کی ہو گی آپ نے۔“ وہ برقعے کا کریم بابا کی طرف گھونگھٹ کرتے ہوئے
بولیں۔ شاہان احمد کے لب ایک بار پھر متبسم ہو گئے۔
ناظم سبے پردہ۔ ہارون سے کوئی حجاب نہیں۔ نذیر اور مجید کو
گالی گلوچ۔ ایک بے چارہ بوڑھا کریم ہی رہ گیا تھا۔ پردہ کرنے کو۔
گاڑیاں سروسوں کے پہاڑاتے کھیتوں کے بیچوں بیچ سر می سڑک پر
ایک دوسرے کے آگے پیچھے درمیانہ رفتار سے چلی جا رہی تھیں۔
معا کریم بابا کی نظر نیچے گری اپنی نسوار کی ڈبیہ پر پڑی۔ قدرے
پرے تھی۔ ماما کے پاؤں کے پاس۔ ہاتھ بڑھا کر اٹھانے لگے۔
”ادی اللہ۔ ہوا بدھا۔“ ماما یوں جھٹ منہ پر نقاب ڈال۔
دور سمٹتے ہوئے کھڑکی سے جا چکیں جیسے خود سولہ سالہ کنواری ہی تو ہوں۔
گھبرا کر کریم بابا نے ہاتھ فوراً پیچھے کر لیا۔
شاہان احمد دھیرے سے مسکرا دیے۔

جوانی کے عاشقوں میں سے کریم بابا کا ایک عاشقہ ماما کے

ساتھ مشہور تھا۔ گو کہ اس معاشرے کا اقرار آج تک ماما نے کبھی
کیا نہیں تھا۔

گاڑی چلتی رہی۔ کریم بابا نے ایک نظر عقب میں دیکھا۔
جیب کافی پیچھے رہ گئی تھی۔ واپس رخ موڑ کر کھڑکی میں سے
باہر دیکھنے لگے۔

دقت گذرتا رہا۔ اور کریم بابا کی سواری کی طلب بڑھی رہی۔
مزید صبر نہ کر سکے۔ رخ اندر کی طرف کر کے دڑتے دڑتے اہولے
پھر ہاتھ بڑھایا۔

شومی قسمت۔ اُن کا ہاتھ ڈبیہ کے ساتھ ساتھ ماما کے
پاؤں سے جالگا۔

"ہائے بکھت! ہوش کی دوا کر۔" ماما زور سے اُچھلیں۔
"کیا ہوا۔؟" سامنے سڑک پر نظریں جمائے شاہان احمد نے
اُن سے پوچھا۔

آج تو شاہان احمد بھی ان دونوں کی نوک جھونک سے محفوظ
ہو رہے تھے۔

دلی آرزو کی تکمیل ہو جانے کا احساس ہو رہا تھا شاید۔
"میں اس کم بخت کا سامنا ہی نہیں کرتی۔ آج خوشی کا موقع تھا۔
اس لئے ساتھ بیٹھ گئی۔ دردہ....." ماما نے گھونگھٹ میں سے قدرے
جھانک کر کریم بابا کو دیکھا۔

اور۔ شاہان احمد پھر دھیرے سے مسکرا دیئے۔

"کریم۔ تم ایک بار قبل بھی ماما کو اس کے کوارٹر کی دیوار پر سے

جھانکے تھے۔" شاہان احمد کا لہجہ اب بھی بارُغیب تھا۔

"میں نے کھینچ کر جوتی ماری تھی۔ اس کے مُنہ پر۔" وہ اس وقت

بھی جوتی اُتارنے لگیں۔

"ارے۔ بس۔ بس۔..." کریم بابا ہاتھ سے اُن کا واروکتے

ہوئے۔ "نوار دبا کئے مُنہ سے بول پڑے۔" "دہ تو چالیس سال

پہلے کا واقعہ تھا۔

اور شاہان احمد کھڑکی کی طرف رُنج کرتے ہوئے آہستہ سے

ہنس دیئے۔

یوں ہی نوک جھونک کرتے۔ محظوظ ہوتے یہ لوگ اپنی منزل

کی طرف رداں رداں تھے۔

سادہ سا انتظام تھا۔ باہر سے کسی کو نہیں بلا یا گیا تھا۔ بات ہی تو پکی کر لی تھی۔ صرف شاہان احمد اور ماما آپسے تھے گاؤں سے۔ مگر اس کے باوجود۔ سکینہ بیگم بوکھلائی بوکھلائی سی تھیں۔ زرین اپنے کمرے میں تھی۔ اور ناصر۔ لائبریری میں چوڑی سی کھڑکی کے پاس آرام پیڑ پر بیٹھا کوئی کتاب دیکھنے میں مگن تھا۔ تبھی ہارن کی آواز پردہ چونسکا۔

نظریں اٹھا کر کھڑکی میں سے دیکھا۔ دور پکی سڑک پر سے شاہان احمد کی کار حویلی آنے والی پتھریلی سڑک پر ہوئی تھی۔

کتاب چھوڑ چھاڑ دہ ان کی پیشوائی کے لئے پیکا۔ ڈیوڑھی کے پاس پہلے شاہان احمد کی گاڑی اور پھر آکر روکے۔ اور پھر شاہان احمد کو گاڑی سے اتارتے ہوئے اس کی نظر پچھلی سیٹ پر ماما اور کریم بابا پر پڑی۔

حلق سے ابلتا ہنقہہ مشکل روکے۔ وہ تینوں کو اندر لے گیا خدراٹلے میں بٹھایا۔ پھر مٹھائی کے ٹوکے اتارے گئے۔ ملازمین کو بٹھایا گیا۔

دستور کے مطابق شہد ملی شربت سے سبکی تواضع کی گئی۔ "جاؤ۔" ماما زرین بیٹی کو انگوٹھی پہنا دو۔ "شاہان احمد بولے: "ماما اب۔۔۔ بھی گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھیں۔ کریم بابا جو موجود تھے۔

ناہر سنہی بمشکل قابو کئے ہوئے کہا تھا۔ ماموں کا ادب ملحوظ خاطر تھا ورنہ تمہارے لگا لگا کر درو دیوار ہلا دیتا۔

ماما بتیبیں ٹٹولتیں۔ انگوٹھی کی ڈبیہ نکالنے لگیں اور پھر سکیٹہ بیگم کی ہمراہی میں زرین کے کمرے میں آگئیں۔ زرین ہلکے آسمانی رنگ کے سادے سوٹ میں ملبوس صوفے پر بیٹھی کوئی راستہ بھونی آسمان سے بھٹکی ہوئی حور لگ رہی تھی۔ اتنی اور ماما کو دیکھتے ہی سمیٹے سکرٹے ہوئے اُس نے سر جھکا لیا۔

”میں صدقے جاؤں“ ماما برقعہ لپیٹ۔ ایک طرف رکھ اُس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ”میں بھی کہتی تھی بڑے صاحب غلط بات نہیں کرتے واقعی حور پسند کی ہے۔ اپنے شان بیٹے کے لئے۔“

چند لمحہ وہ اُسے یک ٹک دیکھ گئیں۔ سکیٹہ بیگم پاس ہی کھڑی تھیں۔ ”بیگم صاحب۔ مٹھائی منگوائیں“ ماما جیسے ہوش میں آکر بولیں۔ مٹھائی آگئی۔ سکیٹہ بیگم چپ سی بیٹھتی ہوئی تھیں۔

پتہ نہیں کیوں۔ اچھی طرح معلوم ہونے کے باوجود بھی کہ بیٹی نے ایک نہ ایک ضرور دوسرے گھر جانا ہے۔ اس وقت جیسے کوئی ان کا دل ٹٹھی میں لئے ہوئے تھا۔ شاید اس لئے۔ کہ آج کے بعد وہ اُن کی نہ رہی تھی۔ قسمت میں خوشی ہوئی تو ٹھیک۔ ورنہ ماں کتنی بے بس ہو جاتی ہے۔ بیٹی کی زندگی کے اس موڑ پر آکر۔

”پروردگار! میری زرین کو سدا خوش رکھنا۔“ ماما بسم اللہ کہہ کر ڈبیہ کھولتے

ہوئے انگوٹھی نکالنے لگیں۔ تو سکیٹہ بیگم جلدی سے بول پڑیں۔ گویا یہی وقت تھا یہی چند لمحے زرین کے مزید ان کے اپنے تھے۔ انگوٹھی پہن لینے کے بعد وہ کسی اور کی ہو جاتی تھی۔

ماما نے زرین کا دایاں ہاتھ تھاما۔ نرم سانازک خوبصورت ہاتھ۔ اور سکیٹہ بیگم اس کی خوشیوں کے لئے دعاؤں کا ورد کرنے لگیں۔
ماما نے بھی اس کی خوشیوں اور شان کے ساتھ پھلنے پھولنے کی دعاؤں کے ساتھ شان کی والدہ کی ہیروں جڑی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنادی۔
”مبارک ہو بیگم صاحب۔ مبارک ہو بیٹیا“ ساتھ ہی پلیٹ میں سے لڈوا اٹھا کر انہوں نے زرین کے منہ کی طرف بڑھایا۔ ”منہ میٹھا کرو بیٹیا“
زرین نے تھوڑا سا لیا۔ تو وہی لڈو ماما نے سکیٹہ بیگم کی طرف بڑھایا اور انھوں نے بھی لے لیا۔ تو باقی کا لڈو ماما نے اپنے منہ میں ڈال لیا۔
”اللہ جوڑی سلامت رکھے“

اور ماما۔ صوفے سے اٹھ کر وہیں چھا چھمنا چنے لگیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی زرین کو ان کے سبز جھلملاتے جوڑے۔ گوٹہ لگے دوپٹے۔ چھیلے زیورات اور قص کے انداز پر ہنسی آگئی۔ فوراً امر گھنٹوں میں دے کر مسکرا دی۔ اور سکیٹہ بیگم۔ اپنی بھر آئی آنکھیں دوپٹے کے پلو سے پوچھتی مسکرا دیں۔
اور پھر ناہر نے آکر۔ ماما کے دونوں ہاتھ تھام کر خوبصورت STEPS لینے شروع کئے تو سکیٹہ بیگم ہنسے بغیر نہ رہ سکیں۔

”یہ بتائیں ماما۔ آج کریم بابا کے ساتھ کیسے آنا ہوا۔؟“ رک کر ناہر بڑی

دیر کی رو کی بات زبان پر لے ہی آیا۔

”اے موا بڑھا۔ میں بھلا اُس کے ساتھ کیوں آنے لگی۔ میں تو اپنے بڑے صاحب کے ساتھ آئی ہوں۔“ وہ زرین کے ساتھ صوفے پر بیٹھتیں پھولی سالنوں کے درمیان بولیں۔

”یہ جوڑا۔ یہ لشکارے۔ بڑے صاحب بچارے کے لئے کون پہنتا ہے۔“

وہیں کھڑے کھڑے ناہر نے کہا۔
”اے ہرٹ ساروں کی۔ یہ تو شان بیٹے کی منگنی کے لئے بڑے صاحب نے بتوائے ہیں خاص طور سے۔“

”آنکھ تو نہیں ماردی تھی راستہ میں بابا نے۔ ماموں جان کی نظر بچا کر۔“ ناہر شرارت پر آمادہ تھا۔

”آنکھ نہ کھوڑ دوں۔“ وہ جلال میں آگئیں۔

”اور ابھی جو گھونگھٹ نکال کر بیٹھی تھیں ڈرائنگ روم میں۔“

ناہر نے ہاتھوں کا گھونگھٹ بنایا۔

”پردہ کرتی ہوں میں۔“

”ناظم۔ مجید اور نذیر سے تو کبھی نہیں کرتیں گئیں ہانکتی رہتی ہیں۔“

”اے لو۔ اب میں اُن سے پردہ کروں گی۔ وہ سب اُن کے پوتوں کے

برابر تو تھے۔

”ہاں۔ نا ایک کریم بابا ہی تو رستم زماں ہیں۔ جن سے آپ پر پردہ لازم

ہو گیا ہے۔ صاف صاف کہتی کیوں نہیں کہہ رہے ہیں آپ پر۔“ ناہر کہتے کہتے

باہر کی طرف لپکا۔ اور ماما چیں بچیں ہو کر رہ گئیں۔
 "اے لوناصر میاں نے تو اوسان ہی خطا کر دئے۔ وہ جلدی سے اٹھتے ہوئے
 بولیں۔" جا کر بڑے صاحب کو مبارکباد تو دے آؤ گی۔"
 سکینہ بیگم بھی آہستہ آہستہ چلتی ڈرائنگ میں آ گئیں۔
 شاہان احمد نے اٹھ کر ایک ہزار روپیہ ماما کو دیا۔
 کریم بابا آگے بڑھے۔ "مبارک ہو صاحب۔" "تمہیں بھی مبارک ہو۔"
 کریم۔ "ایک ہزار روپیہ اکھنیں بھی کھاتے ہوئے۔ شاہان احمد نے
 انہیں گلے لگا لیا۔ کریم بابا نے ناصر کو بھی گلے لگا کر مبارکباد دی۔
 اور پھر باہر نکل کر سب ملازموں میں سمٹائی بانٹ بانٹ کر۔
 مبارکباد دیتے اور لیتے رہے۔

دوپہر کے کھانے کا اعلان ہوا۔ ماما اور زرین کا کھانا۔ زرین کے
 کمرے میں گیا۔ کریم بابا اور باقی ملازمین کو باہر بٹھایا گیا۔
 شاہان احمد۔ سکینہ بیگم اور ناصر کمرے میں لگے پُر تکلف کھانوں کے
 گرد جمع ہو گئے۔

شاہان احمد بہت خوش تھے۔ سکینہ بیگم بھی چپ چپ۔ مگر
 مطمئن تھیں۔ ناصر بھی خوش لگ رہا تھا۔
 خوشگوار باتوں کے دوران کھانا کھایا جا رہا تھا۔
 یکبارگی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔
 "شاید ماما نکل ہوں۔" ناصر اٹھتے ہوئے بولا۔

سکینہ بیگم کچھ پریشان سی لگنے لگیں۔

مقہوڑی ہی دیر بعد ناصر مکرراتے ہوئے آ رہا تھا۔

”کون تھا۔؟“ سکینہ بیگم نے پوچھا۔

”انکل ماجد کی بیٹی فرزانہ تھیں۔ زرین سے بات کرنے کو کہتی تھیں۔
بھیج دیا میں نے زرین کو۔“

”اچھا ہے یہ لوگ خفا نہیں ہوئے۔“ ناصر بیٹھ چکا تو سکینہ بیگم

زیر لب بولیں۔

”آپ ناحق فکر کرتی ہیں اتنی۔ میں انکل اور آنٹی کی اچھی تسلی کر چکا ہوں۔
کیوں خفا ہوں گے وہ لوگ۔ یہ تو قسمت کی بات ہوتی ہے۔“

”ماں بیٹے میں کوئی پرائیویٹ بات ہو رہی ہے شاید“ شاہان احمد
اُن کے دھیمے دھیمے لہجے پر مکرراتے ہوئے بولے۔

”پرائیویٹ نہیں ہے ماموں جان۔ دراصل میرے امریکہ جانے

سے پہلے انکل ماجد اپنے چھوٹے بیٹے ساجد کے لئے زرین کا رشتہ

مانگنے آئے تھے۔ میں نے امریکہ سے واپسی تک کے لئے بات ملتوی

کر دی تھی۔ کہ سوچ کر جواب دوں گا۔ پھر اتنی کا خط امریکہ آیا۔

شان کے بارے میں۔ ظاہر ہے کہ شان مجھے ساجد سے زیادہ عزیز

ہے۔ پرسوں رات جب آپ کا فون آیا تھا۔ میں انکل ماجد کے

یہاں ہی گیا ہوا تھا۔ زرین کی بات شان سے پکٹی ہونے کے بارے

میں بتانے کے لئے۔ انہیں اُن کی خواہش پوری نہ ہونے کا افسوس

ہونا قدرتی تھا۔ مگر انہوں نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ بولے یہ قسمت کی بات
 ہوتی ہے۔ میرے لئے جیسے ساجد ویسے شان....“
 ”گڈ۔ واقعی یہ قسمت کی بات ہوتی ہے۔ انھیں افسوس ہونا بھی نہیں
 چاہئے۔ حق یہ حقدار رسید۔ یا سر میرا بھائی بھی تو تھا۔“
 ”ہاں۔ یہ باتیں تو قسمتوں کی ہی ہوتی ہیں۔ سیکھنے بیگم آہستہ
 سے بولیں۔“

”جبھی کچھ غرضہ قبل ہم نے زرین کو ان کے یہاں دیکھا تھا۔ تو اُس کے
 متعلق بتاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ ہم نے بہن کو بات بتائی ہے ساری۔
 ہمیں تمہا بھی ایسا ہی محسوس ہوا تھا کہ وہ زرین کو اپنے کسی لڑکے کے لئے
 پسند کئے ہوئے ہیں۔“

”شاید ایسا ہی ہو۔“ ناصر بولا۔ ”مگر اتنی نے بھی انہیں منع کیا ہوا
 تھا کہ زرین یا اتنی کے متعلق وہ ابھی کچھ نہ بتائیں۔“
 ”یہ بھی ہو سکتا ہے۔“ شاہان احمد بولے۔

شام ہونے قبل شاہان احمد نے اجازت طلب کی۔ اور پھر۔
 یہ چھوٹا سا قافلہ۔ خوش خوش واپس روانہ ہوا۔

..... شان بیٹے زیادہ کیا تعریف کروں۔ تعریف اُس خدا کی جس نے
 جہاں بنایا۔ بس جیسے تم ہو۔ ویسی ہی لڑکی ہے۔ چندے آفتاب چندے مہتاب ہے۔
 ہستی ہے تو پھول جھڑتے ہیں منہ سے۔ بولتی ہے تو گھنگھرو بجھنے لگتے ہیں۔
 بھول جاؤ پچھلی ہر بات۔ اپنی دہن کو دیکھو گے تو بڑے صاحب کو داد دو گے۔
 بڑے صاحب اور وہ مولا کریم بھی تھا۔ سب گئے تھے۔ ناہر میاں پہلے سے
 موجود تھے وہاں۔ تمہاری ماما تمہارے صدقے چلے۔ اب ذرا فکر نہ کرنا۔
 اپنی صحت کا خیال رکھنا۔ اتنا سامنے نکل آیا تھا دشمنوں کا۔ جب بکھلی
 بار آئے تھے تو۔ کریم صفت خورے کو ذرا تمہارا خیال نہیں۔ بیماری کا بہانہ
 کہہ کے تمہارے ساتھ تو گیا نہیں۔ دو ہی دن بعد یہ لمبی اشگی باندھ کر اور نئی
 واسکوٹ کس کر۔ گز بھر لمبی تازہ خضاب لگی مکھن سے چپکانی مونچھوں کو
 تاؤ دیتا ہٹا کٹا چل دیا۔ منگانی پر۔ نذیر سے کہہ کر میں نے تو اُسکی خضاب
 والی پڑیا ہی ارڈ والی تھی۔ مگر جانے کہاں سے عین منگنی سے پہلے اور
 پیدا کر کی۔ کالک ملنے کی اس کی شہر ہے یہ۔ لعنت ہے۔ تم اس کی اچھی طرح
 خبر لینا اور اپنی خدمت پر دھیان دیتے پر تاکید کرنا۔ اچھا اب بند کرتی
 ہوں۔ مولا دروازہ پیٹے جا رہا ہے۔ مجید بیہ چارے کو لکھتے ہی نہیں دے

رہا۔ ہمیں معلوم ہے۔ ہتھاری ماما خود لکھ سکتی ہیں۔

فقط دعا گو ہتھاری ماما

بقلم خود۔

خط پڑھ کر اُسے حسب معمول ہنسی بھی نہیں آئی۔ اور حسب عادت ماما پر پیار بھی نہیں آیا۔ پچھلے ہفتے کا ڈن گیا تھا۔ وہاں کوئی آثارِ توحہ تھے سنگی وغیرہ کے۔

بہر حال۔ جس دن وہ واپس آ رہا تھا۔ اُس دن ناصر امریکہ سے آ رہا تھا اور بابا جان اُسے ریسو کرنے ایر پورٹ جا رہے تھے۔ اُسے بھی ساتھ چلنے کو کہا تھا۔ مگر اس نے کام نہ کیا یہاں کہے کے ٹال دیا تھا۔ پھر چند روز بعد جمعہ تھا۔ سنگی کی رسم ادا کی گئی ہوگی۔

کریم بابا ابھی ابھی پہنچے تھے۔ ساتھ ہی ماما کا خط بھی لائے تھے۔ اُس نے خط بیڈ سائیڈ ٹیبل پر اُچھال دیا۔ اور خود سامنے وادی کی طرف کھلتی بالکون کی طرف آ گیا۔

مطلع آج بھی صاف تھا۔ دن بھر کا تھکا سوریج سامنے سرخی بہاڑ کے پیچھے آرام کرنے کی غرض سے پناہ لینے کے لئے سرگرداں تھا۔

سدا بہار پائینٹر پرانا میلارنگ جھٹک کر نیا تازہ بنر ببادہ ادرھے تھے۔ نرم خرام ہوا لمبی لمبی گھاس میں سرگوشیاں کرتی۔ اٹھکیکیاں کھیلتی سر سر رہی تھی۔ بھولا بھٹکا ایک عقاب دور آسمان کی وسعتوں میں شاہانہ شان سے تیر رہا تھا۔ کتنا شکون تھا پوری وادی میں۔

دور۔ اہیر۔ پہاڑی کی چوٹی کے پاس بنے چھوٹے سے مکان سے
اچانک دھواں اٹھا۔ تو شان کو لگا۔ دھواں وہاں سے نہیں۔ اُس کے
دل سے اٹھا تھا۔

گہری اُداس سانس لے کر وہ پلٹا۔ اور وہیں رکھے آرام چیر پر ڈھیر ہوتے
ہوئے۔ بازو سے آنکھیں ڈھک لیں۔ اور پھر اُسے محسوس ہوا۔ وہ تو پورے
کا پورا سُلگ رہا تھا۔ اندر ہی اندر۔ دھیرے دھیرے۔ چپ چاپ۔ گھٹ
گھٹ کر ختم ہو رہا تھا۔ من ہی من میں۔ ہولے ہولے۔ چپکے چپکے۔
ناہر سے اُس نے کوئی رابطہ اُس کے بعد نہیں رکھا تھا۔
زرین؟۔ اس کے متعلق اُس نے ہر بار ہر سوچ ذہن سے جھٹکنے کی
کوشش کی تھی۔ یہ الگ بات تھی۔ کہ ہر بار ذہن سے جھٹکنے کے بعد بھی۔
اُس کی یاد سانس بن بن کر۔ اُس کے سینے میں در آئی تھی۔
اُس کی دانست میں وہ اُس سے شدید نفرت کرتا تھا۔ مگر ٹھنڈے
دل سے سوچتا تو۔ اس اس ہوتا کہ۔ محبت اور نفرت۔!

BOTH ARE SAME BECAUSE BOTH SAME INTENSITIES

اُس کا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ اُس کی یاد مدھم پر جائے گی۔
مگر۔ اس وقت تک تو۔ اُس نے اُسے کون سے ایک سانس بھی نہیں
لینے دیا تھا۔ کاش! وہ اُسے بھول جائے۔

اُد۔ پھر وہ چونکا۔ اب تو اُسے یاد کرنے کا اُسے حق بھی نہیں رہا تھا۔
بابا جان نے آخری کیل جو ٹھونک دی تھی۔ اور اُسے لگا۔

اُس کا دل گھٹا رہا ہے۔ آنکھوں سے بازو ہٹا کر اُس نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا۔ پھر اُسے آنکھوں کے آگے اندھیرا سا محسوس ہوا۔ اور پھر وہ چند لمحوں کے لئے غافل ہو گیا۔

”شان۔۔۔ شان۔“ اور ناصر بالکنی میں نکل آیا۔
 ”شان۔!“ وہیں اُس کے پہلو میں ٹکے آرام چیر پر ٹپکتے ہوئے۔ اُس نے اُس کا ماتھا ہلاتے ہوئے پکارا۔
 ”ہوں۔“ شان نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ شام کے سائے سلجے ہو رہے تھے۔ مگر اتنے بھی نہیں کہ وہ شان کی بھاری سٹرخ آنکھیں۔ پیلاشت چہرہ نہ دیکھ سکے۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ ناصر نے گہرا کر اُس کی نبض تھام لی۔
 ”ٹھیک ہوں۔“ لہجے میں تلخی اور بے نیازی کے باوجود اس کی آواز بہت کمزور ہو رہی تھی۔ ناصر کو اچانک اپنا آپ جرم سالگنے لگا۔
 ”اٹھو۔ اندر چلیں۔ شام خنک ہو رہی ہے۔“ اُس نے اُسے بازو سے تھامتے ہوئے اپنا بیت سے کہا۔

”بہیں ٹھیک ہے۔“ ہاتھ چھڑا کر وہ سختی سے بولا۔ گو آواز بخشل ساتھ دے رہی تھی۔

اور ناصر کو لگا۔ وہ ہی اُس کا جرم ہے۔ اُس کی خوشیوں کا قاتل ہے۔
 ”اٹھو شان!“ زبردستی اُس کا بازو اپنی گردن کے گرد لپیٹتے ہوئے۔
 اُس نے اُسے کھڑے ہونے میں مدد دی۔

”میں ٹھیک ہے۔“ اُس کی گردن میں بازو ڈالے وہ ساتھ چلتے ہوئے بولا۔
 ”میں چلا جاؤں گا۔“

”یہاں لیٹ جاؤ۔“ بستر تک لا کر اُس نے اُسے لٹا دیا۔ اور آگے بڑھ کر
 گھنٹی کر دی۔ شان لیٹے لیٹے چھت کو گھورنے لگا۔ گویا اُسے ناصر کی طرف
 دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔

”بابا گرم دودھ اور اوٹینین۔ جلدی لائیں۔“ کریم بابا کے اندر داخل ہوتے
 ہی ناصر نے انہیں کہا۔ اور ایک نظر شان کے سفید پڑتے چہرے پر ڈالتے
 ہوئے پریشان سے بابا کچھ پوچھے بنا اُلٹے قدموں واپس چلے گئے۔
 ناصر اس کے بستر پر اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ بجلی کی روشنی میں اُس کے
 چہرے کو بغور دیکھا۔ اس تھوڑے عرصہ میں شان وہ شان ہی نہ رہا تھا۔
 کھلتے گندمی رنگ پر جھلکتی صحت مند سرخی کا نشان تک نہ تھا۔ چہرہ
 پہلے سے چھوٹا اور کم ہلا کر رہ گیا تھا۔ اندر ہی اندر غم جیسے اُسے کھائے جا رہا تھا۔
 اور ناصر کو لگا۔ وہ آج اس راز کو مزید راز نہ رکھ سکے گا۔

وہ شان کو بتا کر رہے گا سب کچھ۔ شان کچھ نہیں کہے گا۔ اگر دل میں کوئی
 کدورت آئی بھی۔ تو زین سے بے پناہ پیار اُسے دھوڑا لے گا۔ کھلا پیار بھی
 کبھی کوئی اونچ نیچ دیکھتا ہے۔ ایسا ہوتا تو بادشاہ کی کھکارن پر اور کھکاری
 کی نظر کسی شہزادی پر نہ پڑتی۔ یہ تھا تو ایک جذبہ ہے۔ جہاں آکر ہر اونچ نیچ
 ہموار ہو جاتی ہے۔

”آجائیں بابا۔“ دستک پر ناصر بولا۔ اور بابا باٹریسے لئے اندر داخل ہو گئے۔

"میز ادھری اٹھا لائیں۔ بابا نے صوفے کے پاس سے میز لاکر شان کے بستر کے پاس رکھ دی۔ برتن اُس پر رکھے۔ اور خالی برٹے ہاتھ میں پکڑ لی۔

"چھوٹے سرکار کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" بابا ہوجہ تشویش لئے ہوئے تھا۔

"جی بابا ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ فکر مت کریں۔

"اچھا ہے۔ ناصر بیٹا آپ آگئے۔ چھوٹے صاحب کی بس یہی حالت ہے کچھ غصہ سے۔"

"رب ٹھیک ہو جائے گا بابا۔" ناصر نے اود لیٹین اور شکر دودھ میں ڈال کر چمچ ہلاتے ہوئے کہا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" وہ جانے لگے۔ پھر جیسے جلتے جاتے انہیں یاد آیا۔ "آپ کوئی اسپیشل چیز کھانے پر پسند کریں گے ناصر بیٹا۔" وہ رُک کر پوچھنے لگے۔

"نہیں۔ جو شان کھائیں گے وہی ٹھیک ہے۔"

"مگر شان بیٹا تو کئی راتوں سے کھانا کھاتے ہی نہیں۔"

اور ناصر شان پر ایک تشویش بھری نظر ڈال کر رہ گیا۔

"چلن کورن سوپ بنوائیں۔ سٹیک اور چاول کے ساتھ سیخ تکتے۔

اور جیلی۔" اُس نے ہر چیز شان کی پسند کی بتائی۔ "ہم دونوں کھائیں گے

اور اس وقت ایک کپ کافی میرے لئے۔

"ٹھیک ہے صاحب۔" اور بابا کچھ مطمئن ہو کر کمرے سے چل دیئے۔

ناصر اٹھا۔ شان کے سر کو سہارا دیتے ہوئے تکیے نکال کر مسہری کی
پشت سے لگائے اور اُسے قدرے ادبہ کھیپتے ہوئے آرام سے تکیوں سے
”لگا دیا۔ شان مسکرا دیا۔

لیکن اس کی مسکراہٹ میں تلخی، اُداسی، دکھاوے بیسی تھی۔
”لو۔ یہ دودھ پی لو۔“ وہیں اُس کے سر پر ہاتھ بیٹھتے ہوئے۔ ناصر نے گلاس
اُس کے ہونٹوں سے دگادیا۔ شان سارا دودھ پی گیا چپ چاپ۔
ناصر نے گلاس واپس میز پر رکھ دیا۔ پیر نیپکن اُٹھایا۔ شان کا منہ
صاف کیا۔ اور استعمال شدہ نیپکن واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔
شان چپ چاپ اس کی تعمیل کرتا اور کرتا گیا۔ ناصر ہمیشہ سے ایسا
تھا۔ شان پر جان چھڑکتا تھا۔ اُس کی ذرا سی تکلیف پر بے چین ہوا اُٹھتا
تھا۔ شان بھی اُسے کم نہ چاہتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اُس نے بہت
مشفق قسم کی طبیعت پائی تھی۔

سال بھر کا فرق ہوتے ہوئے۔ وہ ناصر کو اپنے سے بہت چھوٹا سمجھتا۔
اور ٹریٹ کرتا تھا۔

مگر۔ ایک آہ سی شان کے لبوں پر آکر دم توڑ گئی۔

”شان۔“ ناصر، شان کے ماتھے پر سے بال ہٹائے ہوئے اپنا ٹیٹ سے پولا۔

”کیا ہے۔؟“ شان نے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ کتنا دکھ تھا۔ اس کی آنکھوں میں۔ خداوند!۔ ناصر کانپ سا گیا۔ ابد پھر۔

”زرین، ابو کی دوسری بیوی کی بیٹی ہے۔“ اُس نے براہِ راست کہا۔

شان اُسے لمبی تمہید کا متحمل نظر نہیں آ رہا تھا۔ ”میری بہن ہے وہ۔“

شان کی نظریں اُس کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ گو نہ بات ابھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

”ہاں شان۔ تقریباً بیس سال پہلے الیکٹرک کے سلسلے میں ابو کا جانا۔ یہاں سے دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوا تھا۔ وہیں انکھوں نے.....“

ناصر کہتا گیا۔ اور شان ایک ٹک۔ پلک جھپکاتے بغیر۔ اُس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کی داستان سُنتا گیا۔

”میں نے اتنی اور زرین کو گولف کلب کے نزدیک اُس انیکسی میں منتقل کروایا تھا۔ تم نے شاید میرے سامریہ جانے سے قبل مجھے نیچے شہر میں دیکھا ہوگا۔ میں ملنے گیا تھا اتنی اور زرین سے۔ ماہانہ خرچ دینا تھا۔ تقریباً ایک ماہ سے جا نہیں رکھا تھا۔ کئی کام تھے اُن کے میرے کرنے والے ہتھوڑے وہاں آنے جانے کا وہ لوگ مجھ سے ذکر کر چکی تھیں۔ میں خوش تھا۔ یہ سب جان کر۔ پھر۔ بواپسی رات بٹھرتے ہمارے پاس آیا۔ تو تم نے میری دہاں پر موجودگی کا اشارہ بھی دیا۔“

تم مجھ سے ناراض تھے کہ میں نے ماموں جان سے زرین کے لئے تمہاری بات کیوں نہیں کی۔ مگر میں مجبور تھا۔ میں خود سے اپنی بہن کی بات کیسے کرتا کیسے کہتا.....؟ کہ تم اُسے..... پسند کرتے ہو..... یا وہ تم سے.....

اور پھر تب ماموں جان کو یہ علم بھی نہیں تھا کہ انی اور زرین درحقیقت کون ہیں۔ میں کسی طرح تمہاری بات کر بھی لیتا اور بعد میں انھیں معلوم ہو جاتا کہ زرین میری بہن ہے تو اُسے وہ میری خود غرضی سمجھتے۔ اور پھر یہ کہ میں نے بھی اُن سے راز کیوں چھپائے رکھا۔۔۔۔۔

”بابا جان کو اب پتہ ہو گیا کیا۔؟“ شان نے پہلی بار لب کھولے۔
 ”ہاں۔“ ناصر نے کہا۔

”کیسا؟ کس نے بتایا۔؟“ تم کہتا ہے ناکہ زرین کی اتنی۔۔۔۔۔“
 ”میری اتنی۔“ ناصر نے سکر اتے ہوئے تصحیح کی۔

”ادہ لیں۔ تمہارا اتنی نے تم کو منع کیا تھا کہ بابا جان کو فی الحال پتہ نہ لگے۔“
 ”ہاں۔ کسی کو کبھی نہیں۔ یہ تو خود ماموں جان نے زرین کو انکل ماجد کے گھر دیکھا تو بات گریڈی۔ اور جب تک ہتھ تک نہ پہنچے بات چھوڑی نہیں۔“
 ناصر نے سکر اتے ہوئے کہا۔

”ادہ گوڈ۔ کیسا کیسا سیکرٹ نکلا ہے آج۔“ شان دھیرے دھیرے جیسے خود سے بولا۔ اس کی روح پر سے ایک بھاری بوجھ ہٹ گیا تھا۔
 اُسے کتنی شدید غلط فہمی ہوئی تھی ناصر کو وہ کتنا غلط سمجھا تھا۔ اُسے اپنے آپ سے نفرت سی ہونے لگی۔

”ناصر“ اُس نے دونوں بازو پھیلا کر ناصر کے گرد لپیٹ لئے۔ مجھے
معاف کر دو۔ پلیز فور گیو می“

ناصر کے دل سے بھی ایک اذیت ناک وزن اتر گیا تھا۔
”اب بھٹیک ہو جاؤ شان پلیز۔ دیکھو سب کتنے فکر مند ہیں۔“ اور۔
شان کی گرفت اچانک ڈھیلی پڑ گئی۔

ناصر زرین کا بھائی تھا۔ دوسرے لفظوں میں زرین اب بھی شان کو اپنا
ہی سمجھتی تھی۔ تو وہ جو خود زرین کا نہیں رہا تھا۔ اُس نے خود ہی تو بابا جان
کو خط لکھ کر اُن کی مرضی کے مطابق لڑکی کے لئے منظوری دے دی تھی۔

اور۔ شان کا دل چاہا کہ۔ کپڑے بھاڑ کر کہیں نکل جائے۔ یہ اُس نے
کیا کر دیا تھا۔ اپنے پاؤں پر خود ہی کھماڑی مار دی تھی۔

لیکن اگر وہ منظوری نہ لکھتا۔ تو کیا بابا جان بھی رُک جاتے۔ یہ
کام تو ہر صورت انہیں کرنا تھا۔

”کسی لڑکی سے شادی کا دفعہ کرنے سے پہلے تم نے یہ کیوں نہیں سوچا۔
کہ تمہارے لئے لڑکی پسند کرنا ہمارا کام ہے۔ تمہارا نہیں۔“ اُسے بابا جان کے
خط کے الفاظ یاد آ گئے۔ خط کے اگلے ہی دن وہ زی کی طرف چل پڑا تھا۔
کتنا اُداس تھا۔ ادھورا ادھورا سا۔

بابا جان نے زی سے متعلق ہر امیر بھی توڑ دی تھی۔ اور وہ ملنے بھی جا
رہا تھا اُسے۔ ایک چیز ملتی بھی نہیں تھی۔ اور اس کے بغیر رہا بھی نہیں جاتا تھا۔
اور پھر۔ اُس کے ساتھ ناصر کو دیکھ کر۔ وہ شکوک و حد میں مبتلا ہو کر

واپس چل پڑا تھا۔ تو۔ کتنا ٹوٹا ہوا۔ کتنا بکھرا ہوا تھا۔

پھر اُس نے اُسے بھلانے کی کوشش کی تھی۔ اُس کی یادوں سے فرار کا سوچا تھا۔ اور۔ پھر۔ کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ تو اُسے غصہ نے آلیا تھا۔

اور تھی۔ اُس نے اس کا توڑ سوچا تھا۔ مردانہ وار توڑ۔ اور بابا جان کو اُن کی پسند سے متعلق اپنی منظوری لکھ دی تھی۔ مگر۔ وہ چونکا۔

تب تو اُس نے زی سے مایوس ہو کر ایسا کیا تھا۔ اور اب۔ اس وقت۔ اُس کی امید پھر بندھ گئی۔ زی کسی اور کی نہیں تھی۔ شان کی تھی۔ اب بھی۔!

”ادہ ہدایا۔ ازی نے اُس کا انتظار کیا ہوگا۔ وہ نہیں گیا ہوگا۔ تو سوچا ہوگا۔ بھول گیا ہے اُسے۔ اور پھر۔ اب ناصر نے اُسے شان کی سنگنی کا بتایا ہوگا تو سوچ رہی ہوگی۔“ بے وفا تھا۔

”ہم جاتے ہی اپنے بابا جان سے بات کرے گا۔ تم میرا انتظار کرو۔ بہت جلدی تم کو یہاں سے لے جائے گا۔“ اُسے یاد آیا۔ اُس نے زرین سے کہا تھا۔ ناصر کو چھوڑ کر اُس نے اپنا چہرہ دونوں بازوؤں سے ڈھک لیا۔ وہ واقعی بے وفا تھا۔ اُس نے سوچا۔

اُس نے پھر بازو چہرے پر سے ہٹا دیئے۔ ہدیائی انداز میں آنکھوں پر ادھر سے ادھر جھول گیا۔ ”بے وفا۔“ دل نے ملامت کی۔ ”اگر بابا جان سے ٹکر نہیں لے سکتے تھے تو اُس معصوم کو کیوں پیار سے آشنا کرایا۔ اور پھر جب اُسے پیار کرنا سکھا ہی دیا۔ تو ڈٹ کر رہتے اپنی جگہ پر۔ ایک دن۔“

ایک ماہ۔ ایک سال۔ بابا جان کو ہمارے پیار کی قوت کا صحیح اندازہ ہو جاتا تو خود بھی سپردال دیتے۔

”ناھر۔“ سر اٹھا کر اُس نے پاس بیٹھے ناھر کی گود میں رکھ دیا۔ ہم زری کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہہ دو بابا جان کو۔ میں اس سنگی کا پابند نہیں ہے۔ میں زری کے لئے ہر مشکل سے لڑے گا۔

اور ناھر نے بے تحاشہ آئی ہنسی بمشکل روک لی۔ اور پھر۔ یکدم ہی اُسے شرارت سوچھی۔

”کہہ دوں گا..... مگر.... ماموں جان“ اُس کی شکل بہت سنجیدہ تھی۔

”ایسا مت کہو ناھر۔ میں جان لڑا دے گا..... میں....“

”ماموں جان نے مجھے بتایا ہے کہ تم اپنی پسند کی کسی لڑکی سے شادی کرنا

چاہتے تھے۔ مگر انہوں نے سختی سے روک دیا۔ اور....“

”اور کیا۔؟“ وہیں اُس کی گود میں سر رکھے اُس نے ناھر کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

”کہ۔ ایسا کرتے ہوئے انہیں افسوس بھی ہوا تھا۔“

”کیا مطلب؟ سنگی کرتے ہوئے۔؟“ شان کی آواز میں امید کی کرن تھی۔

”نہیں۔“ ناھر نے کہا۔

”پھر۔؟“ لفظ ”پھر“ پر دوبارہ مایوسی میں ڈوبا گیا۔

”تمہیں۔ ہمتیاری پسند کی لڑکی سے روکتے ہوئے انہیں افسوس ہوا تھا۔“

”تو پھر ایسا کونسا مجبوری تھا۔ کہ وہ اپنا پسند کرنے پر مجبور ہو گیا۔“

اور ناصر دھیرے سے مسکرا دیا۔ ”کوئی مجبوری ہوگی۔ اُن کے اُن کی
اُن کے اصول کی۔ میں یا تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے۔“

”کچھ بھی ہو۔ اُن کو کہہ دو۔ شان یہاں شادی نہیں کرے گا۔ اگر وہ
میری بات نہیں مانے گا۔ تو میں خود اُس گھر میں انکار بھیج دوں گا۔۔۔۔۔
ویسے۔ BY THE WAY یہ ہے کون لوگ؟“

”ہے ایک اُن کے معیار کا۔ اچھا گھرانہ۔ بقول ماموں جان“ ناصر
نے مسکراتے ہوئے مزید کہا۔

”تم جانے۔ تمہارا ماموں جان جانے۔ میرا پیغام کل ہی ان کو دیدو“
”ویسے تمہاری اطلاع کے لئے غرض ہے کہ میں وہاں نہیں جا رہا
ہوں۔ اپنے گاؤں جا رہا ہے۔ نہر کی طرف والی زمین پر تنازعہ اٹھایا
ہے۔ کسانوں نے۔ پٹواری نے وقت دیا ہے۔ نہ پہنچا تو اگلے سال
تک ہاتھ نہیں آنے کا۔“

”ٹیلیفون پر۔؟“ وہ بے تاب سے بولا۔

”لائن خراب ہے۔ چیک کر لو۔“

”اوہ۔“ اُسے یاد آیا۔ لائن واقعی خراب تھی۔

”اور پھر۔۔۔۔۔“ ناصر ایک بار پھر سنجیدہ نظر آنے لگا۔

”کیا۔؟“ شان چونکا۔

”میرے امریکہ جانے سے قبل۔ انکل ماجد نے اپنے ڈاکٹر بیٹے ساجد

کے لئے زرین کار شہہ مانگا تھا۔

”تو کیا ہوا۔؟“ وہ لاپرواہی سے بولا۔

”وہی جو ہوتا ہے۔“ ناصر بھی اطمینان سے بولا اور شان چونکا۔
 ”زی مان گئی۔؟“ شان نے ایک دم ہی اپنے تکیوں پر ہوتے ہوئے
 اُس کا کندھا پکڑ کر تیزی سے پوچھا۔

”لڑکی بچاری سے کون پوچھتا ہے۔“ ناصر اُداس سا بولا۔
 ”بتاؤ کیا ہوا پھر۔؟“
 ”وہ.... انہی.... نے....“

”یس کہہ دیا ہر گاہ...“ وہ بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ”مگر میں بھی دیکھتا ہے
 وہ ڈاکٹر کا بچہ کیسے آتا ہے۔ سینہ غار کر دوں گا۔ ایک دار میں۔ خود
 پھانسی چڑھ جائے گا۔ پرواہ نہیں۔ اور پھر اُس نے فیصلہ کر لیا۔
 وہ بابا جہان سے صاف صاف بات کرے گا۔ نکاح تو نہیں ہوا
 تھا ابھی۔ یہی وقت تھا دو ٹوک فیصلہ کر لیتے گا۔ دیکھ لیا تھا اُس نے
 خاموش رہ کر۔ کر لی تھی اُس نے کوشش حالات سے سمجھوتہ کرنے کی۔
 مگر۔ اُس کی خاموشی ایک ترپتی فریاد تھی۔ اُس کا سمجھوتہ ایک
 مستقل درد تھا۔ اور یہ۔ ترپ۔ یہ درد سہتے سہتے اُس کی روح بلبلاتا
 اُٹھتی تھی۔ وہ بات کرے گا۔ ضرور۔ اُس کا فیصلہ اٹل تھا۔

پہلے بابا جہان سے بات کرے گا۔ وہ نہ مانے تو سیدھا لڑکی کے یہاں
 معذرت بھجوا دے گا۔ اور پھر ادھر سے فارغ ہو کر۔ ڈاکٹر سے دو
 دو ہاتھ کرے گا۔ ”ہو نہ ہو چوزہ کہیں کا۔“ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اپنا لیوا اور

ہاتھ میں لے کر اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔

ناصر اُسے دیکھ دیکھ کر بے طرح آئی ہنسی روکنے کی کوشش میں۔ دانت
انگلی کے ناخن سے بجاتا۔ شان کی ہڑبونگ سے محفوظ ہوتا رہا۔

اور پھر رات ڈرپر۔ شان چادری کے اوپر سیخوں میں پروئے تنوں
والی اپنی پسندیدہ ڈش پر پل پڑا تو۔ پاس کھڑے کریم بابا نے سوچا۔
ناصر بیٹا ٹھیک ہی تو کہتے تھے۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بابا“

شاہان احمد ناصر کے کمرے میں ایک سرے سے دوسرے تک ٹہلتے بار
بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔ ہاتھوں کی مٹھیاں کھینچی ہوئی تھیں۔ اور چہرے سے
بے پناہ غیظ و غضب عیاں تھا۔

اور ناصر۔ اُن کی اچانک اور غیر متوقع آمد پر کی اطلاع پاتے ہی میں
میں کھانا چھوڑ چھاڑ پکٹا چلا آیا تھا۔ ”آپ۔ ماماں جان۔ آپ نے کیسے
زحمت کی۔ اندر آتے ہی اُس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”کیسے ہو بر خوردار“ وہ ٹہلتے ٹہلتے رک گئے۔ غیظ و غضب بھی قدرے
کم پڑا۔ ”ٹھیک ہوں ماماں جان۔ آپ تشریف رکھئے نا“ اُس نے

آگے بڑھ کر انہیں صوفہ پر بیٹھنے میں مدد دی۔ "آپ... آپ...؟" وہ ان کے بے وقت آنے کی وجہ پوچھنا چاہتا تھا۔

"یہ... یہ پڑھو..." جیب سے ایک خط نکال کر اُسے تھماتے ہوئے وہ مشکل بولے۔
 میں اس جگہ کسی صورت شادی نہیں کر سکتا۔ میں نے بہت کوشش کی۔ بہت سوچا کہ آپ کی بات رکھ سکوں۔ مگر اب ایسا ممکن نظر نہیں آتا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں ساری زندگی دکھی رہوں۔؟... بایا جان پلٹر۔ آپ اُس گھر میں کہلا دیں۔ ایسا ممکن نہیں۔ میں بہت مجبور ہوں۔ میں اُس لڑکی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں اُسی سے شادی کروں گا۔ کچھ اسی نوعیت کی باتیں تھیں پورے خط میں۔

"کون ہے یہ لڑکی۔؟" شاہان احمد گرج کر بولے۔ غیظ و غضب پھر لڑنے لگا تھا۔ ناصر سہم کر رہ گیا۔ "تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔" غصہ بھری نظریں ناصر کے آ رہے ہی تھیں۔

"میں معلوم کروں گا ماموں جان۔"

"گویا کہ تمہیں معلوم نہیں ہے۔" اُن کا لہجہ مشکوک تھا۔

"کچھ کہتا تو تھا۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ کون ہے۔؟"

"SEE" ہاتھ بڑھا کر انہوں نے خط ناصر سے لے کر دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ "بیٹھو۔" اُسے ہنوز کھڑا یا کر وہ قدرے مدھم پڑتے ہوئے بولے۔ اور ناصر سر جھکائے مودب طریق سے اُن کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"پڑھا خط تمہنے۔؟" اُن کے غصے کی جگہ پریشانی نے لے لی تھی۔

”جی۔“ ناصر نے کہا۔

”ہم ہتھارے پاس اس لئے آئے ہیں کہ تم آج ہی اس کے پاس جاؤ۔ اور اسے بتا دو کہ جو ہونا تھا سوچا۔ اب ہم اپنے کئے گئے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔“ ناصر نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کا سرخ چہرہ ان کے دلی جذبات کا آئینہ دار تھا۔

”اور صرف بتانا ہی نہیں سمجھانا بھی۔“ وہ کچھ سوچتے سوچتے بولے۔ ”وہ ہماری اکلوتی اولاد ہے۔ اس کی ہر خواہش کا ہم نے ہمیشہ احترام کیا ہے۔ وہ ہمیں بے حد عزیز ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی شادی ہم اپنی مرضی سے کرنا چاہتے تھے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ کم عمری اور نا تجربہ کاری کی بنا پر وہ اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ خود کے ساری زندگی خیارہ کھگئے۔ صرف اسی خیال سے ہم نے یہ ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔۔۔ کہتے کہتے وہ خاموش ہو گئے۔ ناصر نے دیکھا وہ کسی سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

”رات ہمیں اس کا یہ خط ملا۔ تمام رات ہم جاگتے رہے۔ ایک طرف اولاد کی خواہش تھی تو دوسری طرف سکینہ بیگم کے آگے بے ہمدی کا خیال۔“ انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ”ساری رات سوچ کر ہی ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شان کو وہی کرتا ہو گا۔ جو ہم چاہتے ہیں۔“

ان کے لہجے میں عزم تھا جہاں وہ ہاں دیکھ بھی تھا۔
ان کے فیصلے میں جہاں حکم تھا۔ وہاں پریشانی بھی تھی۔

”میں سمجھا دوں گا۔ ماموں جان۔“

”ہم سکیئنہ بیگم کو کیا مٹنہ دکھائیں گے۔ کیا سوچیں گی وہ ہمارے بارے میں۔ کیا وہ یہ نہیں سمجھیں گی۔ کہ ہم نے اُن کا مذاق اُڑایا ہے۔ یا پھر۔ ہمارے من میں کھوٹ تھی۔ ہم نے اُن کی دل شکنی کر کے مسلمی بیگم کا بدلہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اور پھر سکیئنہ بیگم سے نہ سہی یا سر علی کا زرین سے تو خون کا رشتہ ہے۔ شان نے کیا ہمیں اتنا ہی بے غیرت سمجھ لیا ہے۔ نہیں۔ نہیں۔ تم ابھی جاؤ اور اُس کو ہمارا فیصلہ سُنادو۔ اُس کی شادی ہوگی تو یا سر علی کی بیٹی زرین سے۔ ورنہ۔ اُس کو کہہ دو۔۔۔ کفن میں بھی ہمارا مٹنہ نہیں دیکھ پائے گا۔“ ایک بار پھر اُن کا غیظ و غضب لوٹ آیا تھا۔

”ماموں جان۔ آپ پلیر RELAX کریں۔“ ناصر اُٹھ کر اُن کے قریب آگیا۔
”میں پوری کوشش کروں گا اُسے سمجھانے کی۔“

”سمجھانے کی نہیں۔“ وہ پھر گرجے۔ ”یہ بتانے کی کہ اُس کی شادی زرین سے ہو رہی ہے۔ صرف زرین سے۔“

ابھی کچھ دیر قبل ماموں جان نے اُسے سمجھانے کو ہی تو کہا تھا۔

”جی ایسا ہی ہو گا۔“ ناصر پھر بھی سہم کر بولا۔

تبھی میرا جُوس کے گلاس لئے اندر آگیا۔ شاہان احمد پھر کسی سوچ میں پڑ گئے تھے۔ میرا ٹرے رکھ کر واپس چلا گیا تھا۔

”آپ نے فون کیا ہوتا۔ میں حاضر ہو جاتا۔“ گلاس اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے

ناصر نے کہا۔ اُسے معلوم تھا۔ ماموں جان اپنی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے اتنا وقت سال بھر میں بھی نہ نکال سکتے تھے۔

”رات کے وقت خون کر کے ہم تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتے تھے۔
 اور پھر صبح ہوتی۔ تمہیں اطلاع کرتے۔۔۔ اور تم۔۔۔ آتے۔۔۔ اتنا انتظار ہم
 کہہ نہیں سکتے تھے۔ یہ بچوں کے کھیل نہیں ہیں۔ بیٹا۔! تم ہماری ذہنی حالت کا
 اندازہ نہیں کر سکتے۔ بہت سخت جان ہیں ہم کہ ہمارا ہیمرج نہیں ہوا۔۔۔“
 ”آپ فکر نہ کریں ماموں جان۔“ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔“

”وہ راز جو ہم اُس پر خود عیاں کرنا چاہتے تھے۔ آج تم اُسے بتا دو۔
 بتا دو کہ جس لڑکی سے ہم نے اُس کی سنگنی کروائی ہے۔ وہ یا سر علی کی
 بیٹی ہے۔ اُسے بتا دو کہ اُن ماں بیٹی نے اتنے دُکھ اٹھائے ہیں۔ اتنے
 غم جھیلے ہیں کہ اب اُن میں مزید دُکھ سہنے کی تاب نہیں۔ اُن کی۔
 آنکھوں میں مدت کے بعد خوشیوں کے جلتے ہوئے دیئے ہم ٹھجا نہیں سکتے۔
 بخدا ہم میں اتنی ہمت نہیں ہے۔ بتا دو اس کو۔۔۔ سب بتا دو۔۔۔
 کہ وہ کون لوگ ہیں۔۔۔ کہہ دو اس کو کہ زرین تمہاری بہن ہے۔۔۔
 پھر۔۔۔ شان ہمارا خون ہے۔ ہمیں یقین ہے وہ ان لوگوں کو دُکھی اور
 بے عزت ہوتے نہیں دیکھ سکے گا۔“ اچانک ہی اُن کے لب دلہجے میں
 فخریہ انداز جھلک اُٹھا۔ ”اور پھر تم۔۔۔ تمہیں بھی تو وہ جان سے زیادہ
 عزیز سمجھتا ہے۔“

”ماموں جان۔ آپ فکر نہیں کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

شاہان احمد نے جوس کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

”ماما کیسی ہیں۔ ماموں جان۔“ ناھر کو پریشانی میں خیال ہی نہ رہا تھا

”ٹھیک ہے۔“ وہ جیب ٹوٹنے لگے۔ ”یہ خط دیا تھا ہمتا بے لئے۔
یاد رہی ہتھیں رہا باتوں میں۔ خط نکال کر انہوں نے اُسے کھما دیا۔
”اوہ۔“ ناصر کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

”اوکے۔ بیٹا۔ اب چلتے ہیں۔ فلائیٹ کا وقت ہو رہا ہے۔
وہ اٹھ کھڑے ہوئے تو ناصر بھی ماما کا خط ایک طرف رکھ کر
جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

ناصر نے انہیں گاڑی میں بٹھایا اور ایئر پورٹ چل دیا۔
”فورا چلنے کی کرو۔ اور شان سے بات کر کے وہیں سے ہمیں
فون کر دو۔ ہم انتظار کریں گے۔ اوکے۔ گڈ لک۔“ شاہان احمد
بولے۔ اور پھر باوقار انداز میں چلتے۔ رن وے پر کھڑے جہاز کی
طرف بڑھنے لگے۔

میں واپس پہنچ کر اُس نے بے تابی سے ماما کا خط کھولا۔
”..... زرین بی بی کا جوڑا لے کر گئی تھی۔ ساتھ ہی بڑے صاب کا
پیغام بھی تھا بیگم صاب کے لئے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ٹینہ بی بی کے لئے
زیور کا آرڈر دینے سے پہلے بیگم صاحب اور زرین خود جا کر زیور پسند
کر آئیں۔ پھر وہ ٹینہ بی بی اور زرین بی بی دونوں کے زیور کا آرڈر
خود دیں گے۔ باقی بڑے صاحب فرماتے تھے کہ ٹینہ بی بی کا جوڑا لے کر
اب کے میرے علاوہ زرین بی بی اور بیگم صاحب بھی اُن کے گھر جائیں گے۔
اب بات یہ ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے آجانا۔ بیگم صاحب فرماتی تھیں کہ

اس طرح سے تو زرین اُسی کی تھی۔ اُس کی اپنی۔ مگر وہ خود ہی اس سے
 اتنی دور چلا گیا تھا۔ کہ اُسے پانا مشکل لگ رہا تھا۔
 بابا جان نے یہ کیسا ظلم کر دیا تھا اُس کے ساتھ۔ مانا کہ اُس نے بھی بابا جان
 کو اُن کی مرضی کرنے کا اختیار کبھی بھیجا تھا۔ مگر۔ وہ کیا کرتا۔
 اور پھر کیا وہ نہ لکھتا تو بابا جان اُس کی مان لیتے؟
 "ہمتیں۔ تمہاری پسند کی لڑکی سے روکتے ہوئے اہمیں افسوس ہوا
 تھا۔ اُسے ایک بار پھر ناصر کے الفاظ یاد آ گئے۔ اور ناصر کی اسی بات کو
 سنے کا سہارا سمجھ کر ابھی کل ہی اُس نے ناظم کے ہاتھ ایک بار اور بابا جان کو
 اپنی بھجوری لکھ بھیجی تھی۔ پتہ نہیں خط پا کر اُن کا کیا ردِ عمل ہو گا۔
 ناظم بھی ابھی تک واپس نہ لوٹا تھا۔

"ٹھک۔ ٹھک۔ ٹھک۔ دروازے پر دستک ہوئی۔
 "ناصر" اُس کے دل نے کہا۔ اُس کے دستک دینے کے انداز پر بھی وہ
 دھوکہ کھا سکتا تھا۔

"COME IN" ہاتھ بڑھا کر لیمپ آنا کرتے ہوئے بولا۔
 "ہیلو شان" اندر آتے ہی وہ بستر میں ہی اُس سے جا پٹا۔
 "ہیلو" شان نے اُسے ماتھے پر بوسہ دیا۔
 "کیسے ہو یار۔" وہ اُس کے بستر میں گھس گیا۔
 "فائین" اُس پر کبیل ٹھیک کرتے ہوئے وہ بستر سے نکل آیا۔
 کرے کی باقی بتیاں ابھی جلا دیں۔

”تم سناؤ اتنا رات کو کیسا خیال آیا۔“ سلینگ گاؤن پہنتے ہوئے
اُس نے پوچھا۔ اُس کی آمد پر وہ بے حد خوش لگ رہا تھا۔

”بس بیٹا کچھ نہ پوچھو۔“ بوٹ کھول کر ادھر ادھر لڑھکاتا۔ وہ اچھی
طرح بستر میں گھس گیا۔ شان دھیرے سے سُکرا دیا۔

”جی۔ ناظم نافر کا بیگ لے آ گیا۔“ ناظم کھانا۔“ اُسے دیکھتے ہی نافر بولا۔
”ادھر صاحب۔؟“ ناظم نے پوچھنا مناسب سمجھا۔

موسم میں فرق آچلا تھا۔ وہ چھپنے والی سردی نہ رہی تھی۔ شدت کی
سردی کے دنوں کے علاوہ وہ شان کمرے میں کھانا پسند نہیں کرتا تھا۔
”اور کہاں۔ آدھی رات کو میں کھانا کھانے ڈرائنگ روم میں جاؤں گا۔
پکایا کیا ہے۔؟“ نافر نے کہا۔

”نش ہے سرکار۔ ابھی تیار کر داتا ہوں۔“ سباتی جو آپ حکم کریں۔
”تم بتا دو نا۔ جو کھانا ہے۔“ شان اُس کے سامنے ہونے پر بیٹھتے
ہوئے بولا۔ اُسے معلوم تھا کہ نافر کو مچھلی خاص پسند نہ تھی۔

”بس اچھی سی کوئی چیز بنا دو۔ مزیدار اور کوئی بھی۔“
”بہتر صاحب!“ ناظم چل دیا۔

”سناؤ اب کیسے ہو۔؟“ نافر کرڈٹ اُس کی طرف لے کر کہنی کے بل
لیٹ گیا۔

”گزر رہا ہے۔ تم بتاؤ۔ اتنا دیر سے کیوں پہنچا۔“
”بس یونہی جی میں آیا۔ اپنے یار کو مل آؤں۔ کل فرائے ڈس ہے نا۔ چھٹی ہے۔“

”یہ تو بہت اچھا کیا۔ یار بھی تم کو بہت یاد کر رہا تھا۔“

”مگر تھک بہت گیا ہوں۔“ ناھر ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے بولا۔

”ظاہر ہے۔ ڈیوٹی کے بعد سیدھا چلا ہوگا۔“

”ارے یار کیا بتاؤں۔“ اُسے اچانک سنہی آگئی۔ سر تکیوں میں دیدیا۔

”خیریت ہے۔ سنہتا کیوں ہے۔؟“

”اب سنہی پر بھی ٹیکس لگا لو۔ تم باپ بیٹے بھی عجیب مخلوق ہو۔“

”یار تم واقعی LUCKY لاکھی ہو۔“ اُسے ہشاش بشاش دیکھ کر شان

بھی آہستہ سے ہنس دیا۔

”اب لگا لو۔ نظر مجھے۔“ تیکے مسہری کی پشت سے لگاتے ہوئے وہ

سیدھا سر بلچھا۔

”اچھا چھوڑو۔ ٹھینہ کھابی کا کیا حال چال ہے۔؟“

”حال تو ٹھیک ہے۔ چال البتہ...“ کپٹی کھاتے ہوئے ناھر نے کچھ ایسی

شکل بنائی کہ شان بھی روز سے ہنس دیا۔ ”تم بھی کیا چیز ہے۔“

”بہت کام کی چیز ہوں۔“

”وہ تو ہے۔“ شان پھر سنجیدہ ہو گیا۔

”شان۔“ ناھر نے کہا۔ اور شان نے خوب صورت آنکھیں اس پر جمادیں۔

کتنا گھنا حال بنا ہوا تھا وہاں۔ مایوسیوں کا۔ ناامیدیوں کا۔ دکھوں کا۔

پریشانیوں کا۔

”شان۔“ پرکشش گری کر سٹلر اب بھی ناھر پر جھے ہوئے تھے۔

”شان۔“ ناصر نے پھر پکارا۔

”یس۔“ اسٹون گرے کر سٹن پورے دا ہو گئے۔

بار بار ناصر کا پکارنا بھی اُسے اُس کی شرارت کا کوئی انداز لگا۔

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ اور۔ ناصر کو شان پر ترس آ گیا۔

کتنے خوبصورت دن تھے کچھ عرصہ قبل کے۔ شان اسی خوبصورتی سے
ہنس دیا کرتا تھا اُس کی ادٹ پٹانگ باتوں پر۔

مخصوص ہنسی تھی۔ اُس کی۔ مدھر۔ دل موہ لینے والی۔ اب تو وہ

اُس کی ہنسی، اُس کی مسکراہٹوں کو ترس گیا تھا۔ اُس نے ایک گہری سانس لی۔

”غم جاناں بھی کیا چیز ہے۔“

شان اب بھی اُسے دیکھ رہا تھا۔ مگر چہرے پر زردی کھنڈائی تھی۔

”کلام کیسے ہو رہا ہے۔“ پچھتاتے ہوئے ناصر نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”بس ہو رہا ہے۔“ شان مجھ گیا تھا۔ ناصر اٹھنے لگا۔

”کیوں۔؟“ شان نے معلوم کیا۔

”منہ ہاتھ دھوؤں ذرا۔“ ناصر نے کہا۔

”SURE“ شان مسکرا دیا۔ اُداسی سے۔

آتے ہی تو وہ بستر میں گھس گیا تھا۔ اب چلا تھا منہ ہاتھ دھونے۔ کیا

لاپرواہ قسم کا انسان تھا۔ تبھی کریم بابا کھانے کی ٹرے لئے اندر آ گئے۔

صوفے کے قریب رکھی مینر پر برتن رکھ دئے۔ چکن روٹ تھا۔

فرانی مچھلی تھی۔ سیخ کباب تھے۔ اُمیٹ تھا۔ شان ہوسے سے مسکرا دیا۔

آملیٹ کے بغیر ناصر کو کھانا ادا ہو راکھا تھا۔ بھی جانتے تھے۔ اور۔
وہی ہوا۔ واپس آکر۔ ناصر سب سے پہلے آملیٹ پر ٹوٹ پڑا۔
کھانے کے بعد دونوں نے کافی پی۔ اور کریم بابا برتن سمیٹ کر لے گئے۔
”اوس کے شان“ ناصر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب سوتا ہوں جا کر ایک بج چکا
ہے۔“ اُس نے گھڑی پر نظر ڈال کر کہا۔

”ہاں سونا چاہئے“ شان بھی اٹھا۔

”صبح مجھے بھی سویرے جگا دینا۔ تھوڑی گپ شپ کریں گے۔ پھر....
پھر.... کچھ ضروری کام کروں گا۔ اور واپس ڈیوٹی پر بھی جاؤں گا۔“
”کیا ضروری کام ہے۔“ اُس کے ”پھر.... پھر“ پر اٹک جانے پر شان
مسکرا کر بولا۔

”اپنی سسرال جانا ہے ذرا۔“ سر سے کیپ چہرے پر لا کر وہ آہستہ
سے بولا۔

”ادہ“ شان پھر ہنس دیا۔ ”ٹھیک ہے جگادوں گا۔“

”گڈ نائٹ“ ناصر دروازے سے نکلے نکلے بولا۔

”گڈ نائٹ“ مسکراتے ہوئے شان نے دروازہ بند کر دیا۔ اور تھکا۔

تھکا بستر پر پڑ رہا۔ اب کے اُسے جلدی ہی نیند آگئی۔

صبح جب غلات پھر سویرے ہی سویرے آنکھ کھل گئی۔

کریم بابا بیڈ ٹی ٹیئے منتظر تھے۔ ”گڈ مازنگ بابا۔“

”صبح بخیر بیٹا“ چھوٹی سی خوبصورت ٹیڑھی انہوں نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔

"بابا ناصر کو بھی جگادیں۔ اُس کا واسطے بھی چائے ادھر لائیں۔"
 "اچھا سرکار۔ بابا چل دیئے۔"

وہ اٹھا۔ منہ ہاتھ دھویا سکرے میں واپس آیا۔ ناصر اس کے بستر
 میں گھسا بیٹھا۔ اُس کی چائے پینے میں مصروف تھا۔

"گڈ مارننگ۔" شان مسکراتے ہوئے قریب چلا آیا۔

"گڈ مارننگ۔" ناصر نے ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔ اور تھلی بابا۔ ناصر
 کو بھی چائے لے آئے۔ ناصر کو شان کے کپ میں پیتے دیکھ کر وہ دوسری
 پیالی میں شان کے لئے بنانے لگے۔

"تھینک یو بابا۔ آپ چائے۔ میں خود بنائے گا۔"

اور بابا مکرے سے باہر نکل گئے۔

شان کُری قریب کھینچ کر ناصر کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ "رات کیسا گزرا؟"

پیالی میں چائے اندھیلے ہوئے اُس نے پوچھا۔

"فرسٹ کلاس۔ تم سناؤ کتنی کروٹیں بدلیں۔"

اور شان ہولے سے مسکرا دیا۔

"کل ماماں جان آئے تھے۔" ناصر اچانک بول پڑا۔ رات اُس نے

بتانا مناسب نہ سمجھا تھا۔

"تمہارا پاس۔؟" شان بے یقینی سے پوچھنے لگا۔

"ہاں۔" ناصر نے کہا۔

"کیوں؟" وہ بے چینی سے بولا۔

”وہی ہمتارے خط کے بارے میں۔ تم نے انہیں لکھا تھا نا کچھ شادی نہ کرنے کے بارے میں۔“

”یس۔ کیا بولتا تھا۔؟“ وہ بے تابی سے بولا۔

”یہی کہ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب وہ اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتے۔“

”سچ کہتا ہے۔؟“

”بالکل سچ۔ یہ بھی کہتے تھے کہ تم نے انہیں اتنا بے غیرت کیسے سمجھ لیا ہے

کہ وہ اُس گھر میں انکار بھجوا کر بے عہدی کریں گے۔“ ہاتھ میں پکڑی پیالی شان نے واپس میز پر رکھ دی۔

”چلے تو نہ چھوڑ دیا۔ رات بھی تمہیں اس لئے نہیں بتایا تھا کہ تم سونا

بھی چھوڑ دو گے۔“ پیالی اُس نے واپس اُسے تھما دی۔

”تم سیریس ہے۔ سچ کہتا ہے۔“ چلنے کیوں یہ سب بھی شان کو ناھر کا

کوئی ڈرامہ لگا رہا تھا۔

”میں واقعی سیریس ہوں۔ ماماں جاننا یہ بھی کہتے تھے کہ اگر تم نے اُن کی بات

نہ مانی تو کفن میں بھی اپنا منہ نہیں دیکھنے دیں گے۔

شان گم صہم۔ اُس کا منہ تنگ رہا تھا۔

”ویسے میں اُن کو سمجھا دوں گا۔“ تم فکر نہ کرو۔ وہ دوسری پیالی بھرنے

لگا۔ شان نے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔

ناھر نے دیکھا اُس کی نظروں میں مایوسیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

”یار یہ تو اُن کا پیغام تھا۔ جو میں نے تمہیں دیا۔ اب آگے کیا ہوتا ہے۔ یہ تو

اللہ ہی بہتر جانتا ہے نا۔ وہ اطمینان سے بول رہا تھا۔

شان اب بھی اُسے دیکھ رہا تھا۔

”کچھ نہ کچھ تو بندوبست ہو ہی جائے گا۔“ اُس نے کپ منہ سے لگا لیا۔

”بندوبست کیا ہو گا۔ بس میں لڑکی کے گھر اٹھا کر تلے ہے۔“

”پھر بھی تمہیں کفن میں منہ نہیں دکھائیں گے۔“ اُس نے ایک لمبا

گھونٹ بھرا۔

”تو ہم کیا کرے پھر۔“ شان اُس کی بے نیازی پر جھنجھلا اٹھا۔

”کچھ سوچیں گے۔ فی الحال تم خاموش رہو۔“

”یعنی...“ اُس نے پوچھا۔

”سردست وہیں شادی کر لو۔ جہاں مائوں جان کہتے ہیں۔“

”کیا مطلب۔؟“

”ہاں۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔“

”مذاق چھوڑو یا ر۔“

”مذاق کون کمبخت کر تلے۔ تم شادی کر تو لو۔“

”پھر۔ پھر کیا ہو گا۔؟“

”پھر دوسری شادی کر لو۔“

”یعنی تمہارا مطلب ہے...“

”ہاں۔ پھر دل چاہے تو تیسری کر لو۔ بلکہ کرتے جاؤ۔...“

”ناصر۔“ کپ میز پر رکھتے ہوئے شان چلا یا۔

"RELAX, RELAX" اُس نے آخری گھونٹ کر پیالی میز پر رکھ دی۔ "مجھے سوچنے دو۔ کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لوں گا۔"

"مجھے تمہارا یقین نہیں ہے۔" وہ مدھم پرٹ گیا تھا۔ اور بے یقینی کے عالم میں ناصر کو دیکھ رہا تھا۔ اور ناصر دل کھول کر ہنس دیا۔

"اچھا سر۔ اب اجازت دیں پھر حاضر ہوں گے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"No۔ پہلے مجھ کو ٹھیک کٹیک بات بتاؤ۔" شان نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر پھر وہیں بٹھا دیا۔

"یا اللہ! میں کہاں بھنس گیا۔ ناصر نے سرد و نوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"بتاؤ۔" اُس نے پھر کہا۔

"کیا بتاؤں یا۔"

"بابا جان آیا تھا تمہارے پاس۔؟"

"ہاں۔" ناصر نے کہا۔

"کیا کیا بولا تھا۔؟"

"بتاؤ دیا سب۔"

"کیا؟" شان بولا۔

"یہی کہ تمہاری شادی وہیں ہوگی۔ جہاں وہ چاہیں گے۔ یعنی جہاں وہ تمہاری شگتی کر دے چکے ہیں۔ یہ ان کا آخری فیصلہ ہے۔"

"ہوں۔" شان کو جیسے یقین آ ہی گیا۔

"مجھے اب ذرا تم کو سمجھا کر بھیجا دیا۔"

”SEE, ا“ شان کی آنکھوں میں گہری مایوسی تھی۔

”مگر اب۔ تمہاری حالت دیکھ کر ہم نے سوچا ہے کہ جا کر انہیں ہی سمجھانا پڑے گا۔“ نانا صر نے کہا۔

”پلیز نانا۔ بابا جان کو سمجھاؤ۔ ہم یہ شادی واقعی نہیں کر سکتا۔“
 ”اوکے ابھی سمجھاتا ہوں۔“ اور آگے بڑھ کر اُس نے ٹیلیفون پر
 شاہان احمد کے نمبر ڈائل کر دیے۔ بیل جانے لگی۔ چند لمحے رسیور کان سے
 دگائے وہ منتظر رہا۔ اور پھر سلسلہ مل گیا۔

”جی ماموں جان۔ میں نے سمجھا دیا ہے۔ جی۔ جی۔ بالکل۔ وہی
 کرے گا جو آپ کہیں گے۔ DON'T WORRY۔ بالکل آپ بے فکر ہو کر
 تیاری کریں۔ جی ہاں۔ جی۔ اوکے۔ تھینک یو۔ خدا حافظ۔“
 ”YOU BAS.....“ شان دھاڑا۔

”یار میں کیا کرتا۔ ماموں جان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔“ کل تم
 دیکھتے تو اندازہ کرتے۔ وہ.....“

”میرا حالت ٹھیک ہے۔؟ میرا اندازہ کوئی کرتا ہے۔؟“
 ”شان سمجھنے کی کوشش کرو۔ انہوں نے تمہارے لئے بہت تکلفیں
 اٹھائی ہیں۔ بڑی قربانیاں دی ہیں۔ ڈھیر سارے خواب دیکھے ہیں تمہاری
 خوشیوں کے.....“

”میرا خوشی۔؟ ہو نہ۔“ اُس نے سر جھٹکا۔

”ہاں تمہاری خوشیوں کے۔ اس وقت تمہیں یہ سب غلط لگ رہا ہے۔“

مگر ٹھنڈے دل سے سوچو گے تو سمجھ جاؤ گے کہ وہ غلطی پر نہیں ہیں۔

”میں ٹھنڈے دل سے سوچ کر چکا ہے۔“

”ایک بار اور سوچ لو.... یہ نہ ہو کہ کل کو اس گھڑی کو بچھاؤ۔“

شان نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ اس کا مطلب ہے۔ تم بھی وہی

چاہتا ہے۔ جو بابا جان چاہتا ہے۔“

”ہوں۔ میرا خیال ہے وہ حق پر ہیں۔“

”اوہ۔“ اُس نے ہنسیاتی انداز میں کہا۔

ناصر نے اُسے بغور دیکھا۔ وہ کس قدر بے بس۔ پریشان لگ رہا تھا۔

”ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“

”کہ میں ماموں جان کی سائیڈ لوں گا۔“ شان اُسے دیکھنے لگا۔

”مجھ کو یقین تھا کہ تم میرا کام کر دے گا۔“

”میں.... مجھ سے اُن کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ شان یقین کرو۔“

”میں....“ ناصر نے بے بسی ظاہر کی۔

”بس میں سمجھ گیا۔“

”شان پلینر۔! مجھے غلط مت سمجھو۔ میں مجبور ہو گیا ہوں۔“ شان نے

اُس کی طرف دیکھا۔ شان کی نظروں میں طنز تھا۔

”اب چلوں۔ دیر ہو رہی ہے۔“ ناصر دروازے سے نکلا۔ تو شان بھی

پیچھے چلا آیا۔ ایک نظر شان پر ڈالنا ناصر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ”گڈ بائے۔“ شان

کا ہجہ بھاری تھا ”گڈ لک ایٹڈ گڈ بائے۔“ ناصر سنس دیا۔ اور گاڑی چل پڑی۔

آج آفس میں بہت کام تھا۔ وہ سائٹ پر بھی رہیں جا رکھا تھا۔ صبح سے وہیں بیٹھا۔ کئی کاغذات، کئی فائلوں سے منٹ چکا تھا۔ ریمارکس لکھتے لکھتے۔ دستخط کرتے کرتے اُس کی انگلیاں تھک گئی تھیں۔

بین ایک طرف رکھ کر۔ مٹھی بند اور کھولنے لگا۔ تواحساں ہوا۔ ذہن اس سے کہیں زیادہ۔ کئی گنا تھکا ہوا۔ اور لامتناہی دزنوں تلے دبا ہوا تھا۔ نڈھال ہو کر اُس نے سر کر سی کی پشت سے ٹیک آنکھیں موند لیں۔
 ”بابا جان“ ایک خاموش کراہ اُس کے لبوں پر مچلی۔
 ”کس امتحان میں ڈال ہے آپ نے بابا جان۔؟“

ناصر کو گئے آج تیسرا دن تھا۔ اس دوران وہ برابر سوچتا رہا ناصر اُسے بہر حال بے قصور نظر آیا۔

بابا جان!۔ وہ بھی حق پر تھے۔

قصور وار۔! شاید وہ خود تھا۔! غرارادی طور پر وہ ہاتھ سے مارتا تھا سہلانے لگا۔ پھر آنکھیں کھول دیں۔ دوبارہ میسر پر جھک آیا۔
 ابھی تھوڑی دیر قبل اُس کا پی سائے ڈاک لایا تھا۔ کام میں مصروف

ہونے کی وجہ سے وہ دیکھ نہ سکا تھا۔ دُھیر سارے لفافے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر اُس نے قریب کھینچ لئے۔ ایک ایک کر کے دیکھنے لگا۔ کئی کاروباری تھے اور چند غیر کاروباری خطوط تھے۔ دعوت نامے تھے۔ سب نمٹ کر وہ دعوت نامے دیکھنے لگا۔

ایک تو ٹھیکیدار جانِ عالم کی بیٹی کی شادی کا تھا۔ ایک آرچی کلب کی طرف سے تھا۔ ایک سیٹھ حامد علی کے یہاں سے ڈنر کا۔ ایک آرٹ گیلری والوں کی طرف سے ایک فنکشن پر بحیثیت گیٹ آف آئر۔ سب ایک طرف رکھ کر۔ اُس نے ایک خالی خالی نظر اُن پر ڈالی۔ جانِ عالم صاحب کے یہاں بابا جان شاید جاسکیں۔ پچھلی یار اُن کے بیٹے کی شادی پر کبھی نہ جاسکے تھے۔

آرچی کلب۔ وہ معذرت بھج دے گا۔ سیٹھ حامد علی۔ ایک پل کو ٹینا اُس کے تصور میں اُبھری۔ ان انویٹیشنز کا سبب زیادہ تر وہی تھی۔ ایک بے جان سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر اُبھری۔ کیا کرے گا۔ وہاں جا کر۔ آرٹ گیلری۔ وہاں جانا اُس نے ایک قسم کی ذمہ داری سمجھا۔ کارڈ اٹھایا۔ تاریخ دیکھی۔ چند دن تھے ابھی۔ بیل دیا لی۔ پی لے آیا۔ فنکشن کی تاریخ نوٹ کر والی۔ گھڑی دیکھی۔ تین بج رہے تھے۔ اُٹھ کر وہ آفس سے باہر نکل آیا۔

فلکشن ختم ہو چکا تھا کافی مصروفیت گذرا تھا۔

کئی ہمارے میں ناصر بھی تھا۔ اور اس کے ساتھ زرین بھی۔

وہ جانے کے اُبالے سے باہر نکلا تھا۔ تو ناصر زرین کو ایک طرف
کھڑا کر کے اُسے ملنے آیا تھا۔ اُس سمجھے اُسے اپنا آپ کتنا غیر لگا تھا۔
بیانے کیوں۔ کوئی حق نہ پاتے ہوئے بھی۔

اُس نے نظریں اٹھا کر فاصلے پر کھڑی زرین کو دیکھا تھا۔

ناصر جلدی میں تھا۔ شام ہونے کو تھی اور زرین کو چھوڑ کر اُس نے
واپس بھی جانا تھا۔ دو چار باتیں کر کے وہ چل دیا۔

پتہ نہیں کیوں۔ وہ دو قدم ساتھ کھڑکشی نہ دے سکا۔ وہیں کھڑا
اُسے زرین کی جانب بڑھتے دیکھتا رہا۔

اور پھر۔ اُسے اپنا آپ پہلے سے کہیں بڑھ کر۔ ٹوٹا ہوا۔ بکھرا ہوا۔

رینہ رینہ۔ چرچور لگا۔ اُس نے رخ واپس پھیر لیا۔

"ہیلو ذیشان!" ٹینا اُس کی جانب بڑھ رہی تھی۔

وہی شوخ رنگوں میں لپٹی لپٹا لی۔

”ہیلو“ وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

”آپ ڈنر پر نہیں آئے“ ٹینا نے کہا۔

”ہم نے فون کر کے سیٹھ صاحب کو بتا دیا تھا کہ ہم نہیں آ سکتا۔“

وہ معذرت کے لہجے میں بولا۔

”I KNOW THAT“۔ لیکن پھر بھی آپ کو آنا چاہئے تھا۔“

وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

”I AM SORRY, I WAS REALLY VERY BUSY“

وہ متانت سے بولا۔

”اور اس وقت۔؟“ بیبا کی کے ساتھ ساتھ اُس کی آنکھوں میں التجا تھی۔

”انٹرکون میں ڈنرے گا۔“ اس کے بعد گاؤں چلے گا۔“

”اوہ۔ ونڈرفل۔ پھر تو ہم بھی ساتھ دیں گے۔“

”AS YOU WISH“ وہ کوئی بہانہ نہ کر سکا۔

”آپ جلیے۔ I WOULD GET RID OF THAT CHAP۔“

وہ ایک آنکھ میچ کر بولی۔

”ایکسکیوز می“ وہ لوگ میرا انتظار کر رہا ہے۔ ڈنر پر ملاقات ہو گا۔“

اُسے فاصلے پر کھڑے اُس کے منتظر آرٹ گیلری کے عملے کا خیال آیا۔

”OH I SEE“ ٹینا بولی۔ اور واپس مڑ کر اپنے بوسے فرینڈ سے

جاملی۔ غیر ارادی طور پر شان کی نظریں اس طرف اٹھیں۔

ایک پھیکا سا بستم لبوں پر ابھرا۔

اور نپے تلے قدم لیتا۔ وہ عملے سے جا ملا۔

زرین اور ناصر کو نے دالی میز پر بیٹھے تھے۔ ناصر کھانے کا آرڈر دے چکا تھا۔ مگر بے راہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

ٹیبیل پیچھے بجاتا وہ بڑی بے تابی سے کھانے کا منتظر تھا۔

معاذہ چونکا۔ شان اندر داخل ہوا تھا۔

ایک پل کو اس کے دل میں آیا۔ اُسے وہیں بلالے۔ مگر پھر زرین کا

خیال آ گیا۔ عجیب سے پوزیشن ہو جاتی تھی دونوں کی۔ طرف
خاموشی سے بیٹھا دیکھتا رہا۔ زرین کی نظر میں بھی اُس کی آنکھ گئیں۔

شان وقار سے چلتا ایک ٹیبیل کی طرف بڑھا۔ ناصر اور زرین کی

نظر میں نے تعاقب کیا۔

ناصر چونکا۔ وہاں پہلے سے ٹینا حامد علی بیٹھی تھی۔

”میں پورے پندرہ منٹ سے ویٹ کر رہی ہوں ڈیر“

ناصر نے ایک نظر زرین کو دیکھا۔ اور زرین کا دل بیٹھ سا گیا۔

ابھی کچھ دیر پہلے آرٹ گیلری میں بھی جب ناصر شان سے رخصت ہو کر اُس کی طرف بڑھا تھا۔ تو ٹینا شان سے آکر علی تھی۔

تب اُس نے اُسے صرف اتفاق سمجھا تھا۔ ناصر ہنس دیا۔

”یہ ٹینا حامد علی ہے“ زرین کو بخوردیکھتے ہوئے وہ گویا ہوا۔

”میں جانتی ہوں اسے۔“ زرین کا چہرہ تاریک سایوں کی پیٹ میں تھا۔

بیر آکر کھانا لگانے لگا۔

پھر لمحوں میں ہی خالی ٹرے لئے واپس چل دیا۔

”ارے رہنے بھی دو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ناصر مزید بولا۔

”کیا ٹھیک ہو جائے گا۔؟“ زرین قدرے سنبھل کر بولی۔

”یہی۔ ٹینا حامد علی سے میل جول۔“ اُس نے چادری اپنی پیٹ میں

ڈالے ”شادی کے بعد خود ہی ختم ہو جائے گا سب“ وہ بہت اطمینان

سے بول رہا تھا۔

”کیا مطلب۔؟“ زرین کے شہرے کو تقویت ملی۔

”تمہیں کچھ معلوم نہیں۔؟“ چچ منہ کی طرف لے جاتے لے جاتے وہ

ہاتھ روک کر اُسے دیکھنے لگا۔

”کیا۔؟“ زرین نے حیرت سے پوچھا۔

”اچھا چھوڑو۔ کھانا کھا لو۔ پھر بتاؤں گا۔“

زرین زیادہ تر پوچھ سکی۔ چپ چاپ کھانا نکلنے لگی۔ تھوڑا سا

کھایا بھی۔ مگر ذہن و دل میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

”چلے ناصر بھائی“ ناصر کے کھانا ختم کرتے ہی وہ بولی۔

ناصر نے بل ادا کیا۔ اور دونوں خاموشی سے باہر نکل آئے۔

”ٹینا حامد علی کے ساتھ اذیر چل رہا ہے آج کل جناب کا۔“

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی ناصر بولا۔

زرین کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

”ماموں جان کو لکھ بھیجا ہے کہ وہ سنگی کا پابند نہیں رہ سکتا۔ سنگی
 ترطادی جائے۔“ زرین کو اچانک اپنی بے پناہ توہین کا احساس ہوا۔
 ”ماما آئی تھیں کچھ دنوں انی کے پاس۔؟“ وہ سڑک نظریں جمائے
 پھر بولا۔ ”ہاں۔“ زرین نے جواب دیا۔

”انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔؟“

”نہیں۔!“ زرین بولی۔

”بے چاری کہہ نہ پائی ہوں گی۔“ ناصر نے کہا۔

زرین کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔

”تم اتنی سے کوئی ذکر نہ کرنا۔ میں خود سنبھالوں گا سب۔“

”کیا سنبھال لیں گے۔؟“ اُس کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

”شان کو سمجھاؤں گا۔“ ناصر اُداس سا بولا۔

”کیا سمجھائیں گے؟“ طنز کے ساتھ ساتھ لہجے میں تلخی گھل گئی تھی۔

سنبھل کر قدرے بیٹھتے ہوئے وہ ناصر کی طرف دیکھنے لگی۔

”یہی کہ پورے خاندان کی عزت کا سوال... ہے...“

”ناصر بھائی۔ آپ ایک لفظ بھی نہیں بولیں گے۔ وہ سختی سے بولی۔

”پھر۔ کیا تماشہ دیکھوں گا۔“

”سنگی توڑنا چاہتا ہے نا۔“ ناصر رخ موڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔

”تو یہ لیجئے۔“ اُس نے سنگی کی انگوٹھی اُتار کر اُسے تھما دی۔ ”میں

زبردستی کی قائل نہیں ہوں۔“ ناصر نے آنکھیں پچائیں۔ انگوٹھی جیب میں

ڈالی۔ اور خوبصورت سی دھون گنگنا تا سامنے دیکھنے لگا۔

زرین نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ ہر بات۔ ہر موقع پر راضی خوشی یہی تو ناصر کی خوبی تھی۔ گہری سانس لے کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”ہاں۔ تو تم کہہ رہی تھیں کہ ہماری شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ماموں جان زیور کا۔۔۔“

”ہاں آپ کے ماموں جان زیور کا آرڈر دیں گے۔ پسند تو آج ہم نے کر ہی لئے ہیں“ لہجے کی تلخی ہنور برقرار تھی۔

”اور باقی کی شوپنگ ٹیمینہ کو ساتھ لے کر کر دو گی۔“

”جی نہیں۔ وہ کہتی تھیں کہ وہ میری ادا داتی کی پسند کی ہونی چاہئے۔“ وہ اب بھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

”سب کتنے اچھے ہیں۔ ہمیں ادا داتی کو کتنا چاہتے ہیں۔“

زرین رُخ پھیر کر ناصر کو دیکھنے لگی۔

”یہ شان کا بچہ بھی۔۔۔۔“ ناصر بڑبڑایا۔

”ناصر بھائی۔ آج یہ نام آپ میرے سامنے آخری بار لے رہے ہیں۔ آئندہ میں کسی قسم کا ذکر سننا پسند نہیں کر دوں گی۔“

”اوکے۔ اوکے۔ میں جلد ہی یہ انگوٹھی اُس کو پہنچا دوں گا۔ آگے وہ جلنے۔“

”اُس کا کام۔ اور تم اتنی سے کسی قسم کا ذکر نہ کرنا۔ میں سب ٹھیک کروں گا۔“

”ٹھیک ہے“ اُس نے کہا۔ مگر رات کو۔ وہ سونے کے لئے بستر پر

گئی۔ تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی

لٹ گیا تھا میرا۔ بس گیا ماموں جان کے پاس بیدھا کہ بیٹے کی زندگی چاہتے
ہیں تو یہ سنگنی ختم کر دیں۔ رہ گئی آپ کی بے عہدی کی بات۔ تو وہ آپ
کہیں اور بھی عہد کر سکتے ہیں۔ بیٹے کی زندگی۔ وہ بھی اکلوتے بیٹے کی۔ تو
واپس نہیں آ سکتی نا۔ اُس نے دو مال نکال کر فرنی آنسو پونچھے۔

”بس کرو FOR GOD SAKE“ شان کو ہنسی آگئی۔ ”پتہ نہیں اب

یہ سچ بھی ہے یا ڈرامہ کر رہا ہے۔“

”ڈرامے تو بہت کر لئے۔ اب تو یہ کر لی ہے۔ یہ بالکل سچ ہے۔“

”اچھا پورا بات تو سناؤ۔“

”پوری بات سنائی ہے۔ میں ہر کا ٹھیک اور اختصار سے کرتا ہوں۔

پہلے بیدھا گیا ماموں جان کے پاس۔ ہتھارا حالت زار کا نقشہ کھینچا۔ رو

پڑے سن کر۔۔۔۔۔“

شان بے اختیار قہقہہ لگا اٹھا۔

ناصر نے بھی قہقہہ لگایا۔ ”اُس کے بعد رکا نہیں۔ بھاگا بھاگا گیا۔ اور

لڑکی کو وہ پٹی پڑھائی۔ وہ پٹی پڑھائی۔۔۔۔۔“

”پٹی باندھا۔ پٹی پڑھائی نہ۔“ شان کا انداز فخر یہ تھا۔

ناصر نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ پھر ایک گہری سانس لی۔

”ہاں تو میرا مطلب ہے۔ میں نے اُسے سمجھایا۔ فون پر کہ۔ شان اس

سنگنی سے خوش نہیں ہے۔ اور ایک عقلمند اور تعلیم یافتہ لڑکی ہو کر اُسے

شان پر زبردستی مسلط نہیں ہونا چاہئے۔ بس پھر کیا تھا۔ اگلے ہی دن انگوٹھی

ماموں جان کے پاس پہنچ چکی تھی۔ انھوں نے مجھے فون کر کے بلایا۔ انگوٹھی تھائی۔
 اور بولے کہ شکریہ ہے۔ میرا بیٹا جان سے نہیں گیا۔
 ”سچ کہتے ہو۔“

”ہمہماری قسم۔ اُس نے انگلی شان کی ناک پر دھری۔
 شان نے ہاتھ مارا۔ تو لڑکھڑا کرناھر اُس سے جا پٹا۔
 ”ایکڑ ہے پورا۔“ شان نے اُس کا سر اوپر اٹھایا۔ ”یہ سب سچ بھی کہا
 ہے۔ اتنی آسانی سے یہ سب ہو جاتا۔ اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔
 ”یار سچ ہے نا۔ اگر نہیں مانتے تو دیدوانگوٹھی۔ واپس کر آؤں گا۔
 لڑکی کو۔۔۔“

”نہیں۔“ شان نے کہا۔

”اچھا اس طرح یقین نہیں آتا۔ تو دیکھ تو لیہ انگوٹھی۔ ممانی جان
 مرحومہ کی ہے یا نہیں۔ یاد ہے ایک بار سیف میں چیزیں رکھتے ہوئے ماملے
 ماموں جان کی موجودگی میں ہمیں یہ انگوٹھی دکھاتے ہوئے کہا تھا۔ نہ ممانی
 جان کی یہ انگوٹھی شان کی دہن کے لئے بڑے صاحب نے رکھی ہے۔

اور شان نے مٹھی کھول کر ایک نظر انگوٹھی کو دیکھا۔ کچھ کچھ اُسے بات
 میں صداقت نظر آئی۔ ”تو اس کا مطلب ہے۔ اب ہم آزاد ہے۔“

”بالکل۔“ ناصر نے کہا۔ شان پھر انگوٹھی دیکھنے لگا۔

چہرہ دلی مسرت کا آئینہ دار تھا۔ ”تو اب باقی کا کام بھی کر دے نا۔“
 ”کوئی نا۔؟“ ناھر نے شرارت سے پوچھا۔

”یہ اُس کو پہتا دو لے جا کر۔“ وہ معصومیت سے بولا۔
 ”کس کو۔“

”زی کو۔“

”تمہیں شاید یاد نہیں رہا۔ اُس کی بھی بات پکی ہو چکی ہے۔“
 ”کیا۔ اوہ۔ وہ ڈاکٹر کا بچہ کے ساتھ۔“
 ”ہاں۔“

”وہ کیا پتیر ہے۔“

”I DON'T KNOW۔ بس اب اپنے گاؤں جاؤں گا۔ میں نے

اتنا ہی کہنا تھا۔“

”تھوڑا ٹھہرو۔ ہم بھی جانے والا تھا۔“ وہ کپڑے بدلنے ڈرلنگ روم
 کی طرف بڑھا۔

”میں تو اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔ پٹواری کو وقت دیلے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں بھی چلا جائے گا ساتھ۔ پھر داپسی پردات بابا جان کے پاس
 آجائے گا دونوں۔ بابا جان گاؤں میں ہے۔“
 ”ٹھیک ہے۔“

”تم اپنی دیر میں ان کو رنگ کر دو۔ ہم دونوں رات کو پہنچے گا۔“
 ”اچھا جلدی تیار ہو جاؤ۔ آگے بڑھتے ہوئے ناصر ٹیلیفون پر سسر لیسو راٹھالیا

اور پھر تھوڑی ہی دیر میں دونوں پہاڑ کا پریچ راستہ اُتر رہے تھے۔

”گھاؤں میں کوئی کام تھا کیا۔؟“ ناصر ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔
 ”بابا جان سے تھوڑا سا پوائنٹ ڈسکس کرنے تھے۔“
 ”پھر واپس....“

”بابا جان کا ڈرائیور لائے گا۔“
 ”ہنیں۔ میرا مطلب ہے پھر واپس کب آؤ گے۔“
 ”کل ہی۔ کیوں۔؟“

”یوں ہی۔!“ ناصر سوچوں میں گم ہو گیا۔
 شان بھی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

”ادھر کاکنڈو نمٹ گزرتے کے بعد تمہارا گاؤں تیس میل رہ جاتا ہے۔“
 ”میلوں سفر کرنے کے بعد ناصر کو شہر میں داخل ہوتے دیکھ کر شان نے کہا۔“
 ”ہاں۔“ وہ اب بھی سوچوں میں گم تھا۔

”دیکھو ناصر جلدی فارغ ہونا۔ رات تک ہم کو ضرور بابا جان کا پاس پہنچ جاتا ہے۔ بابا جان کو اطلاع ہو چکا ہے۔ تم کو معلوم ہے تاخیر وہ برداشت نہیں کر سکتا۔“

”اوکے۔ سر۔ پٹواری سے بات ہی تو کرنی ہے۔“ سوچوں سے ابھرتے ہوئے
 اس نے ایک نظر شان کو دیکھا۔ ”تم تہ انگ جانا وہاں.... میرا کیا ہے۔“
 ”میرا انگنا کا کیا سوال ہے۔“ شان کے لہجے میں اچانک ادا سی
 سمٹ آئی۔ برسوں پہلے جب بھوپتی اور بھوپا جان زندہ تھے۔ وہ
 یہاں آیا کرتا تھا۔ کتنی رونق ہوا کرتی تھی۔

اُن کے ختم ہونے کے بعد تو۔ جیسے اس کے لئے یہ گاؤں ہی ختم ہو گیا تھا۔
 ناصر کو بابا جان نے گئے تھے۔ حویلی کو تالا پڑ گیا تھا اور تمام گاؤں جیسے سونا
 ہو کر رہ گیا تھا۔ چند نوکر حویلی کی دیکھ بھال کے لئے باہر حجرے میں مقیم تھے۔
 اور جائیداد کی دیکھ بھال۔ بابا جان نے خود ہی سمجھال لی تھی۔ شاذ ہی ناصر
 آیا ہو گا پھر ادھر۔

پھر کچھ عرصہ قبل ناصر کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے بعد بابا جان نے
 اُس کی جائیداد اُس کے سپرد کر دی تھی۔ تب سے ہی وہ اکثر و بیشتر موقع پاتے
 ہی اپنے گاؤں کا چکر لگاتا۔ مگر زیادہ دیر کبھی نہ رکتا۔

”دوپہر وہیں گزار لینی تھی۔ سخت گرمی پڑ رہی ہے۔“ ایسے میں سفر کرنا
 مناسب نہ تھا۔ بابا جان نے ایک بار اُسے تنبیہ کی تھی۔

”بند مکرے کھولتے ہوئے میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔“ ناصر نے بعد میں
 شان کو اُدا سی سے بتایا تھا۔

ناصر بائیں جانب مڑا۔ آبادی کے آثار شروع ہو گئے تھے۔
 ”پٹواری کو کیا وقت دیا ہے۔؟“ سوچوں سے اُس نے ابھرتے ہوئے
 گھر کی طرف نظر ڈالی۔

”شام پانچ بجے کا۔“ ناصر نے جواب دیا۔

”اور پانچ بجنے میں صرف دس منٹ ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ بس پہونچتے ہی بات کروں گا۔ مجھے خود بھی جلدی ہے۔“

ماحول جان سے گردن تو نہیں دلوانی ویسے ایک بات ہے شان۔ کسی

دن ہم دونوں میں سے کسی سے بھی کسی قسم کی کوئی ایسی کوتاہی ہو گئی جو ماموں
 جان کو ناگوار گذرے۔ ہمیں ہماری بیویوں کے سامنے بھی ایک ایک ہاتھ دے
 کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔“ ناہرنے مسکراتے ہوئے کہا۔ گو کہ اُس کی اس
 بات میں بھی ماموں کے لئے احترام اور غمخ کے جذبات نمایاں تھے۔
 ”اسی لئے تو بیوی آنے سے پہلے آج اُن کا ساتھ بات کرے گا۔“ شان
 مسکراتے ہوئے بولا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ کیا عجب آج جوتیاں بھی پڑ جائیں۔ بیوی تو نہ
 دیکھ سکے گی نا۔“ ناہرنے ناصحانہ انداز میں کہا۔ اور شان خوبصورتی سے
 ہنسنے لگا۔

ناہرنے دیکھا آج بہت دنوں بعد اُس کے چہرے پر رونق آئی تھی۔
 چونک کر ناہرنے بریک لگائی۔ آگے زبیر اکرا سنگ تھی۔ ایک الٹرا
 موڈرن لڑکی گاڑی کے سامنے سے ارد گرد سے بے نیاز مست خراچی سے چلی
 جا رہی تھی۔ ناہرنے۔ آنکھ دبا کر شان کو دیکھا۔
 ”باز آجاؤ۔ بڑھا ہو گیا ہے اب۔“

”تو یہ کرو۔ میں تو تمہاری بیوی کو بھی نہیں چھوڑ دیں گی۔“ ہنوز
 آنکھ دبائے وہ حسبِ عادت بولا۔

”اسی لئے تو ہم تمہارا بہن سے شادی کر رہا ہے۔“
 اور ناہر بغلیں جھانکنے لگا۔ بہن تمہیں ملے بھی نا۔“ ناہرنے گاڑی

چلا دی۔

”دیکھتا ہے کس طرح نہیں ملتا۔“ پتلی سی سرک کے دونوں طرف کیکر
جھنڈا اور اب ہلہلاتے کھیت تھے۔

سکاؤں قریب آگیا تھا۔ وہ سوچوں سے اکھرا۔

ناہر یاں جان ب پتھر علی سرک پر ہو لیا تھا۔

”چلو اترو۔“ ڈلوڑھی کے آگے گاڑی روک کر ناہر نے کہا۔

”بات تو باہر مجھے میں ہونا ہو گانا۔“

”آج ذرا اندر بھی ہو آؤں۔ کچھلی بار بھی آیا تھا تو باہر ہی کاردار

سے ملا تھا۔ اندر نہیں جاسکا تھا۔

”اور کے چلو۔ ا“ شان آگے بڑھے۔

اور وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔

شام کے چھ بجنے والے تھے سامنے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دور
کنوئیں کے قریب البتہ ایک ملازمہ بیٹھی کپڑے دھونے میں مصروف تھی۔
وہ آگے بڑھ آئے۔ تب ہی باورچی خانہ سے ادھیڑ عمر کی ملازمہ برآمد

ہوئی۔ وہ ناصر کو دیکھتے ہی لپک کر پاس آگئی۔

”اتنی کہاں ہیں۔؟“ ناصر نے پوچھا۔

”وہ تو شہر گئی ہیں۔“

”خیریت تو تھی۔؟“

”خیریت ہی ہے۔ ماما آئی تھیں۔ اُن کے ساتھ گئی ہیں۔

”زرین کہاں ہے؟“ ناصر نے پوچھا۔

”اپنے کمرے میں لیٹی ہیں طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

”اوہ۔“ ناصر پریشان سا برآمدے کی طرف بڑھا۔

”آئی اور زرین یہاں ہے۔؟“ ناصر کے ساتھ ساتھ چلتا شان

پہلی بار بولا۔

”ہاں۔ اُن کو یہاں شفٹ کر دیا ہے۔ مجھے شاید تمہیں بتانا یاد نہیں

رہا۔“ وہ جلدی سے اندر کی طرف بڑھا۔ شان وہیں رک گیا۔

اور وہیں زرین سے ناصر کو معلوم ہوا۔ ماما کے آنے پر انہی اور ماما

دونوں ضروری خریداری کرنے شہر گئی تھیں۔ زرین کچھ سستی فحوس کر رہی تھی۔

اس لئے ہنسی جا سکی تھی۔

”میں تو پریشان ہو گیا تھا۔“ ناصر کے حواس کچھ بجا ہوئے تو اس نے

کہا۔ ”تم نے کوئی دوائی لی۔“ اُس نے زرین کی نبض تھام لی۔

”بس یو نہیں سر میں درد ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”تمہیں تو بخار ہے اچھا فاما۔ بھڑو! میں دوا دیتا ہوں۔ شان ہے

میرے ساتھ۔ اُسے بٹھالوں ذرا۔“ اور وہ یاہر نکل آیا۔

شان کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ ملازمہ سے چلے بنانے کو کہا اور واپس زی کے کمرے میں چلا آیا۔

”دوائیاں کہاں رکھی ہیں۔“ وہ الماری کی طرف بڑھا۔

”اسی الماری میں ہیں اوپر۔“

اور وہ الماری کھول کر دوا ڈھونڈنے لگا۔ ”پٹواری تو نہیں آیا تھا۔
گوئی ہاتھ میں لئے وہ اُس کے سر ہانے آگیا۔

”آیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ آپ نہیں پہنچے تھے کہنے لگا ایک گھنٹہ
بعد چکر لگا لوں گا۔ آتا ہی ہو گا اب تو۔“ زرین نے مسہری کی پشت سے ٹیک
لگائی۔ ”یہ لے لو۔“ ناصر نے اُسے پانی کا گلاس اور گوئی تھما دی۔ پھر
اُس کا ماتھا سہلانے لگا۔

”اچھا فاصا بخار ہے۔ تم کہتی ہو صرف سر میں درد ہے۔“ اُس نے تشویش
سے اُسے دیکھا۔ کیسی مر جھا کر رہ گئی تھی۔ چند دنوں میں۔

”آپ ناحق پریشان ہو رہے ہیں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ زرین نے گلاس
سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”تم لیٹو۔ میں شان نے پاس جاتا ہوں۔

”اجی بھی بس آتی ہی ہوں گی۔ آپ کی وجہ سے وہ تو جانا بھی نہیں چاہتا
تھیں۔ مگر ماما کیلی تو کچھ کر نہیں سکتیں۔ میں نے خود اتنی کو بھیج دیا۔ ماما
واپس بھی جانا تھا۔

”اچھا کیا چلی گئیں۔ خدا کرے میرے ہوتے ہوئے آجائیں۔۔۔۔۔“
 ”صاحب پٹواری آگیا ہے۔ ملازمہ نے دروازے کے پاس آکر بتایا۔
 ”اوہ گڈ۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ شان ڈرائنگ روم میں ہے۔ چلے
 کے لئے میں نے ملازمہ سے کہہ دیا ہے۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر چل دیا۔ اور زی کو ناصر پر غصہ آگیا۔
 وہ تو پورے خاندان کی بے عزتی کرنے پر ٹٹلا ہوا تھا۔ اور ایک ناصر
 بھائی تھے کہ کچھ جارہے تھے۔

یہ دن جس کرب میں گزرے تھے۔ کچھ اُسے ہی معلوم تھا۔ ہر وقت ہر لمحہ
 اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے۔ سوتے جاگتے۔ بیتے دن۔ پھر منگنی۔ اُس کے بعد کے
 حین پینے۔ اور پھر چند دن قبل۔ آرٹ گیلری کا فنکشن۔ ناصر کا شان اور
 ٹینا کے متعلق انکشاف۔!

سب۔ ایک ایک کر کے کسی متحرک فلم کی طرح اُس کی نظروں کے سامنے
 آتے اور جاتے رہے۔ وہ یہ سب باتیں انی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی۔
 اکیلے ہی اکیلے، من ہی من میں۔ گھٹ گھٹ کر ہلکان ہو رہی تھی۔
 انی بھی دیکھ رہی تھیں۔ اُسے اُداس اُداس اور کھویا کھویا۔ مگر
 سمجھ کچھ نہیں پا رہی تھیں۔

”زی بیٹے۔ چپ چپ کیوں رہتی ہو۔“ کل ہی وہ پوچھ رہی تھیں۔
 ”ہوں۔۔۔۔۔ نہیں تو انی۔۔۔۔۔“ وہ گہرا سی گئی تھی۔

”میں دیکھ رہی ہوں۔ ہوٹل سے آئیں تھیں تو ٹھیک ٹھاک تھیں۔ چند

دن سے پی چپ چپ ہو۔ کھانا بھی برائے نام رہ گیا ہے۔
تو اتنی باقاعدہ نوٹ کر رہی تھیں۔

”نہیں اتنی۔ آپ کا وہم ہے۔ پڑھتی رہتی ہوں نا ہر وقت۔ اس لئے
شاید آپ کو مڑ جھانی سی لگتی ہوں۔

اُسے امتحان کی تیاری کے لئے چھٹیاں ملی تھیں۔ آج کل واقعی ہر وقت
کتاب آنکھوں کے سامنے رہتی تھی۔ مگر پھر بھی۔ انی اُسے خاموش خاموش
نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ ”بیٹے۔ خوش خوش رہا کرو۔ اپنی ساری پریشانی
اپنی انی کو دے دو۔ اتنی بولی تھیں۔

اور اس وقت بھی۔ آنسو لڑھک کر اُس کے تکیے پر آ رہے۔
”ٹھک۔ ٹھک۔ ٹھک۔“ دروازے کا پٹ بج اٹھا۔

جلدی سے اُس نے یا زو آنکھوں پر رکھ لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُسے
کوئی بدتا دیکھے۔ تبھی بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔
”ہیلوزی۔!“ شان ہی تھا۔

یہی آواز تونہ چلتے ہوئے بھی اُس کے ذہنِ ددل میں محفوظ ہو چکی تھی۔
”زی۔!“ وہ قریب چلا آیا۔

آنکھوں پر یا زو رکھے رکھے اُس نے دیوار کی طرف کروٹ مے لی۔
”زی۔ ہیلز۔۔۔“ کتنے قاصدے کھنکھنے لگے تھے۔ میں۔ وہ کتنا اجنبی
اجنبی محسوس کر رہا تھا اپنے آپ کو۔

”زی۔ خفا ہے مجھ سے۔“ وہیں اُس کے سر پہلے کھڑا وہ اُس کے

تکیوں میں دئے سر کو گھور رہا تھا۔

اور جانے کیوں۔ زی کو اور بھی رونا آگیا۔ کہاں کہ اُس کے خلاف دل میں اتنا غصہ بھرا تھا۔ کہاں کہ اُس نے سوچا تھا کہ اُس کی مڈ بھڑا اُس سے کہیں ہوئی تھی تو وہ اُسے یوں IGNORE کر دے گی جیسے جانتی تک نہ ہو۔ مگر اُس وقت تو اُس کی پوزیشن ہی کچھ اور تھی۔

بخار میں پڑے پڑے۔ پھٹی باتوں کو سوچ سوچ کر۔ پہلے ہی پیمانہ لبریز تھا۔ اوپر سے خود چلا آیا تھا۔ چھلکنا تو تھا ہی۔

”زی میرا بات سنو۔ پھر میرا غلطی ہو تو سزا دے دو۔ ہم کو۔“ وہ احتیاط سے اُس کی مسہری کی پٹی پر بیٹھ گیا۔

”آپ پلیر چلے جائیں۔ یہاں سے۔“ وہ روتے روتے بمشکل بولی۔

”اوہ۔“ وہ پریشان ہو گیا۔

وہ رو رہی تھی۔ ایسا تو اُس نے کبھی نہیں چاہا تھا۔

”زی پلیر۔ سنو تو۔“ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ اُس کے بالوں پر گیا۔

زی کو جیسے بجلی چھو گئی۔ تڑپ کر اُس کا ہاتھ دور جھٹک دیا۔

”اوہ۔“ وہ خوب صورتی سے ہنسا۔ ”بہت خفا ہے۔“

”چلے جائیں یہاں سے۔“ وہ چلائی۔

”NON SENSE۔“ آہستہ بولو۔ اُس نے ادھر اُدھر دیکھا۔

”اتنے زور سے چلائی تھی۔ کوئی دیکھ لیتا تو۔ وہ قدرے پیچھے ہٹ گیا۔“

زی نے آنسو پونچھے۔ سیدھی ہوتے ہوئے مسہری کی پشت سے

ٹیک لگائی۔ شان اُس کے جھکے سر۔ سرخ چہرے۔ بھگی پلکوں کو دیکھ رہا تھا۔

”مراؤں جان کو لکھ بھیجا ہے کہ وہ سنگنی کا پا بند نہیں رہ سکتا۔ سنگنی تڑوا دی جائے۔“ جانے کہاں سے ناھر کے کہے ہوئے الفاظ زی کے کانوں میں گونجے۔ اُس نے متورم آنکھیں اٹھا کر شان کو دیکھا۔ کس اطمینان سے بیٹھا تھا۔ جیسے وہ کوئی کھلونا تھی اور آج پھر وہ اُس سے کھیلنے چلا آیا تھا۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

زی کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔

”آپ آئے کیوں ہیں یہاں؟“ اچانک ہی وہ تلخ، طنزیہ، بیگانہ

ہجے میں بولی۔ جانے کیوں خفیف سا ہو گیا۔

”تم کو ہمارا آنا اچھا نہیں لگا۔“ اُس نے سنبھلنے کی کوشش کی۔

”میں آپ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“ زی نے کہا۔ اُس کے

ہجے میں حقارت تھی۔

شان کا رنگ بدل سا گیا۔

”ہم اتنا بُرا نہیں ہے۔“ وہ بڑے ضبط سے مسکرایا۔

”آپ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں۔؟“

اور شان کو پہلی بار اپنی توہین کا احساس ہوا۔

”JUST NOTHING“ وہ کھڑے ہوئے ہجے میں بولا۔

”چلے جائیں یہاں سے۔“ وہ پھر چلائی۔

اور آگے بڑھ کر اُس نے سختی سے اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”SHUT - UP“ وہ تیزی سے بولا۔ بڑی دیر سے ضبط کئے

بیٹھا تھا۔ برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ایک تو وہ اُس کی بات

نہیں سن رہی تھی۔ اوپر سے چلا بھی رہی تھی۔

منا کہ اُسے دکھ پہنچا تھا۔ پریشان رہی تھی۔ مگر دوسرے کو صفائی

دینے کا موقع تو دینا چاہئے۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اُس کی غلط

فہمی دور کرے۔ مختصر الفاظ میں۔ — ناہر باہر گیا تھا۔ یہی موقع تھا

اُس سے کچھ کہنے سننے کا۔ مگر وہ تھی کہ کسی طرح بات آگے بڑھنے ہی

نہیں دے رہی تھی۔

”I DON'T LIKE VIOLENCE“ دیکھو میرا بات سوجپ چاپ۔

اُس نے سختی سے کہا۔

”چھوڑ دیں مجھے“ وہ تڑپتی۔ بمشکل بولی۔ مگر اُس کی گرفت بہت مضبوط تھی

”I SAY SHUT UP“ زرین سہم سی گئی۔

”NOW LISTEN“ ہاتھ اب بھی اُس کے مُنہ پر تھا۔ اب کے زرین

نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”جب تک دونوں طرف کا بات پورا نہ معلوم ہو۔ کوئی نتیجہ نہیں قائم

کرنا چاہئے۔“ اُس کا اہجہ قدرے نرم پڑ گیا تھا۔ مگر۔ اس کا ایک ہاتھ اس

کے منہ پر اور دوسرا اب بھی اُس کی گردن کے گرد پٹا تھا۔

”تم شاید خفا ہے۔ کہ میرا منگنی کسی اور سے کیوں ہوا۔ مگر یہ ہمارا حرضی سے نہیں ہوا۔ ہم نے بابا جان کو بولا تھا کہ ہم اُن کی پسند پر منگنی نہیں کر سکتا۔ ہم نے لڑکی پسند کر لیا ہے۔ اُس سے ہمارا شادی کر دیں۔“ اُس کی گرفت اُس کے منہ پر ڈھیلی ہو رہی تھی۔ ”مگر تم کو معلوم نہیں وہ بہت سخت قسم کا انسان ہے۔ بالکل نہیں سنا ہمارا۔ اور اپنا حرضی سے ہمارا منگنی کر دیا۔“

زی نہ چاہتے ہوئے بھی سنتی رہی۔ کچھ سمجھے بغیر ہی۔ شان نے گردن موڑی۔ دُور دُور اُٹھی کی طرف نظر ڈال کر اطمینان کیا۔ اور پھر اُس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا دیا۔ پھر دھیرے سے دوسرا ہاتھ بھی اُس کی گردن کے نیچے سے نکال لیا۔

”منگنی کے بعد ہم نے پھر اُن کو لکھا۔ کہ اُس گھر میں کہہ دو کہ ہم اس منگنی پر قائم نہیں رہ سکتا۔ ہم اپنا پسند کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس پر بابا جان بہت غصہ ہوا۔ فوراً ناھر کے پاس بھیجا۔ اور ناھر کو میرا پاس بھیجا کہ وہ اب اپنا فیصلہ ہمیں بدل سکتا۔ لڑکی والوں کے ساتھ وعدہ خلاتی نہیں کر سکتا۔

ناھر نے ہم کو سمجھایا۔ لیکن پھر ہم پر ترس آگیا۔ بابا جان کو بھی سمجھایا۔ اور اُس لڑکی کو کوئی ایسا پٹی کرایا۔۔۔“ اُس نے ناھر کی بات دہرائے کی کوشش کی۔ تو اُس پریشانی میں بھی ہنسی آگئی۔

اب تو وہ با محاورہ اُردو بولنے کی کوشش بھی کرنے لگا تھا۔ آہستہ سے اُس نے سر گھٹنوں پر ٹیک دیا۔ ویسے وہ پریشانی کے ساتھ ساتھ حیران بھی تھی۔ پورے واقعہ میں زرین کے ساتھ منگنی ہو جانے کا ذکر ہی نہیں تھا۔

”پھر لڑکی والوں نے منگنی کا انگوٹھی بابا جان کو واپس کر دیا۔ وہ انگوٹھی آج صبح ہم کو ناہرنے لاکر دیا۔ یہ دیکھو...“ شان نے ایک ہاتھ سے اُس کا سراونچا کیا۔ دوسرے ہاتھ کی پھیلی میں رکھی انگوٹھی اُسے دکھائی۔

اور زرین گرچہ بات کی تہہ کو نہ پہنچ پائی تھی اب تک۔ پھر بھی اس سارے ہیر پھیر کا ذمہ دار سوائے ناہر کے کسی اور کو نہ ٹھہرا سکی۔

انگوٹھی کو ایک نظر دیکھا۔ اور سروسا پس گھٹنوں پر واپس رکھ دیا۔ کچھ بخار۔ کچھ پریشانی۔ اور پھر یہ ہیرا پھری۔ موقوف دماغ پکرا کر رہ گیا۔

”اب بتاؤ۔ اب بھی خفا ہے مجھ سے۔؟“ اُس نے اُس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا۔

زی خاموش رہی۔ تانوں باتوں میں الجھی ہوئی تھی۔ کہتی تھی کیا۔

”دیکھو۔ اب میں آزاد ہے۔ جہاں میں چاہے گا وہاں شادی کرے گا۔ اور تم کو معلوم ہے وہ تمہارے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ انگوٹھی اب بھی اسکے ہاتھ میں تھی۔

زی چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اور پھر شان کو دیکھ کر اچانک یاد آیا۔

”زی تم نے اُس ڈاکٹر کے ساتھ بات کر لیا۔ میرا بالکل بھی خیال نہیں کیا۔“

اُس کی آواز میں شکوہ تھا۔

”کیا۔؟“ جھکنا سر اٹھا کر زی حیران لگی۔ پوچھنے لگی۔ کون ڈاکٹر۔؟“

”ماجد صاحب کا لڑکا۔“

”آپ بہتہ نہیں کیا الٹا سیدھا لول رہے ہیں اتنی دیر سے۔ میری سمجھ میں تو کچھ آہٹیں رہا۔“ وہ اُکھٹی اُکھٹی سی بولی۔

”تمہارا بات اُس ڈاکٹر سے پکا نہیں ہوا۔؟“

”اوہ خدایا۔“ وہ جیسے تھک کر بولی۔ ”کس نے بتایا آپ کو۔؟“

”ناہر کہتا تھا۔ تمہارا بات ہو گیا ہے اُس ڈاکٹر سے۔“ وہ امید و بیم کی حالت میں اُسے دیکھ رہا تھا۔

”اوہ۔ ناہر بھائی۔“ سر ہلاتے ہوئے اُس نے ایک گہری سانس لی۔ ادرا اب سے پورا یقین ہو گیا کہ سب کچھ تو ناہر بھائی کے ہی تھے۔ ادرا اب تک جو شان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اُس کی منگنی زی سے ہوا ہوئی ہے۔ یہ بھی یقیناً ناہر بھائی کے ڈرامے کا کوئی اہم حصہ تھا۔ مگر وہ پتہ کرتی بھی تو کیسے۔؟ کیسے شان سے براہِ راست کہہ سکتی تھی کہ اُس کی منگنی اُسی سے ہوئی ہے۔

”زی پلیر۔ مجھ کو بتاؤ۔“ اُس نے اُس کا گھٹنہ ہلایا۔ ڈاکٹر سے تمہارا بات ہوا ہے یا نہیں۔؟“ اُس کی نظروں میں اُس کے دیئے جل اُٹھے تھے۔ وہ ملتتی نظروں سے زی کی نظروں میں دیکھ رہا تھا۔

”نہیں۔“ دھیرے سے کہتے ہوئے اُس نے سر جھکا۔

”اوہ زی۔ میں پاگل ہو جائے گا خوشی سے۔“ غیر ارادی طور پر اس کا سر زی کے گھٹنہ پر ٹک گیا۔

زی نے مجھکی نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔ کتنا معصوم تھا وہ۔ مگر زی کا خوبصورت چہرہ ایک بار پھر تاریک سالیوں کی پیٹ میں آ گیا۔ اب تو آپ خری ہیں۔ ٹینا حامد علی کے پاس جاسکتے ہیں۔ اچانک وہ شاکی لہجے میں بولی۔

ٹینا کے ساتھ افیر کی بات تو ہر حال اپنی جگہ تھی۔

”ٹینا حامد علی؟“ سر اٹھا کر وہ اُسے حیرانگی سے دیکھنے لگا۔

”باقی سب جو ہوا۔ اُسے تو ناہر بھائی کے ڈرائے کا حقہ کہا جاسکتا ہے۔

مگر ٹینا کے ساتھ پچھلے دنوں انٹرکون میں ڈنر پر.....“

”تم کو کیا معلوم ہوا۔“

”چور پکڑا گیا نا۔“

”ہم چور ہے نہیں تو پکڑا کیسا ہے۔“

”میں پکڑنے والی کون ہوں۔ ٹھیک کرتے ہیں۔ آپ جو بھی کرتے ہیں۔“

”تم پکڑنے والا کوئی نہیں ہے؟ ہم تمہارا کچھ نہیں ہے۔؟“ وہ اُس کی

آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ کتنا دکھ سمٹ آیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں۔

مگر زی بھی کچھ کم تو دکھی نہ ہوئی تھی اُسے دیکھ کر۔!

”بولو نازی۔ ہم تمہارا کچھ نہیں ہے۔؟“ اُس نے اپنا سوال دہرایا۔

وہ اب بھی اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

اور اس کی آنکھوں کا دکھ بڑھتا گیا۔ اور یہی دکھ جانچتے جانچتے زی کی

آنکھیں غم ہو گئیں۔ اُس نے پلکیں چھبکیں۔ آنسو ٹھٹھک کر گالوں پر آ رہے۔

اُس نے سر دوبارہ گھٹنوں پر ٹیک دیا۔

چند روز قبل تک یہی انگوٹھی میرے ہاتھ میں تھی۔ مگر جب ٹینا کو آپ کے

ساتھ دیکھا۔ اور بعد میں ناہر بھائی کے آپ دونوں کے افیر کی تصدیق بھی کر دی

اور یہ بھی کہ آپ..... اس شگنی کو توڑنا چاہتے ہیں۔ تو میں نے یہ اتار کر.....

ناہر بھائی کو.....“ مارے ہچکیدوں کے وہ آگے کچھ کہہ ہی نہ سکی۔

”چند روز قبل تک یہ انگوٹھی تمہارا ہاتھ میں... کیسا۔؟“ چونک کر اُس نے کہا
 زی کوئی جواب نہ دے سکی۔ چپ چاپ روتی رہی۔

”ناصر کہتا تھا۔ ہمارا افسر ہے یٹنا ہمد کے ساتھ۔؟“ زی نے سر اثبات میں ^{بلادیا}
 ”اوہ۔“ اُس نے اُس کے جھکے ہوئے سر پر پیار کر لیا۔ ”کیسا کیسا دکھ رہنچا
 ہے میری جان کو۔!“

”میں نے بھی دیکھا تھا آپ دونوں کو۔“ وہ روتے روتے بولی۔
 ”ٹھیک ہے دیکھا تھا۔ مگر میرا فیر نہیں ہے۔ ناصر بکواس کرتا ہے۔ یقین کر لو
 یٹنا نے فتن کش کے بعد ہم سے ہمارا پروگرام پوچھا تو ہم نے کہا کہ انٹر کون میں
 ڈنر کے واپس کاؤں جائے گا۔ اس پر وہ بولا کہ وہ بھی آجائے گا۔ ہم کیا کہتا۔
 بابا جان کا دوست کا بیٹا ہے۔ یہ سب کسٹی تھا ڈیر۔ صرف کمرٹی۔ اُس
 نے اُسکے سر پر کئی پیار کر ڈالے۔

اور جاننے کیسے؟ اُس کی عدم موجودگی میں جو شکوک و شبہات، غصہ اور
 حقارت اُس کے دل میں اُس کے خلاف اٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت اس کی
 موجودگی میں اس کی باتوں حرکات و سکنات کو دیکھتے ہی خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔
 ”اچھا۔ اب تم لیڈ، جاؤ۔ تمہارا طبیعت ویسے بھی ٹھیک نہیں ہے۔“ اُسے
 سہارا دیکر تکیے ٹھیک کرتے ہوئے اُس نے اُسے لیٹنے میں مدد دی۔

اور۔ اب پھر۔ وہ شان کا سامنا نہیں کر پاتا رہی تھی۔
 گو کہ شان اب بھی یہ نہیں سمجھ پاتا تھا کہ اُس کی سنگینی زی سے ہی ہوتی
 ہے۔ مگر حیا پھر بھی اُسے آرپی تھی۔ اُس نے پھر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

شان کھڑے کھڑے اُس پر جھک آیا۔ اُس کا بازو ہٹا دیا۔ باری باری
دونوں آنکھوں پر پیار کیا۔ "اب چلتا ہے۔ ناصر کا ذرا خبر لیتا ہے۔
لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ ڈرائنگ روم کی طرف چلا۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوا ہی تھا کہ ناصر آ پہنچا۔
"تھکا دیا ہے۔ کمبخت نے وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔" ہم باقی کس کبھی نکال
دے گا۔" شان نے ایک زوردار گھوٹہ رید کر دیا۔
"آپ تو بول پڑے ہیں سرکار۔ کب زندہ ہوئے۔؟" ذرا بھی اٹھنے بغیر
ناصر نے کہا۔ "تم نے زی کو بتایا ہے کہ ہمارا آئینہ چل رہا ہے مینا حامد علی کے
ساتھ میں۔"

"اوہ سمجھا۔ تو سازش ہو چکی ہے۔ میری خیر موجودگی میں۔"
"ہاں۔ ہم نے اُس کو سب بتا دیا۔ وہ تو ہم سے خفا تھا۔ ہم نے بتا دیا کہ
کس طرح بابا جان نے ہمارا مرضی کے خلاف ہمارا شگنی کسی اور سے کیا تھا۔ پھر کس
طرح تم نے چکر چلایا۔ لڑکی کو سمجھا کر انگوٹھی واپس لیا۔ اور ہم کو دیا۔ مگر یار۔ اُسے
جیسے اچانک خیال آیا۔ زی تو کہتا ہے یہ انگوٹھی چند روز قبل تک اُس کے
ہاتھ میں تھا۔" وہ اُلجھا اُلجھا سا بولا۔ اور ناصر زور سے ہنس دیا۔

یعنی اتنی ساری باتیں ہوئیں۔ اور تمہیں یہ بھی پتہ نہ چل سکے زلیخا مرد تھی یا عورت؟“ ناہر نے کہا۔ ”کیا مطلب۔؟“ شان نے چونکا۔

”کیا تمہیں واقعی اتنی ساری باتیں کر لینے کے بعد بھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ تمہاری منگنی درحقیقت زلیخا سے ہی ہوئی ہے۔ وہ واقعی حیران ہو رہا تھا۔“

”میرا منگنی زلی سے ہوا ہے۔؟“

”ہاں۔“ ناہر نے کہا۔ ”اوہ نو۔“ شان نے کہا۔

”یہی تو بات ہے ساری۔ تم اس قابل ہی نہیں ہو۔ جی بھی تو اُس نے انگوٹھی واپس کر دی۔“ ناہر نے کہا۔

”تھوڑا خیال ہم کو بھی آیا تھا۔ جب اُس نے کہا تھا کہ انگوٹھی اُس کے ہاتھ میں تھا۔ مگر پھر سوچا۔ ہم کب اتنا خوش قسمت ہے۔ مگر...“

”چائے پیو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ پھر تفصیل بتاؤں گا۔“

”پہلے یہ بتاؤ۔ تم تو کہتا تھا کہ ذی کا اُس ڈاکٹر سے بات ہو گیا ہے۔“

”تو کیا ہوا۔ ڈاکٹر سے تو ہر انسان کا بات ہو سکتا ہے۔“ وہ اُسی کے لہجہ میں بولا۔

”نہیں۔ اب مذاق ختم کرو۔ بات کا مطلب منگنی یا شادی وغیرہ ہے۔“

تمہنے کہا تھا بات پکا ہو گیا ہے۔“

”چائے پیو۔ بات ساری پتہ چل گئی ہے۔ اب میرا دماغ مت کھاؤ۔ ہائے۔“

ہائے سوچا تھا ڈراپ سین مانوں جان کے سامنے ہو گا۔ تم ان کو انگوٹھی دے کر

کہو گے کہ یہ بے جا کر زین کو پہنا دیں۔ انہیں تمہاری دماغی حالت پر شبہ ہو گا

ہائے۔ کیا کیا بدحواسیاں دکھاتے تم۔ اور کتنے خوش ہوتے ہم۔ مگر۔“

”بس کرو۔ چائے پیو۔“

”میں پٹواری کے ساتھ پی چکا۔ کاش نہ پیتا۔ اندر سازش تو نہ ہوتی

میرے خلاف۔!“

”اچھا اب بتاؤ ساری بات۔“

”سنو شان۔“ نامہ پہلی بار سنجیدہ نظر آنے لگا۔ ”در اصل جس دن ماموں جان نے زرین کو انکل ماجد کے گھر دیکھا تھا۔ دل ہی دل میں ہمارے لئے پسند کر لیا تھا پھر انکل ماجد سے کرید کرید کر زرین کے متعلق سب معلوم کیا۔ پھر تم سے کہا کہ انہیں ہمارے لئے لڑکی پسند آگئی ہے۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے۔ جب تم بھی زرین کو مل چکے تھے۔ تم نے ماموں جان سے اپنی پسند کا ذکر خط میں کیا۔ مگر وہ زرین کو زیادہ مناسب سمجھ کر اپنی مرضی پر اڑے رہے۔ نہ ماموں جان کو معلوم ہو سکا کہ ماموں جان جس لڑکی کو اپنی آن بان سمجھ بیٹھے تھے۔ وہ بھی زرین کے علاوہ اور کوئی نہیں۔“

اس دوران میں امریکہ چلا گیا۔ ماموں جان سے اتنی اور زرین کا کوئی تذکرہ کئے بغیر ہی۔ کیونکہ اتنی چاہتی تھیں کہ جب تک یہ بات چھپی رہے بہتہ ہے۔ دراصل انہیں ماموں جان کا خوف تھا۔ کیا پتہ۔ کیا رد عمل ہو ان کا۔ زیادہ اندیشہ انہیں زی کا لگا رہتا تھا۔ ”وہ سکرایا۔“ کہ کہیں ماموں جان یا۔ پھر میں۔ یعنی زی کے در شا کہیں زی کو ساتھ لے جاتے کا زور ڈالیں۔ بس انجانے سے خوف لگے رہتے تھے بے چاری کو

خیر۔ اس دوران ماموں جان آئے اور زرین کا ہاتھ ہمارے لئے

طلب کیا۔ اتنی نے مجھے امریکہ لکھا۔ میرے امریکہ جانے سے قبل انکل ماجد بھی اپنے بیٹے کے لئے زی کا رشتہ مانگے آئے تھے۔

بہر حال۔ میں واپس آیا تو ماموں جان اور میں نے ہماری سنگنی کی تاریخ مقرر کر دی۔

چلے چھوڑ چھاڑ شان اُس کو گھور پاتھا۔ ”مگر جب بابا جان کو آنی اور زرین کا حال معلوم ہوا۔ میرا سنگنی بھی کرنے لگا۔ تو مجھ کو کیوں نہیں بتایا۔ وہ حیران سا بولا۔

”اول تو اس لئے کہ بقول ماموں جان تم خدا ڈکٹیوریل قسم کی چیز ہو جس پر ماموں جان کو اعتراض نہ ہوا۔ جس بات پر ماموں جان کو اعتراض نہ ہوا۔ یعنی اتنی کے سیکے وغیرہ پر۔ شاید اُس پر تمہیں اعتراض ہو۔ اور پھر۔ بقول ان کے ہی۔ تم کسی اور لڑکی کو شادی کے لئے بھی پسند کر چکے تھے۔ ظاہر ہے۔ ایسے حالات میں اول تو اُن کی پسند تمہیں نہ بھاتی۔ اور پھر کچھ غور کرتے بھی تو لڑکی کی ماں کے خستہ حالات سن کر اور بھی مکر جاتے۔۔۔“ ناصر سنجیدگی سے کہتا گیا۔

”اوہ DON'T TELL ME THAT“ میں تو کبھی اس ڈیٹیل میں گیا ہی نہیں۔“ وہ دھیرے سے مسکرایا۔

پھر اُس کی خوبصورت آنکھوں میں شرمی اُتر آئی۔

”بلکہ ڈیٹیل میں جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ دن رات ہر جگہ، ہر طرف زی ہی زی نظر آتا تھا۔ پھر سوچتا کس وقت کہ وہ کون ہے۔ اور اس کا

مال کون ہے۔

نامر ہوئے سے مکر ادیا۔

”اچھا اب جاننا ہے واپس یا نہیں۔“ نامر نے گفٹری دیکھی۔ ساڑھے سات ہو رہے تھے۔ شام کے سائے ملنے لگے ہوتا شروع ہو گئے تھے۔

”وہ تو جاننا ہے مگر۔“ اُس نے چلنے کا گھونٹ لیا۔ یہ باقی سارا کیا ہیکر چلایا تھا تم نے۔ مثلاً بابا جان کا پیغام ہم تک لایا۔ پھر اُن کو فون کیا۔ کہ ہم وہی کرے گا۔ جو وہ چاہیں گے۔ پھر کسی فرضی لڑکی سے انگوٹھی لایا۔۔۔ ٹینا سے افسر وغیرہ۔۔۔“

”ڈرلر تھا سب ایک معمولی سا کھیل سمجھ لو چھوٹا۔ PLAY. PLAY ہلکا پھلکا سا۔ وہ ہاتھ سے مختلف مقداروں کے چھوٹے چھوٹے سائز بنا کر کہتا گیا۔

”NOW STOP IT۔“ شان کو ہنسی آ گئی۔

”ماموں جان آئے میرے پاس تو میں نے اُن کا حکم مانا۔ تمہیں سمجھانے کے بہانے تم سے ملنے آیا۔ تم سمجھتے سمجھتے میں نے انہیں تمہارے سامنے رنگ کر دی کہ تم وہی کرو گے۔ جو وہ چاہتے ہیں۔ پھر میں اور زی انٹرکون میں ڈنر کے لئے بیٹھے تھے کہ تمہیں ٹینا کے ساتھ دیکھا۔ زی سے انگوٹھی لے کر تم تک پہنچانے کا اس سے بہتر موقعہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ سو بول دیا کہ افسر ہے دونوں کا۔ اور شان اس لئے تنگی تروانے کا ماموں جان کو کہہ رہا ہے۔ انگوٹھی۔ آسانی سے مل گئی۔ ہم تمہیں دے گئے۔ آخر تو ہم تمہیں ترپتا۔ بلکتا بھی تو

نہیں دیکھ سکتے تھے۔" اُس کے لب و لہجہ پر شان بے اختیار سنس دیا۔

"اور یہاں زی جو پریشان رہا۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قدر آئی ہوگی تمہاری احد بھی جیسے تمہیں آئی تھی۔
یار کیا کیا تماخے دیکھے میں نے بھی۔ کیسا کیسا ترپے تھے تم۔ اور میں۔ ناھر زندہ باد۔
دل ہی دل میں مزے لے رہا تھا۔ اب اُٹھو۔ چلیں دیر ہو رہی ہے۔"
"او۔ کے۔ وہ بے دلی سے اُٹھنے لگا۔

"کیوں۔ دل نہیں چاہتا کیا۔؟"

"نہیں۔ خوبصورتی سے مسکراتے ہوئے شان نے سرفی میں ہلا دیا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ اٹک جاؤ گے یہاں آکر۔
احد شان کے لبوں پر دلشیں مسکراہٹ بکھر گئی۔

"اٹھو یا۔" شان اٹھ کھڑا ہوا۔ "جانا تو ہے ہی۔ ورنہ بابا جان۔۔۔"
اس وقت واقعی شان کا جانے کو بالکل دل نہیں کر رہا تھا۔ اتنے خوب
صورت انکشاف کے بعد۔ زرین کے گھر میں زرین کے اتنے نزدیک۔
مگر۔ بابا جان اُن کو وہ رات کے وقت انتظار کی زحمت دینے کا
سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"ویسے جب تم نے مجھے ماموں جان کو فون کرنے کا کہا اور خود کپڑے
بدلنے کمرے سے نکل گئے۔ تو میں نے ہاتھ میں اکٹھا لیسو واپس کریدل پر رکھ
دیا تھا۔" ناھر بڑے مزے سے دیکھ رہا تھا۔ شان تیراں سا اُسے دیکھنے لگا۔
"کیا سمجھے" وہ مزید بولا۔ اور شان خلاف علت زندگی میں پہلی بار۔

ناصر کی اس اُلٹی حرکت پر اُس پر ناراض نہیں ہوا تھا۔

”اس کا مطلب ہے بابا جان کہ ہمارے لئے متعلق کوئی اطلاع نہیں ہے۔“
”ہرگز نہیں۔“

”ہوں“ شان کچھ سوچتے ہوئے دھیرے سے بولا۔ اور ابھی باہر ڈیوڑھی کے پاس گھڑی رکھنے کی آواز آئی۔ ”اتنی آگئی ہیں شاید“ ناصر نے دس بیٹھا کر خود باہر نکل آیا۔ اور پھر تھوڑی سی دیر میں اُچی کو لئے دوبارہ اندر آگیا۔

شان تعظیماً اُٹھ کھڑا ہوا۔ ”بیٹے اطلاع تو کی ہوئی شان کے آنے کی“
سکینہ بیگم نے آگے بڑھ کر شان کا ماتھا چوم لیا۔

”شان کے کیا رنگ نکل آئے ہیں کہ میں اطلاع کرتا۔ اور سکینہ بیگم ناصر کی بات پر شفقت سے مسکرا دیں۔ ”بیٹھو بیٹیا۔ میں آتی ہوں۔“
اور سکینہ بیگم پاس والے کمرے میں چلی گئیں۔

شان اور ناصر پھر بیٹھ گئے تھے۔ ناصر کا کہنا تھا کہ شان سکینہ بیگم کی موجودگی میں شرمارہا تھا اور شان یہ ثابت کرنے کی کوشش میں تھا کہ وہ شرما نہیں بلکہ CONFUSE ہو رہا ہے۔ دونوں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔
تھی سکینہ بیگم بڑی سے پلیٹ میں ڈھیر ساری مٹھائی لے آئیں۔

”لو بیٹیا۔ مٹھائی چکھ لو پہلے۔“ ایک عمدہ سا گلاب جامن اُس کے منہ کے پاس لاتے ہوئے پیار سے بولیں پہلی پہلی بار آیا تھا۔ منہ تو میٹھا کرانا ہی تھا۔
”ناصر نے کچھ ایسی نظر شان پر ڈالی۔ کہ وہ چاہتے ہوئے بھی وہ گڑ بڑا گیا۔“
”دیکھو بیٹیا۔ ساس اُچی بات دہرائیں کرتے“ منہ اُس کے کان کے پاس لگا کر

وہ آہستہ سے بولا۔ ”ورنہ زی یوں۔“ اُس نے گلے پر انگلی پھیری۔ ”کر کے رکھ دے گی۔ اُس کی اتنی کی بات نہ مانی تو۔“ لور گھبرا کر شان نے منہ کھول دیا۔

”مبارک ہو بیٹیا۔“ سکینہ بیگم نے کہا۔

ناہرنے ایک نظر پھر شان کو دیکھا۔ اور مارے بوکھلاہٹ کے شان۔

سکینہ بیگم کا شکر یہ بھی ادا نہ کر سکا۔

سکینہ بیگم پلیٹ میز پر رکھ کر۔ سامنے والے صوفہ پر بیٹھ گئیں۔

”دراصل ماما آئی تھیں ضروری خریداری کرنی تھی۔ زرین کی طبیعت کچھ سست تھی۔ وہ رک گئی اور میں ساتھ چلی گئی کہ وہ بچاری بھی ضعیف ہیں۔ اتنی دور سے آئی تھیں۔ کام بھی ضروری تھے۔ پھر اُن کو واپس بھی پہنچایا۔ اس لئے دیر ہو گئی۔“ سکینہ بیگم نے کہا۔

”زی کو تو بخار ہے اچھا خاصا۔“ ناہرنے کہا۔

”کیا۔؟“ سکینہ بیگم فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”میں نے دوا دیدی ہے۔ آپ گھبراؤ نہیں۔ ٹھیک ہو جائے گی۔“

”میں دیکھ تو آؤں۔“ سکینہ بیگم چلنے لگیں۔

”ہم بھی آتے ہیں۔“ ناہرنے اٹھتے ہوئے شان کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”ارے نہیں بیٹا۔“ سکینہ بیگم چلتے چلتے رُک گئیں۔ ”وہ تو اب پردہ کرے

گی نابینے۔“ وہ خفقت سے بولیں۔

”کس سے۔ ناہرنے کہا۔

”وہ۔“ ذیشان سے۔ شگنی ہو جائے تو لڑکی پردہ کرنے لگتی ہے نا۔“

”ادہ۔“ ناصرتے شان کو۔ اور شان نے ناصر کو دیکھا۔

ناصر نے اتنی کی نظر بچا کر ایک آنکھ دبا دی۔

شان نے بھی چپکے سے جواباً ایک آنکھ میچ لی۔

اور سکنہ بیگم کمرے سے چل دیں۔

وہ دونوں پھر وہیں بیٹھ گئے۔

ناصر نے پیالی میں چائے ڈالی۔ اور شان سوچوں میں گم ہو گیا۔

”کچھ بولو نا۔“

”بس تم سے بہت بول لیا۔“ شان سوچوں سے ابھر کر بولا۔

ناصر نے مسکراتے ہوئے پیالی ہونٹوں سے لگالی۔

شان پھر کچھ سوچنے لگا۔

”یاد تم تو واقعی چپ ہو گئے ہو۔ بولو نا۔ کچھ۔“

”نہیں۔ اب باقی باتیں زی سے کرے گا۔“

”مگر تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ زی اب تم سے پردہ کرنے لگی ہے

اب وہ تم سے باتیں نہیں کر سکے گی۔“

”ابھی کچھ دیر پہلے تو کی تھیں۔“

”تب تک ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا تم سے پردہ ہے۔“

”ادہ۔“

اُس کا انداز بہت مدھر اور دل نشیں تھا۔

”چلو EAGLE HAS LANDED“ دیکھیں۔“ ناصر نے پیالی میز پر رکھ

دی۔ اور شان خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اُس کی خوب صورت آنکھیں کچھ سوچ رہی تھیں۔ کچھ تلاش کر رہی تھیں۔
”بس۔ اور نہیں دیکھتے۔“ بکچر دیکھتے دیکھتے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

شان اور ایسی بکچر نہ دیکھے۔ ناصر کو حیرت ہوئی۔

پھر۔ دھیرے سے مسکرا دیا۔ شان بے قرار سا لگ رہا تھا۔

”پھر۔۔۔؟“

”زی کو ملوں گا۔“ وہ ناصر کو دیکھ رہا تھا۔

”یہ یورپ نہیں ہے۔“

”اوہ۔۔“

”چلو لائبریری چلتے ہیں۔“ ناصر نے کہا۔

اس نے خاموشی سے ناصر کو دیکھا۔ اور چپ چاپ ساتھ چل پڑا۔

ناصر اُسے امریکہ سے لائی ہوئی۔ چند نایاب کتابیں دکھانے لگا۔ شان نے

اُلٹ پلٹ کیں۔ پھر رکھ دیں۔

”نہیں دیکھے گا۔“ اُس نے سرفی میں ہلایا۔

شان۔ اور ایسی کتابوں کو نہ دیکھے؟“ ناہر کو مزید حیرت ہوئی۔
پھر۔ ہولے سے سُکرا دیا۔

شان بے چین سالگ رہا تھا۔

”پھر۔؟“ ناہر نے کہا۔

”زی سے ملوں گا۔“ اسٹون گریے کر سٹلز بڑی بخیدگی سے ناہر پر جھپٹے۔
”اول ہوں۔“

”اوہ۔۔۔!“

”آؤ میرے بیڈ روم میں میوزک سنیں گے۔“

اُس نے چپکے سے ناہر کو دیکھا اور ساتھ ہو لیا۔

صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے۔ آنکھیں موندے جانے وہ کیا

سوچ رہا تھا۔

ناہر نے ایک نظر اُس پر ڈالی۔ وہ یکدم ہی چپ چپ سا نظر

آنے لگا تھا۔

مگر۔ زی کا پردہ تو اُس سے عارفی ہی تو تھا۔ تھوڑے ہی

غصے کی بات تو تھی۔

”بس ناہر! اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ انداز ملتتی تھا۔

”شان اور۔ BOB MORLEY کو نہ سنئے۔

ناہر کو اچنبھا ہوا۔ پھر لب مبتسم ہو گئے۔

شانہ کے کل سالگ رہا تھا۔

”پھر۔۔!“

”زی۔۔“ اُسے ایک ہی دھن سوار تھی۔

”THIS, IS NOT POSSIBLE۔۔ یار۔“ ناصر جھنجھلا اٹھا۔

”اوہ۔۔“ جھنجھلا کر شانہ نے ہاتھ میں پکڑا ایکٹ پرے پھینک دیا۔

”آؤ۔۔ باہر بیٹھیں۔“ ناصر بولا۔

اُس نے ایک تیز نظر ناصر پر ڈالی۔ اور پاؤں پٹختا سا تھک ہوا۔

دونوں۔۔ باہر چین میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

وہ خالی نظریں ادھر ادھر دوڑا رہا تھا۔

ناصر سمجھ رہا تھا۔ ایک عرصہ بعد اُسے زی ملی تھی۔ بالکل اُس کی اپنی

بن کر۔ وہ ابھی اس حقیقت سے اچھی طرح لطف اندوز بھی نہ ہو پایا تھا۔

کہ انی نے آکر زی کے پردے کا حکم صادر فرما دیا تھا۔

مگر۔ وہ کبھی کیا سکتا تھا۔ جوانی کا حکم تھا وہی ہوتا تھا۔

”ناصر۔“ تھوڑی ہی دیر بعد اُس کی آلتائی سی آواز آئی۔

”اب کیا ہے۔؟“

”یہاں اور نہیں بیٹھتے۔“

”پھر۔۔؟“

”زی۔۔!“ اُس کی وہی ایک رٹ تھی۔

”نان سنس۔ تم آئندہ یہاں نہیں آؤ گے“ ناصر نے میز پر مکہ مارا۔

”اوہ“ اُس نے ناصر سے بھی زیادہ زور سے میتر بجا یا۔

تجھی سکیٹہ بیگم پاس چلی آئیں۔

”آؤ دونوں۔ کھانا تیار ہے۔“

اور۔ ناصر نے نجات کی لمبی سانس لی۔

”اٹھو اب۔ ناصر نے کہا۔

شان نے ایک خشکیں نظر ناصر پر ڈالی۔ سکیٹہ بیگم آگے آگے چل

ادیں۔ ناصر اور شان پیچھے پیچھے تھے۔

میٹر پر تکلف کھانوں سے سجا ہوا تھا۔ تینوں بیٹھ گئے۔

شان اب بھی اُلجھا اُلجھا سا تھا۔

”یہ لو۔“ ناصر۔ شان کو کوفتوں کی ڈش پیش کرتے ہوئے بولا۔

شان نے ایک نظر اُسے دیکھا۔

ڈش اُس کے ہاتھ سے لٹی۔ اور دور اتنی کی طرف رکھ دی۔

”اوہ“ ناصر مسکرایا۔ شان کھانے میں مصروف ہو گیا۔

خاموشی سے کھاتا رہا۔ ناصر سے کوئی بات نہیں کی۔ سکیٹہ بیگم کی باتوں کا

البتہ بہت مؤدب طریقے سے جواب دیتا رہا۔

”یہ جناب انڈوں کا حلوہ۔ اتنی کے ہاتھ کا بنا ہوا“ ناصر نے اُسے

حلوہ پیش کیا۔ شان نے ایک نظر سکیٹہ بیگم کی طرف دیکھا۔ وہ ملازمہ

سے کچھ کہنے میں مصروف تھیں۔

پھر۔ ناصر کو دیکھا۔ چپ چاپ ڈش اُس کے ہاتھ سے لے لی۔

اور ہاتھ بڑھا کر دُور اُسے بھی سکیٹہ بیگم کے قریب رکھ دیا۔

ناصر۔ پھر مسکرایا۔ تو گویا عتاب ناصر پر ہی تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد۔ خود ہی ہاتھ بڑھا کر شان نے وہی ڈش اٹھالی۔
اور ناصر کو دیکھتے دیکھتے حلوہ اپنی پلیٹ میں ڈالنے لگا۔

ناصر اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

انسان چاہے کتنا ہی سنجیدہ اور مدبر ہو۔ لاشعوری طور پر اپنے بچپن
میں کبھی کبھی لوٹتا ضرور ہے۔ شان اس وقت اُسے محض چار پانچ سال کا
بچہ معلوم ہوا۔ روٹھی روٹھی شکل لئے۔ وہ وہی سب کچھ وہیں سے اٹھا
اٹھا کر کھا رہا تھا۔ جہاں وہ ناصر کے ہاتھوں سے قبول نہ کرتے ہوئے تھوڑی
دیر پہلے رکھتا جا رہا تھا۔

گویا۔ سارا قصور ناصر کا تھا۔

سکیٹہ بیگم نے سبز چائے کی پیالی اُس کی طرف بڑھائی۔ تو اُس نے خوشی
خوشی تھام لی۔ کھانے کے بعد بھی تھوڑی دیر باتیں ہوتی رہیں۔

”اچی۔ اب ہمیں اجازت دیں۔ سوئیں گے جا کر۔“ بالآخر ناصر اٹھ کھڑا ہوا۔
”صبح سویرے جگا دیں۔ میں نے ڈیوٹی پر جانا ہے۔ اور شان کو ماماؤں
جان کی خدمت میں حاضری دینی ہے۔“

شان بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”اوہ ناصر بولا۔ اور دونوں ساتھ ساتھ نکلے۔ اور پھر باقی کردار
قدے بہت کر ایک طرف بنے ناصر کے بیڈروم میں داخل ہو گئے۔“

تھکے ہوئے تو تھے ہی۔ جلدی ہی دونوں سو گئے۔

صبح اذان کے وقت سکینہ بیگم نے دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر
دونوں کو بیدار کیا۔ ناصر اٹھ کر اتنی کی طرف آگیا۔
اور شان وہیں با تھروم میں گھس گیا۔

صبح ہونے والی تھی۔ ہر طرف ہلکی ہلکی سپیدی خودار ہو رہی تھی۔
سینکڑوں پرندے ایک ساتھ چہچہا رہے تھے۔ وسیع چمن کے گرد گلابوں کی
یاڑ میں۔ ڈیوڑھی کی طرف جاتے راستے کے دونوں طرف لائے لائے۔
قد آور درختوں میں۔

غیب پاکیزگی تھی۔ پورے ماحول میں۔

برآمدے میں تخت پر بیٹھیں سکینہ بیگم نماز کے بعد صبح کے دانے پھر کر
عقیدت سے ایک طرف رکھ رہی تھیں۔

بجھی ادھیڑ عمر ملازمہ چائے کی ٹرے لئے آگئی۔ سکینہ بیگم کو منہ اندھیر
ہی چائے کی طلب ہونے لگتی تھی۔ ٹرے کر اہنوں تے وہیں تخت پر رکھ
دی۔ منہ ہاتھ دھو کر ناصر بھی ادھر ہی آکر بیٹھ گیا۔

”بیٹا تم بھی ایک پیالی پی لو۔ ناشتہ بعد میں کر لینا۔ اتنی نے پہلے اُس
کے لئے پیالی بھری۔

”ادھ گڑ۔ اتنی۔ شان کے لئے بھی...“ اور۔ اُس کی نظریں
دور دائیں طرف اپنے بیڈروم کی جانب اُکھٹیں۔

زرین جائے نماز تہہ کرتی آہستہ آہستہ ناھر کے بیڈروم کے ساتھ ساتھ
 چلتی اسی سمت آرہی تھی۔ اور عین اسی لمحہ۔
 بیڈروم کے اُسی رخ والی کھڑکی میں سے زرین کے بالکل آگے۔
 شانِ نہایت اطمینان سے کودا تھا۔
 چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھا تھا۔
 جلدی جلدی کچھ بولا تھا۔
 پھر جیب ٹٹولی تھی۔ کچھ نکالا تھا۔
 زرین کا ہاتھ تھا ماما تھا۔ کچھ پہنایا تھا۔
 یقیناً سنگنی کی انگوٹھی تھی۔
 ادا ناھر کو۔ لگا۔
 کل شام۔ اُس کی شان کی رکھوالی۔
 اور اُس سے منغز ماری۔
 سب رائیگاں گئے تھے۔

ختم شد